

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

کالی

ماہنامہ

ماہنامہ سوسائٹی

October
2015

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING SECTION

Online Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

READING
Section

☆ نامور مصنفہ رفعت سراج کا شاہکار ناول ”دام دل“ اندرونی صفحات پر ملاحظہ فرمائیں

بانہی
سہام مرزا



ماہنامہ دو شہیرہ کراچی

مدیر اعلیٰ ————— منزہ سہام
مدیر ————— رضوانہ پرنس / دانیال شمشی

منیجر مارکیٹنگ ————— زین العابدین
قانونی مشیر ————— جی ایم بھٹو (ایڈووکیٹ ہائی کورٹ)
انکم ٹیکس ایڈوائزر ————— مخدوم اینڈ کمپنی (ایڈووکیٹ)

رکن آل پاکستان نیوز پیپر سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپر ڈائریکٹرز

MEMBER
APNS
CPNE

خط و کتابت کا پتہ

88-C II - فرسٹ فلور - خیابان

جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز-7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

ای میل: pearpublications@hotmail.com

اکتوبر 2015ء

جلد: 43 ☆ شماره: 10

قیمت: 60 روپے

☆ منیجر سر کولیشن: محمد اقبال زمان ☆ عکاس: موسیٰ رضا / مرزا محمد یاسر



READING
Section



07 منزہ سہام نمکین پانی
09 رضوانہ پرنس محفل

باتیں ملاقاتیں

24 ارتج فاطمہ سے ... ذیشان فراز
26 فواد خان مونی خان
28 کپیل شرما ادارہ
31 منشی اسکریں مشخ
34 لائف بوئے اسماء اعوان

ناول

35 دام دل رفعت سراج
53 تیرے عشق نچایا بیبا عالیہ

مکمل ناول

79 رحمن، رحیم، سدا سائیں ام مریم

ناولٹ

102 لمحوں نے خطا کی تھی فوزیہ احسان رانا

ناولٹ

151 مورے پیا ارج گل رانا
131 محبت درد دیتی ہے نفیسہ سعید



READING Section

افسانے

- 214 ایک ملاقات ندا حسین
222 کوہو کا بیل منزہ ہاشمی
228 نصیب کے مذاق تحسین انجم انصاری
237 بڑے وہ ہیں روبینہ شاہین

رنگ کائنات

- 240 مجھے کیا برا تھا مرنا صفیہ سلطانہ مغل

دوشیزہ میگزین

- 247 دوشیزہ گلستاں اسماء اعوان
251 لولی وڈ، بولی وڈ ڈی خان
254 کچن کارنر نادیہ طارق
256 بیوٹی گائیڈ ڈاکٹر خرم مشیر

افسانے

- 185 عمودی چٹان نگہت اعظمی
198 چال ماہوش طالب



زر سالانہ بذریعہ رجسٹری
پاکستان (سالانہ).....890 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ.....5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا.....6000 روپے

پبلشر: منزہ سہام نے سٹی پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: سٹی 7-OB، پاپور روڈ۔ کراچی

Phone : 021-35893121 - 35893122

Email : pearlpublications@hotmail.com

READING
Section

آپ بھی لکھاری بن سکتے ہیں!!

آئیے! دو شیزہ کے قلم قبیلے میں شامل ہو جائیے۔ خود کو مزو اکیپے اپنے قلم سے.....!

اگر آپ کا مشاہدہ اچھا ہے۔

اگر آپ کتابوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔

سفر کرتے ہوئے آس پاس کے مناظر آپ کو یاد رہتے ہیں۔

شاعری آپ کو اچھی لگتی ہے۔

تو پھر قلم اٹھائیے اور کسی عنوان کو کہانی یا افسانے

میں ڈھالنے کی صلاحیت کو آزمائیے۔

ماہنامہ دو شیزہ آپ کی تحریروں کو، آپ کو خوش آمدید کہتا ہے۔

ہو سکتا ہے عنقریب منعقد ہونے والی دو شیزہ رائٹرز ایوارڈ

تقریب میں آپ بھی ایوارڈ حاصل کریں۔

تحریر بھیجنے کے لیے ہمارا پتہ:

88-C II - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز - 7، کراچی

ای میل: pearlpublications@hotmail.com

READING
Section



نمکین پانی

ناسا کی تحقیق سے ثابت ہوا ہے کہ مریخ پر بہتے ہوئے نمکین پانی کے شواہد موجود ہیں اور اس بات کا بھی قوی امکان ہے کہ زندگی کے آثار موجود ہوں..... یہ صدی کی بہت بڑی خبر ہے مگر اتنی بڑی خبر بھی مجھے خوشی نہ دے سکی..... دن بھر تو مصروفیات کی نظر ہو جاتا ہے مگر رات ہوتے ہی مجھے یہ سوچ کر خوف آنے لگتا ہے کہ یہ طویل سیاہ رات کیسے گزرے گی۔ آنکھیں بند کرتے ہی حلق میں کانٹے پڑنے لگتے ہیں..... دم گھٹتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ آنکھوں میں پانی ٹھہر سا جاتا ہے تب جلدی سے سر ہانے رکھا پانی کا گلاس لبوں سے لگاتی ہوں اور ٹی وی آن کر کے جاننے کی کوشش کرتی ہوں کہ شاید..... شاید خوشی کی خبر **Breaking News** کی صورت میں چل رہی ہو کہ تمام لاپتہ پاکستانی محفوظ ہیں..... اور جلد اپنے پیاروں سے ملنے والے ہیں..... مگر ایسا کچھ ٹی وی کی اسکرین پر نہیں۔ بس بلکتے لوگ، مچلتے لوگ، تڑپتے لوگ..... آنکھوں میں ٹھہرا پانی بہنے لگتا ہے بے بسی کی اذیت کیا ہوتی ہے ان چند دنوں میں بارہا محسوس کیا اپنوں سے پچھڑنے کا غم اور حکومتی سفاکی یہ سب دیکھ کر دل بیٹھنے لگتا ہے۔ میں سوچنے پر مجبور ہوں کہ ناسا والے اربوں ڈالر خرچ کر کے مریخ پر بہتے ہوئے نمکین پانی کو تلاش کرنے کے لیے کیوں سرگرداں ہیں۔ وہ اس سے بہت کم خرچ کر کے صرف اپنے کیمروں کا رخ پاکستان کی جانب موڑ کر ایک تیر سے دو شکار کر سکتے ہیں..... بہتا ہوا نمکین پانی ہر آنکھ میں ملے گا اور ساتھ ساتھ ناپید ہوتی ہوئی انسانیت بھی.....

منزہ سہام

قارئین کے نام کھلا خط



محترم قارئین!

”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ میں نے خلقِ خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے تحت شروع کیا تھا۔ سچی کہانیاں کے اڈلین شمارے سے یہ سلسلہ شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نا صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیاتِ قرآنی اور ان کی روحانی طاقت نے حیران کر دینے والے معجزے بھی دیکھے۔

ساتھیو! عمر کی جس سیڑھی پر میں ہوں خدائے بزرگ و برتر سے ہر پل یہی دعا کرتا ہوں کہ اُس کے حضور پیش ہونے سے پیشتر کچھ ایسا کر جاؤں کہ میرے دکھی بچے، بچیاں میرے بعد کسی بھی ذریعہ روزگار کو بروئے کار لاتے ہوئے عزت کے ساتھ رزقِ حلال کما سکیں۔

اتنے برس بیت گئے۔ آپ سے کچھ سوال نہ کیا۔ وہ کون سی پیشکش تھی جو نہ ٹھکرائی۔ کیسے کیسے دولت کے انبار ایک طرف کر دیے۔ مگر اب..... وقت چونکہ ریت کی طرح ہاتھوں سے پھسلتا جا رہا ہے۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ ایک ایسا ٹرسٹ، اپنی موجودگی میں قائم کر جاؤں جس سے نیکی اور بھلائی کا یہ سلسلہ جاری و ساری رہے۔ مجھے آپ کا تعاون درکار ہے۔

دکھی انسانیت کی فلاح کے لیے..... آئیے اور اپنے باباجی کا ساتھ دیجیے.....

ٹرسٹ میں اپنے عطیات جمع کرائیے۔

مجھے امید ہے۔ اپنے دکھی بھائی بہنوں کا درد محسوس کرتے ہوئے آپ کا اگلا

قدم..... ٹرسٹ میں اپنے تعاون کے لیے ہی اٹھے گا۔

دوشیزہ کی محفل

محبتوں کا طلسم کدہ، خوب صورت رابطوں کی دلفریب محفل

بہت پیارے دوستو!

آپ سب کو رضوانہ پرنس کا سلام قبول ہو۔ دیکھیے ہم نے اپنا وعدہ وفا کیا۔ آپ سب کے پاس واپس لوٹ آئے حالانکہ لندن کی حسین فضا میں اور اپنے پیاروں کی بے لوث محبت جیسے ہمارا دامن تھامے لے رہے تھے۔ لیکن ہمیں اپنی دوشیزہ کی ذمہ داری بھی تو نبھانی تھی اور پھر آپ جیسے پر خلوص دوست بھی ہمارا انتظار کر رہے تھے کسی شاعر نے کہا تھا کہ

بے فائدہ ہے زندگی میں احباب کا ہجوم

پر خلوص جو مل جائے تو اک شخص ہی بہت ہے

لیکن ہم بہت خوش قسمت ہیں کہ ہماری اس محفل میں ایک نہیں بلکہ بہت سارے محبت و خلوص اور اپنائیت سے جگمگاتے ہوئے چہرے جیسے ہمیں یقین دلارہے ہیں کہ دنیا ابھی محبت سے خالی نہیں ہوئی ہے۔ اللہ آپ سب کو ہمیشہ خوش و سلامت رکھے۔ ہمیں امید ہے آپ کا قلمی تعاون دوشیزہ کے معیار کو بہتر بنانے میں ہماری مدد کرے گا۔ اچھی اور معیاری تحریر کو ہم دل سے خوش آمدید کہیں گے تو آئیے دوستو۔ ہم چلتے ہیں محبت سے مہکتی ہوئی اپنی خوبصورت محفل کی طرف جس کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھنے کا اپنا ہی ایک لطف ہے۔

✉: پیاری سی نگہت غفار کراچی سے لکھتی ہیں ڈیڑھ رسالہ ذرا دیر سے موصول ہوا لحاظ مختصر تبصرہ حاضر ہے۔ پیاری فرینڈز کیسی ہیں یاد کرنے کا شکریہ۔ پیاری مسز نوید آپ نے خط میں میرا ذکر کیا بہت نوازش۔ سلطانہ مغل کے بیٹے کی شادی کا احوال بہت خوبصورت تھا۔ کہانیوں میں بلندی پستی برآ گا ہی گھنا سا یہ عنبرین کی شادی پسند آئے۔ دوشیزہ گلستان میں معصومہ رضا، ریاض حسن، انزا نقوی، وقار قیوم کی تحریریں اچھی لگیں۔ نئے لہجے میں انزا نقوی، فیصہ آصف، روبینہ شاہین، صائمہ بشیر کے لہجے اچھے تھے اللہ پاک دوشیزہ کی محفل کو ایسے ہی آباد رکھے۔

کھ: اچھی نگہت جی آئندہ ذرا جلدی آئیے گا اور ہاں ہماری پوری کوشش ہوگی کہ دوشیزہ وقت پر آپ کو مل جایا کرتے۔

✉: جیکب آباد سے ہماری پیاری رائیٹر صفیہ مغل اپنے شوخ موڈ کے ساتھ محفل میں آئی ہیں۔

تمہارے بعد کسی بھی خوشی کے موقع پر
کبھی جو خود کو سنوار اتو آنکھ بھر آئی

السلام علیکم خوش رہیں آباد رہیں۔ پرچہ خلاف معمول بہت تاخیر سے ملا ہوئی تاخیر تو کچھ باعث تاخیر بھی تھا۔ بہر حال شرجیل اور ماروی کی شادی کا احوال اور اس کی تصاویر وغیرہ ایک یادگار کے طور پر بہت اچھا لگا، شرجیل اور ماروی کے لیے تو اعزاز ہے۔ شرجیل کو یہ شرف ہے کہ وہ انکل سہام مرزا، پرویز بھیا، سلیم فاروقی فریدہ مسرور، سیما غزل، اور ناصر رضا، منزہ سہام، ان سب سے مل چکا ہے سو وہ بھی آپ سب کا اور کاشی کا شکر یہ ادا کر رہا ہے۔ خطوط، سب بہترین اور جامع تھے۔ جن احباب نے میری آمد کو خوش آمدید کہا ہے۔ ان کے لیے دل کا دالان مزید کشادہ اور دلکش ہو گیا ہے

آیا ہے کون کیوں یہ ہوا مشک بار ہے
موسم کا بھی مزاج بہت خوشگوار ہے
اب آئیے تبصرے کی جانب، لائف بوائے پر افسانہ کوئی بھی لکھ سکتا ہے یا یہ سہرا کسی ایک کے سر بندھا رہے گا۔

رفعت سراج، ڈیر ناول کی رفتار تیز کرو، بہت ست خرامی سے آگے بڑھ رہا ہے مگر بہر حال کہانی بے حد جاندار اور دلچسپ ہے۔ روحیلہ خان، تھینک یو اللہ میاں اللہ کے حضور شکرانے پر بے حد خوبصورت افسانہ رہا۔ شمیم فضل خالق..... اک معروف اور معتبر نام کیا تعریف کی جائے اور کیوں کر کی جائے۔ انسان سوچ کے زاویوں میں الجھ کر سلجھنے والی بیشتر تحریروں میں سے ایک عمدہ تحریر اس بار سب سے بہترین اور بے مثال افسانہ زممر نعیم کا تھا بہت خوبصورت تحریر، الماس روجی، کا بڑے سرکار نے بھی متاثر کیا، مائی ڈیر یہ دھوپ چھاؤں کا کھیل ہے کیا المیہ ہے۔ حنا بشری کا بحر آگہی بھی بہت اچھا اور دل گداز افسانہ تھا۔ نین اتج میں بالعموم لڑکوں کو اپنے سے بڑی خواتین، آپاؤں اور باجیوں سے محبت ہو جاتی ہے سو اس عمر میں خواتین کو بھی چاہیے کہ وہ بھی لڑکپن میں داخل ہونے والے ان لڑکوں سے بے حجابانہ بات نہ کریں۔ نہرت جی کا بھی افسانہ ایسا ہی تھا۔

اجلے اجلے خیالوں کی طرح ہوتا ہے
پیار شفاف اجالوں کی طرح ہوتا ہے
اس کے علاوہ تمام افسانے بہت اچھے رہے۔ ناول بھی خوب تھے۔ اللہ کرے دو شیزہ دن دو گنی رات چو گنی ترقی کرے۔ اللہ پاک سب کو خوش خرم رکھے۔

کھ: صفیہ جی! آپ کے دل چپ تبصرے نے ہماری محفل میں بڑی خوبصورت سی رونق بکھیر دی اور

برائے قانونی مشاورت

جی ایم بھٹولاء ایسوسی ایٹس

ایڈووکیٹ اینڈ اٹارنیز

رابطہ: 021-35893121-35893122

Cell: 0321-9233256

READING
Section

دو شیزہ 10

ہاں جناب رنگ کائنات میں رنگ بکھیرنے پر ہم سب کو مٹھائی کب کھلا رہی ہیں۔

✉: زمر نعیم لاہور سے محفل میں شامل ہیں سویت ڈیز رضوانہ پرنس صاحبہ السلام علیکم اللہ آپ سب پر ہمیشہ مہربان رہے۔ آمین۔ رضوانہ جی! دل تو ہمیشہ دوشیزہ کی محفل میں رہنے کو مچلتا رہتا ہے بس کبھی کبھار مصروفیات زندگی آڑے آجاتی ہے اور میری حاضری محفل دوستان میں نہیں ہو پاتی مگر نہ ہو کر بھی سب کی محبتیں، خلوص، پذیرائیاں، چاہتیں روح سے محسوس ہوتی ہیں یہ دل اور روح کے تعلق ہیں جو بندھنے کے بعد بھی کبھی نہیں ٹوٹتے بلکہ مزید مضبوط ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اس بات کی گواہی آپ بھی دیں گی اور دوشیزہ سے واسطہ ہر فرد۔ سب سے پہلے تو میں شگفتہ شفیق کو کنزل کی رحمتی والے فرض سے سبکدوش ہونے پر مبارکباد دیتی ہوں اللہ تعالیٰ کنزل کو ہمیشہ شاد و آباد رکھے۔ رضیہ مہدی صاحبہ کی صحت یابی کے لیے ہمیشہ دعا کرتی ہوں۔ اللہ ان کے قلم کی روانی و تابانی برقرار رکھے۔ آمین ثم آمین۔ فریدہ جاوید فری کی صحت یابی کی دعائیں بن کہے کرتی ہوں فریدہ جی دوستوں سے کہنے کی ضرورت نہیں ہوئی۔ نگہت اعظمی آپ بھی ہر لمحہ یادوں اور سوچوں کے علاوہ دعاؤں میں شامل رہتی ہیں۔ صفیہ سلطانہ کو بیٹے کی شادی خانہ آبادی مبارک ہو۔ بہت شرمندہ ہوں بروقت و ہر موقع رابطہ نہ کر سکی۔ نزہت جبیں ضیاء صاحبہ کو بھی اپنے فرض سے سبکدوشی کی مبارک ہو اور ان سب ہی ساتھی رائیٹرز کو اپنے اپنے ایوارڈ مبارک ہوں جن کی تحریریں اس سال منتخب ہوئی ہیں۔ فیصیحہ آصف کی تحریریں دوشیزہ ڈائجسٹ کے مخصوص رنگوں کو مزید نکھار دے رہی ہیں۔ عید کے حوالے سے انکا افسانہ اچھا تھا۔ نسیم نیازی کی بامقصد تحریر کہاں گم ہیں پلیز میرے ساتھ نسیم نیازی کو کوئی جھنجھوڑ کر جگائے اسے بتائیں اس کی نگاہ کتنی گہری اور مشاہدہ کتنا زیرک ہے۔ باقی سب ہی نئے ساتھیوں کو میں دوشیزہ کے توسط سے خوش آمدید کہتی ہوں اور التماس ہے کہ میری تحریر پڑھ کر اپنی قیمتی رائے ضرور دیں اور سب ہی پرانے ساتھی لکھاری و قاری دونوں ہی۔ دوشیزہ کے ستمبر کے شمارے میں موجود ناولٹ بہت بہترین موضوع پیش کرتے ہوئے دل میں اتر گئے۔ حنا بشری اور ام منابل مبارک بادی کی حقدار ہیں۔ تحریر میں پختگی اور تسلسل یہ ظاہر کرتا ہے کہ آئندہ یہ دونوں لکھاری ساتھی دوشیزہ کی ہر دل عزیز لکھاری ہوں گی۔ 'دام دل' کے کیا کہنے رفعت سراج کے لکھے ہوئے حرف حرف میں تجربہ بولتا ہے مہارت و مشاہدہ ہر پہلو دلاویز ہے بہت کچھ سیکھنے کو مل رہا ہے۔ (ہمیشہ کی طرح) سب ہی افسانے اچھے لگے۔ کاشی چوہان تم 'الوداع' کہہ کر دکھ دے رہے ہو تمہارے ادارے پڑھ کر ذہن و دل اور روح کو جو قرار ملتا تھا وہ سکون اور اطمینان اپنے ساتھ لے جاؤ گے کیا.....؟ رضوانہ جی! بہت ساری باتیں بہت سارے پیام دینے تھے مگر کیا کروں خط بروقت نہ پہنچنے کا احتمال بھی ہے منزہ، کیسی ہیں۔ انہیں میرا سلام کہیے گا۔ امید ہے انشاء اللہ رابطہ رہے گا میں اپنی کوئی تحریر بھی دوشیزہ کو ارسال کروں گی۔ آپ سب بھی مجھے دعاؤں میں یاد رکھیے گا اور اپنا بہت خیال رکھیے گا۔

بھ: پیاری زمر! آپ کے محبت بھرے پیغامات سے مزین خط کا ہر لفظ پیارا اور خلوص کی خوشبو سے مہک رہا ہے اور اسی بات پر ہو جائے ایک اچھا سانا ناولٹ یا افسانہ.....

✉: اور ہماری اگلی مہمان کراچی سے فرحین اظفر ہیں میں پہلی بار دوشیزہ کے لیے اپنا افسانہ ارسال کر رہی ہوں گو کہ میری تحریریں دوسرے ڈائجسٹ میں چھپتی رہی ہیں امید ہے آپ کو میرا افسانہ پسند آئے گا اور آپ میری حوصلہ افزائی کریں گی میں آپ کے جواب کی منتظر رہوں گی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرٹک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

بھئی فرحین! سب سے پہلے تو ہم سب آپ کو خوش آمدید کہتے ہیں دوشیزہ نے ہمیشہ اچھی تحریروں کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ آپ کا افسانہ انشاء اللہ اگلے ماہ شامل اشاعت ہے۔

✉: ہمارے قبیلے میں حال ہی میں شامل ہونے والی نفیسہ سعید بھی پہلی بار محفل کی مہمان بنی ہیں رضوانہ جی! آپ کا فون پر بات کرنے کا انداز اور آپ کی محبت بہت اچھی لگی بات کر کے بالکل ایسا محسوس نہیں ہوا کہ میری یہ آپ سے پہلی سمعی ملاقات ہے سمعی اس لیے کہوں گی کہ ہمارا صرف آواز ہی کے ذریعے رابطہ ہوا، اب اگر زندگی رہی تو انشاء اللہ بصری ملاقات بھی جلد ہوگی۔ ستمبر 2015 کا دوشیزہ خوبصورت ٹائٹل کے ساتھ میرے سامنے موجود ہے۔ سب سے پہلے اپنی قارئین بہنوں کے تبصرے پڑھے مہر النساء پر کیے جانے والے تمام تبصرے اچھے تھے جس کے لیے میں اپنی تمام بہنوں کی تہ دل سے مشکور ہوں اور امید کرتی ہوں کہ آپ ہمیشہ میری ہر کاوش پر اتنے ہی دل سے تبصرہ کریں گی کیونکہ آپ کا تبصرہ ہماری تحریر کو خاص بناتا ہے خاص طور پر شکر یہ اپنے چھوٹے سے دوست منعم اصغر کا جو تبصرہ صرف میری ہر تحریر پڑھتا ہے بلکہ ہمیشہ اچھی تعریفوں سے بھی میرا دل خوش کرتا ہے جیتے رہو منعم اصغر اور ہمیشہ اچھا لکھتے رہو میری دعا میں تمہارے ساتھ ہیں۔ کاشی بھائی کا ادارہ ہمیشہ کی طرح بہت بہترین تھا۔ ارے یاد آیا میں تو بھول گئی تھی شمیمہ عرفان کو جو یہ سمجھ کر بھی 'آٹو' کی اصطلاح رکشہ کے لیے ہے اپنے تبصرے میں یہ ظاہر کر رہی ہیں کہ جیسے یہ لفظ آٹو میرے ذہن کی اختراع ہے تو پیاری شمیمہ آپ نے ہو سکتا ہے سفید بال ہونے تک لفظ رکشہ ہی سنا ہو لیکن سوری میں نے آٹو سن رکھا ہے اور ضروری نہیں کہ جو لفظ آپ نے سنا ہو اس پر میرے لکھنے کی پابندی ہے میں جو بھی لکھتی ہوں بہت لوگوں کو دیکھ کر ان سے مل کر لکھتی ہوں اس لیے پلیز تحریر پر آپ تنقید کریں یقیناً مجھے اچھا لگے گا۔ لیکن آپ نے آج تک کیا سنا ہے اور مجھے کیا لکھنا چاہیے یہ میرا خیال ہے صرف اور صرف بلا وجہ کی تنقید ہے لہذا معذرت میں اپنے الفاظ لکھنے میں آزاد ہوں۔ پیاری سنبھل انشاء اللہ بہت جلد میں آپ کو ایسا ناول دوں گی جو ساڈی چڑیاں دا چنبا کی یاد شاید آپ کے دلوں سے کچھ کم کرنے میں کامیاب ہو جائے ویسے مجھے آپ کا تبصرہ پڑھ کر خوشی ہوئی کہ آپ کو ابھی تک میرا وہ ناول یاد ہے جس کے لیے میں آپ کی دل سے مشکور ہوں اور ایک خاص بات اس دفعہ دوشیزہ میں صدف آصف کی کمی میں نے تو محسوس کی ہو سکتا ہے میری دوسری بہنوں نے بھی محسوس کی ہو۔ ہم دوشیزہ میں صدف آصف کو دیکھنے کے شاید عادی ہو چکے ہیں بہر حال ام مریم اور فوزیہ احسان رانا بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں جن کا مقابلہ ہم رفعت سراج سے نہیں کر سکتے کیونکہ ہر لکھنے والے کی تحریر اس کے لیے سرمایہ حیات ہوتی ہے اور لکھتے لکھتے ہم یا آپ میں سے کوئی بھی رفعت سراج، بشری رحمن، ممتاز مفتی یا اشفاق احمد کے درجے تک پہنچ سکتا ہے اور یہ بہت کمال کی بات ہے کہ کوئی خود سے دو جملے بھی لکھ سکے اس لیے صرف اتنا کہوں گی کہ جس نے بھی لکھا کمال لکھا اور قابل تحسین ہوتے ہیں رضوانہ پرنس جیسے لوگ جو ہر لکھنے والوں کو موقع فراہم کر کے انہیں رائیٹر بنا دیتے ہیں اور اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو سلامت رکھے تاکہ ہماری نئی نسل اور ہم بھی ہمیشہ پڑھنے والے لوگوں میں شامل رہیں اور آخر میں بیانا عالیہ کو ایک اچھی کوشش 'تیرے عشق نچایا' پر مبارک باد، کیونکہ مکمل ناول لکھنا درحقیقت ایک مشکل کام ہے۔



READING
Section

کھ: اچھی نصیہ! آپ کی تحریروں کی طرح آپ کی آمد بھی ہمیں ایک خوشگوار ہوا کے جھونکے کی مانند لگی تو ڈیراب دوشیزہ سے ناٹھ جوڑا ہے تو اسے توڑنا کبھی بھی نہیں۔ انشاء اللہ جلد ہی ہم ایک ملاقات کا اہتمام بھی کر رہے ہیں۔ اپنی رائیٹرز اور قارئین کے ساتھ۔

✉: ہماری پیاری افشاں رضا اسلام آباد سے ہمیں مخاطب کر رہی ہیں۔ ڈیر رضوانہ باجی۔ اللہ کے فضل سے مجھے دوشیزہ باقاعدگی سے مل رہا ہے۔ سالانہ خریدار بن جانے پر خود کو شاہباش دینے کا دل چاہتا ہے رضوانہ باجی ایک بات بالکل سچ کہنے کو دل چاہ رہا ہے کہ آپ کے لندن جانے کے بعد سے پتا نہیں کیوں مجھے دوشیزہ میں ایک عجیب سی کمی کا احساس ہو رہا ہے محفل میں بھی وہ بات نظر نہیں آرہی مجھے یقین ہے کہ آپ لندن سے مسلسل رسالے سے رابطے میں ہیں لیکن پھر بھی..... امید ہے کہ آپ برا نہیں مانیں گی۔

کھ: بہت پیاری افشاں! لو بھئی ہم واپس آگئے ہمیں امید ہے کہ اب تمہیں کوئی شکایت نہیں ہوگی۔ ویسے ہماری غیر موجودگی میں بھی ہماری دوشیزہ ویسے ہی تھی یہ تمہاری محبت ہے جو تم نے ہماری کمی محسوس کی۔

✉: سیالکوٹ سے ہماری بہت معصوم سی ماہین خاور کچھ خفا خفا سی ہماری محفل میں آئی ہیں پیاری رضوانہ باجی آپ تو لندن جا کر بالکل ہی بدل گئیں میں نے آپ کو اتنے خلوص سے خط لکھا تھا لیکن چھپنا تو دور کی بات آپ نے ذکر تک نہیں کیا۔ پھر آپ کہتی ہیں کہ آپ سے اپنا دکھ سکھ Share کر سکتی ہوں۔ رضوانہ باجی میں آپ سے خفا ہوں اور بطور احتجاج تبصرہ نہیں لکھ رہی کتنے شوق سے میں نے دوشیزہ خریدا تھا لیکن.....

کھ: ارے ارے ہماری پیاری سی گڑیا تو بہت خفا لگ رہی ہے۔ بیٹا ہم دنیا کے کسی بھی کونے میں چلے جائیں ہرگز نہیں بدلیں گے بس لندن میں اپنی مصروفیات کی بنا پر ہم وہاں سے کچھ خطوط کے جواب نہیں دے سکے تو گڑیا اس کے لیے ہم تمہیں سوری کہتے ہیں بس اب فنانس اپنی پیاری سی ہنسی کے ساتھ رضوانہ باجی سے ملنے محفل میں چلی آؤ ہم منتظر ہیں۔

✉: لاہور سے اپنی خوشی کا اظہار کرتی ہوئی راحت و فارا جیوت ہم سے کہہ رہی ہیں کہ ابھی ابھی مجھے اس ماہ کا دوشیزہ ملا ہے میری کہانی کو جگہ دینے کے لیے بہت بہت Thanks آپ کی تحریریں میں بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ آپ بہت اچھا لکھتی ہیں۔ اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

کھ: پیاری پیاری سی وفا! تمہاری کہانی نے خود دوشیزہ میں جگہ بنائی ہے ہمارا کوئی کمال نہیں ہم چاہتے ہیں کہ دوشیزہ میں اچھی اور معیاری کہانیاں لوگوں کو پڑھنے کے لیے ملیں بس اسی بات کو مد نظر رکھتے ہوئے ہمیں مزید تحریریں بھیجتی رہنا اور ہاں اپنی خوشی میں تبصرہ لکھا بھول گئیں کیا.....؟

✉: ہماری ہر دل عزیز رائیٹرز چوہدری ابھی ابھی ہماری محفل میں آ کر بیٹھی ہیں ڈیر رضوانہ اور پیاری پیاری دوشیزہ بہنوں السلام وعلیکم کیا حال ہیں۔ میری رائیٹرز فرینڈ تو ماشاء اللہ بہت لکھ رہی ہیں اللہ دے زور قلم اور زیادہ جی تو چاہ رہا ہے کہ اچھا سا تبصرہ لکھوں مگر پچھلے دنوں باجی کی طبیعت کافی خراب رہی اللہ کا شکر ہے کہ اب وہ ٹھیک ہیں اور دوسرا میرے بہنوئی جاوید چوہدری کا امریکہ میں بائی پاس ہوا ہے بس ان ذہنی پریشانیوں میں مجھے ٹھیک طرح سے دوشیزہ کا مطالعہ نہیں کرنے دیا اور نہ ہی میں کچھ لکھ سکی لیکن رضوانہ انشاء اللہ میں جلد ہی اپنی کوئی تحریر آپ سب کے ذوق سلیم کی عدالت میں پیش کروں گی ماشاء اللہ دوشیزہ روز بروز

نکھرتا جا رہا ہے اور کیوں نہ ہو جس پرچے کی ایڈیٹر میری حسین مسکراہٹ والی دوست ہوگی وہ حسین ہی ہوگا اور دوشیزہ کا ایک سلسلہ یہ ہوئی نہ بات مجھے خاص طور پر بہت پسند ہے زین العابدین کا برجستہ انداز بہت دل چپ ہوتا ہے اللہ دوشیزہ کو مزید کامیابیوں سے نوازے اور آپ سب کو شاد و آباد باہور ہیں۔

بھ: پیاری سی رُخ! یہ تمہاری محبت ہے کہ اپنی پریشانیوں کے باوجود ہم لوگوں سے ملنے اس محفل میں آگئیں۔ ہم سب دل سے تمہاری حاجی اور تمہارے بہنوئی کی مکمل صحت یابی کے لیے دعا کر رہے ہیں اور ہاں تمہارے فیز تمہاری تحاریر کے منتظر ہیں بس جلدی سے کوئی خوبصورت سا افسانہ یا ناولٹ بھیج دو۔

✉: تسنیم ماہ پارہ صاحبہ ڈیفنس کراچی سے ہماری مہمان بنی ہیں ڈیر رضوانہ میں اس سے پہلے بھی آپ کی محفل میں شریک ہو چکی ہوں میں دوشیزہ کی بہت پرانی قاری ہوں سہام مرزا صاحب کے زمانے میں دوبار دوشیزہ ایوارڈ کی تقریب میں بھی شامل ہو چکی ہوں اب پھر کافی عرصے بعد دوشیزہ پڑھنا شروع کیا ہے انشاء اللہ آئندہ مفصل تبصرے کے ساتھ آؤں گی۔

بھ: اچھی تسنیم ماہ پارہ! پڑھ کر اچھا لگا کہ آپ دوشیزہ کی دوبارہ قاری بن گئی ہیں اب ہم آپ کے تبصرے کے منتظر رہیں گے۔

✉: ندیا مسعود کراچی سے ہماری محفل میں خوشی سے چمکتے چہرے کے ساتھ آئیں ہیں ڈیر رضوانہ میں اور میرے شوہر مسعود کل حج کی سعادت کرنے کے لیے روانہ ہو رہے ہیں۔ دل میں خوشی کا عالم نہ پوچھو۔ اس ماہ دوشیزہ ابھی تک نہیں ملا لیکن خیر کوئی بات نہیں انشاء اللہ واپسی پر دو ماہ کے اکٹھے ہی مل جائیں گے۔

بھ: ندیا ڈیر! اللہ تم لوگوں کو حج کی یہ سعادت بہت بہت مبارک کرے ساتھ خیریت کے واپس آؤ۔ دوشیزہ کے تمام دوست تمہیں مبارک باد دے رہے ہیں۔

✉: رخسانہ رضوی بہت دور یعنی لندن سے ہماری محفل میں تشریف لائیں ہیں ڈیر رضوانہ تم نہ صرف لندن کو بلکہ ہمارے دلوں اور گھر کو بھی سونا کر کے دوشیزہ کی خاطر واپس چلی گئیں۔ جس کا شکوہ ہم تم سے نہیں بلکہ منزہ سہام سے کر رہے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہم منزہ کو اور تمہیں اتنے خوبصورت ڈائجسٹ کی مبارکباد بھی دینا چاہ رہے ہیں جس میں تم لوگوں نے ایک دنیا سمودی ہے یقین جانو تمہارے جانے کی بوریت ہم دوشیزہ پڑھ کر مٹا رہے ہیں ہمیں امید ہے کہ یہ مزید خوب سے خوب تر ہوتا جائے گا۔

بھ: بہت پیاری رخسانہ! سب سے پہلے تو محفل میں ہم سب تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں دوستو رخسانہ ہماری بھابی ہیں اور انہوں نے ٹھیک ہی لکھا ہے اپنی دوشیزہ کی خاطر ہی ہمیں واپس آنا پڑا اور نہ اتنے پیارے پیارے رشتوں کو چھوڑ کر آتے ہوئے دل کا عالم نہ پوچھیے۔ اور ہاں رخسانہ تمہارے شکوے کا جواب منزہ نے بڑی پیاری مسکراہٹ سے دیا ہے۔

✉: ہماری دیر نہ ساسھی رضوانہ کو ٹرلاہور سے لکھتی ہیں۔ پیاری رضوانہ اللہ آپ کو تاحیات ہنستا مسکراتا رکھے آئی 11 دسمبر کو دوشیزہ ملا ٹائٹل کارنگ روپ کھلا کھلا۔ اشتہارات کی پگڈنڈی پہ قدم رکھتے ہی فولڈر کو پھیلا نگا۔ بہو سے کہا فرش چکائے جراثیم بھگائے، نان کھٹائی چکھی کچھ بہتر پائی۔ آگے کوئی کام کی چیز نہیں تھی جو ہم استعمال کرتے شیلڈ سمیت کہ گھر کا چھوٹا بچہ بھی اب بڑا ہے۔ بہر حال یہ تو میرے من کے

جذبوں کی بات تھی اب کرتے ہیں اپنی سبیلی دوشیزہ کی بات۔ فہرست عبور کر کے ادارہ پڑھا۔ میرے عزیز بیٹے کاشی نوجوان ہوتے ہوئے بھی دوشیزہ کا ہاتھ تھام کر چھوڑ رہے ہو مگر یہ خوشی ہے کہ اسے رضوانہ پرنس نے محبت اور خلوص سے تھام لیا ہے اور آپ بھی ہمارے ساتھ ہو سچی کہانیوں کی رفاقت سمیت۔ آمین۔

منورہ نوری تو ہمیشہ ہم سب کے دلوں میں زندہ رہیں گی 'سہام مرزا' کی طرح۔ رضوانہ پرنس آپ نے لندن میں بیٹھ کر جس طرح محفل سجائی بہت خوب۔ بہت اچھا لگا سب سے پہلے عاشا نور عاشا، منعم اصغر، صائمہ بشیر، سیدہ کاظمی، آپ کو محبت بھری دعاؤں کے ساتھ خوش آمدید خولہ عرفان کی نظم سیدھی دماغ سے ہوتی ہوئی دل میں اتری۔ شگفتہ شفیق 8 اگست کو فون کیا تو شہر سے آپ کے کنزل کے پاس جانے کا علم ہوا۔ سنبل، فریدہ فری، مسز نوید ہاشمی، نگہت اعظمی، صفیہ سلطانہ، فیصہ آصف، زمر نعیم، نسیم نیازی، رضوانہ پرنس، کاشی، پیاری منزہ آپ سب کی میرے ساتھ محبتوں اور مان بھروسے کا دل سے شکریہ۔ فہد مرزا سے ملاقات اچھی لگی۔ اے آروائی کے پروگرامز سے مزید روشناس ہوئے۔ لوجی آگے تو ہماری صفیہ کے صاحبزادے شرجیل دولہا بنے بیٹھے ہیں۔ ماروی اور شرجیل اچھے لگ رہے ہیں۔ لائف بوائے سے مربوط سلسلہ بھی خوشگوار ہے۔ رفعت سراج صاحبہ اور ام مریم کے ناول بھی بہت عمدہ اور خوبصورت سچائیوں سے سجے ہیں۔ رفعت سراج کا تو مستند نام ہی کافی ہے۔ روحیلہ خان کی تھینک یو اللہ میاں میں ایک اہم بات کو بڑے احسن طریقے سے دلوں میں اجاگر کیا، شیم فضل خالق کی بلندی..... پستی بھی اچھی لگی۔ نیک اولاد اللہ کا عظیم تحفہ ہوتی ہے آگے بڑھے تو زمر نعیم کی محبت کی سرزمین پہ کھڑی محبت کے یقین کی گواہی مانگ رہی تھیں ابھی دوبارہ ان صفحات پہ پا کر ان کی دوشیزہ سے محبت پر پکا یقین کر لیا۔ بیچارہ شہری جان سے گیا ماں بہنوں کی ضد میں تھوڑا انتظار اور کر لیتا تو شاید۔ الماس روجی کی بڑے سرکار ہر گھر ہر دور کی سچائی ہے حنا بشری بھی پراثر لکھنے والوں میں شمار ہوتی ہیں۔ بحر آگہی دنیا کی اناؤں سے ہوتی عشق حقیقی کی پہچان ہے۔ راحت و فارا جیوت کی 'پاگل آنکھوں والی لڑکی' دلوں پہ محبت کا بوجھ لیے خوشگوار تحریر، راحت آپ نے اچھا کیا نادر دوشیزہ کے آنگن میں آ کے۔ میں نے کہا تھا نا آپ کو کے آ کے دیکھو تو سہی۔ محمد ابو ہریرہ کی دوپل کی ملاقات بھی ہلکی پھلکی تحریر رہی۔ فو ذیہ احسان رانا کی 'لحوں نے خطا کی تھی' اور مسافت کتنی طویل حصے میں آئی اس خطا کے بدلے۔ ام مناہل کا گھنا سا یہ تشنہ آرزوؤں کا نوحہ کہ انسان کے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ معاویہ عنبر کی تحریر 'عنبرین کی شادی' معاشرے کے علمبردار رشتوں کی کتھا جو ہر دوسرے گھر میں بڑے فخر اور دلیلوں سے ہو رہا ہے۔ بینا عالیہ 'تیرے عشق نچایا' میں عشق کے مارے سب اپنی اپنی جگہ ناچ رہے ہیں۔ ہائے بیچاری ام فردا اب دیکھیں اس کی قسمت کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ خالدہ حسین کی آخری وسل حقیقتاً بہت اچھی لگی رنگ کائنات میں پڑوسیوں نے خوب دھمال ڈالی۔ فلموں اور فلمی ستاروں سے کوئی دلچسپی نہیں الجھنیں اور ان کا حل اچھا سلسلہ ہے۔ باقی سلسلے بھی مفید ہیں تسنیم منیر علوی کو ایوارڈ کی احمد سجاد بابر، عبدالرحمن کاشی، دانیال آپ سب کو ماہ اکتوبر اور میرے بیٹے حسن جمال کو بھی 14 اکتوبر دوشیزہ کی معرفت سالگرہ مبارک ہو۔ میرے خیال میں اب اجازت لے لوں۔

کھ: بہت پیاری رضوانہ! طبیعت کی خرابی کے باوجود آپ اس محفل میں اتنے پیار اور خلوص سے آتی

ہیں کہ دل خوش ہو جاتا ہے۔ جیتی رہیے۔

✉: اور جناب یہ لاہور سے ہماری خولہ عرفان محفل میں شامل ہیں خط تحریر کرنے سے پہلے ہر دفعہ سوچتی ہوں کہ ابتدا ذرا ہٹ کر ہو لیکن محفل کے تقاضے بدلے نہیں جاسکتے اس لیے رب سے آپ کی سلامتی، صحت اور نیک تمناؤں کے ساتھ یہی شروعات بہترین ابتدا ہے بعد از تمہید عرض ہے کہ ماہ دسمبر کا دو شیزہ بھی ہمیشہ کی طرح سبز ورق پر موجود خوبصورت ماڈل کے ساتھ بہت سکون دے رہا تھا۔ لیکن کاشی صاحب کا یہ ادارہ پڑھ کر دو شیزہ کے ہاتھوں میں آنے والی خوشی چند لمحوں کے لیے کافی ہو گئی کہ وہ اب دو شیزہ کی ادارت سے دستبردار ہو رہے ہیں بہت اچھا وقت گزرا ہے دو شیزہ کے صفحات پر ان کے ساتھ لیکن ان کو بتادیں کہ چاند کہیں پر بھی طلوع ہو وہ اپنی ٹھنڈک اور روشنی سے کسی کو محروم نہیں کرتا۔ منورہ نوری خلیق صاحبہ کی کاوشیں قابل تحسین ہیں۔ دو شیزہ کی محفل کا کوئی جواب نہیں جہاں کاشی صاحب کے جانے کا افسوس ہے وہاں آپ کی وطن واپسی کا سن کر خوشی بھی ہوئی حالانکہ میں نہیں سمجھتی کہ ہماری محبتوں پر فاصلوں کے اثرات مرتب ہوئے ہیں ہوا پھول کے بہت لاڈ اٹھاتی ہے اس کی خوشبو کو اپنی بانہوں کے حصار میں لے کر فاصلے طے کر لیتی ہے لیکن خوشبو کی سرشاری اسے تھمکنے نہیں دیتی اسی طرح دو شیزہ آپ کی باتوں کی مہک میلوں فاصلے ہونے کے باوجود ہم تک پوری تازگی کے ساتھ پہنچاتا رہا ہے۔ اب آتی ہوں تبصرے کی طرف سب سے پہلے تو سنبھل صاحبہ، عقیلہ حق صاحبہ، شمینہ عرفان، پروفیسر صفیہ سلطانہ منغل، فیصیحہ آصف خان، نزہت جبین ضیا اور مسز نوید ہاشمی صاحبہ کا بہت بہت شکریہ شکر یہ کہ انہوں نے میری پہلی کاوش کو لائق تبصرہ سمجھ کر حوصلہ افزائی فرمائی۔ یقین جانے میرے احساسات اس شیرخوار بچے جیسے ہیں جو وہ اپنی زندگی کا پہلا قدم اٹھانے پر اپنی محبتوں کے چہرے پر دیکتی خوشی کو دیکھ کر محسوس کرتا ہے اور وہ خوشی ہی اس کے قدموں کو طاقت اور اس کے راستے کو روشنی مہیا کرتی ہے اس کے قدم آگے ہی آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں جب جب میرا قلم کاغذ کے سینے کو محبتوں اور حقیقتوں کے رنگ سے روشن کرے گا وہ آپ کی حوصلہ افزائی کا امیں ہوگا۔ جزاک اللہ! افسانے سب بہت عمدہ تھے سب کے ساتھ نگاہوں نے انصاف کر لیا ہے البتہ ناول اور ناولٹ اس انصاف سے محروم رہ گئے ہیں کیونکہ وقت کم اور مقابلہ سخت ہے۔ آج سترہ ستمبر کا سورج بھی پردہ فرما چکا ہے اٹھارہ کی رات کسی ممتحن کی طرح سر پر کھڑی ہے کہ خط جلدی ختم کریں ورنہ وقت ختم ہو جائے گا اور آپ کا خط اشاعت سے خدا نخواستہ محروم رہ جائے گا اگرچہ ہر ایک افسانے پر دل بار بار سب مصنفین کو فرداً فرداً خراج تحسین پیش کرنا چاہ رہا ہے لیکن محمد ابو ہریرہ بلوچ کے افسانے کا ذکر نہیں کیا تو نا انصافی ہو جائے گی کہ دوپل کی ملاقات طویل عرصے تک ذہن سے نکل نہیں سکے گی بہت شاندار بہت خوب۔ نظم مچھوڑنی کی اشاعت اور نظم سرانے کے لیے بھی نوازش انشاء اللہ اگلی دفعہ بھر پور تبصرہ ہو گا کافی الحال اس تھوڑے کو بہت سمجھ لیں۔ اور پیشگی عید الاضحیٰ کی مبارک باد کے ساتھ جازت چاہوں گی۔

کھ: بہت پیاری خولہ! آپ کا خط ہماری محفل کی رونق بڑھانے میں بڑا نمایاں کردار ادا کرتا ہے سالگرہ نمبر کے لیے کوئی اچھا سا افسانہ گفٹ کرنے کا ارادہ ہے کیا.....؟

✉: ہماری بہت پیاری سی بیبا عالیہ لاہور سے اپنے ناول کے بارے میں کچھ کہنے آئی ہیں۔ السلام

انہم اے راحت کے قلم سے تخلیق پانے والا ایک لافانی سلسلہ

ہم شکل

ایک نوجوان کی سرگزشت، جسے بچپن کی ایک بات یاد تھی،
جب اُس کی دادی اماں نے کہا تھا۔

”اللہ تعالیٰ نے دنیا میں ہر انسان کے ساتھ ہم شکل بنائے ہیں.....“

کیا یہ روایت درست ہے؟

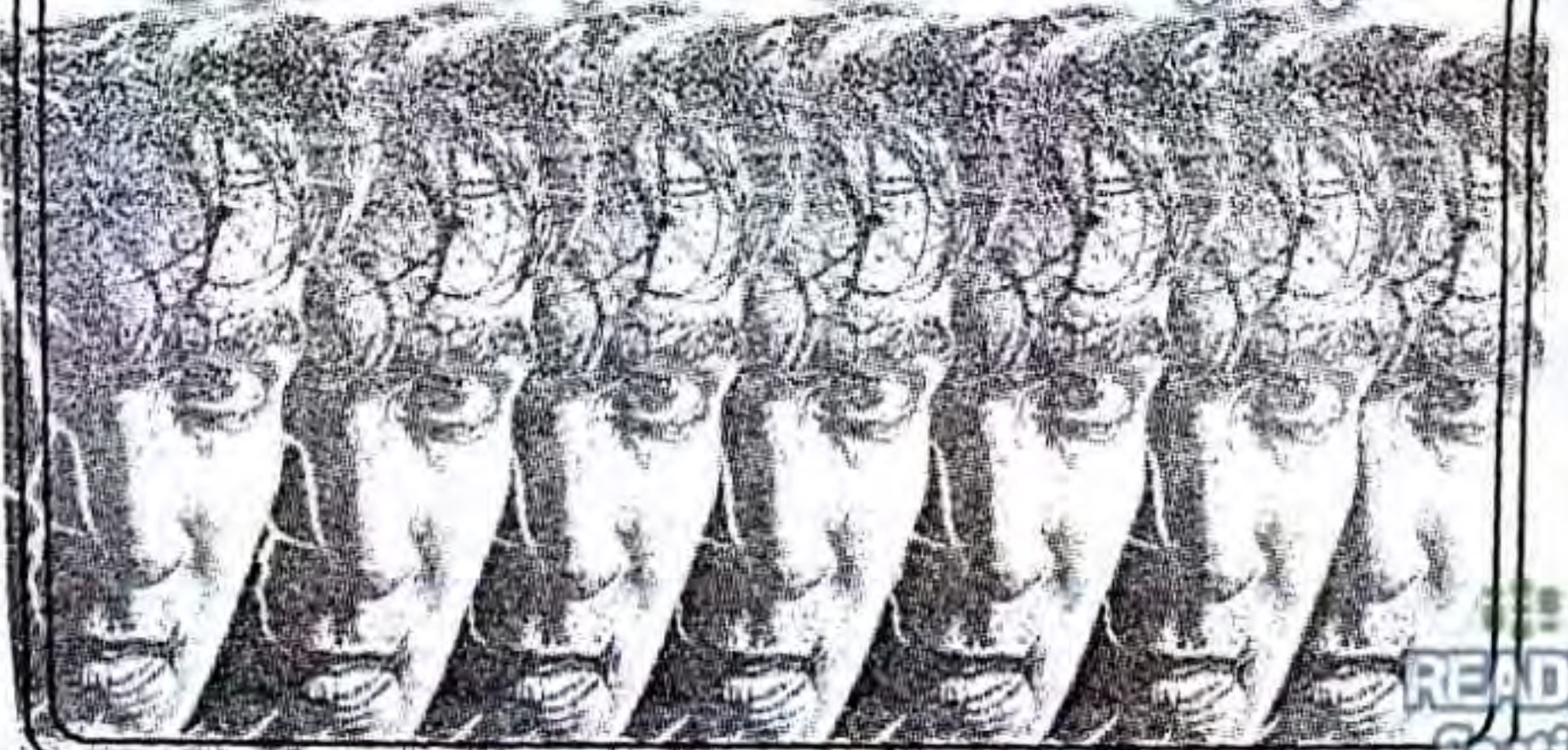
اسی روایت کی کھوج میں موت سے بچے کش اُس سرکش نوجوان کی

ناقابل فراموش داستان.....

کیا اُسے ساتوں ہم شکل ملے؟

کیا اُس نے موت سے جنگ کی؟

ایک انوکھی داستان جو ماہنامہ ”پگھل گئی“ میں درج ہے
آپ بھی پڑھنا صرف بھولے اور نادان ہم شکل کا حصہ بن جائے



READING
Section

وعلیکم خداوند آپ سب کو اپنے حفظ امان میں رکھے۔ دوشیزہ کو مزید کامیابیوں سے ہمکنار کرے۔ آمین۔
 میرا ناول 'تیرے عشق نچایا' آخری قسط کے ساتھ اختتام پذیر ہوا اس ناول کی تھیم تھی ایمان، یقین بھروسہ
 اور حقوق عباد۔ قارئین کی اکثریت نے اس ناول کو پسند کیا چند کو بور بھی لگا یہ تو اپنے مزاج اور اپنی پسند کی
 بات ہوتی ہے۔ پہلی قسط کے بعد میں نے اپنے خط میں لکھا تھا یہ میرا پہلا ناول ہے میں نے اسے کسی
 پلاننگ کے ساتھ نہیں لکھا بلکہ اللہ نے چاہا تب اس کے لیے میرا قلم اٹھا۔ میں طویل ناول لکھنے والی رائیٹر
 ہوں لوگوں کے کہنے کے باوجود کبھی میرا ناول کی طرف رجحان نہیں ہوا شاید اب بھی میں نہ لکھتی اگر میرے
 ذہن میں اُم فرودا کا کردار نہ آتا تو۔ بغیر کسی سوچ کے خود بخود یہ کہانی ذہن میں اتری۔ وہ بھی کچن میں کھانا
 بناتے ہوئے۔ یہ ناول لکھنے کے دوران میری کوشش تھی کہ قارئین کی توجہ حاصل کر سکوں کہیں بھی شکایت کا
 موقع نہ دوں کرداروں کو ان کے ماحول کے مطابق انہیں لے کر چلی ہوں۔ منظر کسی پر توجہ دی یہ سب محنت
 اپنے قارئین کے لیے ہی کی ہے ناں میں نے؟ رائیٹر وہی کہلاتا ہے جو تھیم کے مزاج کو سمجھتے ہوئے اس
 کے پیچھے پیچھے چلے جو کہانی کے آگے بھاگتے ہیں وہ کبھی اپنے قلم سے انصاف نہیں کر پاتے۔ اگر قاری
 سرسری طور پر کہانی پڑھے گا تب تنقید کے علاوہ اس کے ذہن میں کچھ نہیں آئے گا چاہے رائیٹر جتنی جان
 مارے مجھے ادارے سے شکایت ہے کہ انہوں نے میرے ناول کا بھرپور خلاصہ کبھی بھی نہیں دیا تب پڑھنے
 والا اندازہ لگاتا ہے کہانی وہیں کھڑی ہے آگے نہیں بڑھی ایسا نہیں ہے یہ ناول اپنے مزاج سے آگے بڑھتا
 ہے۔ قارئین کو حق ہے تنقید کرنے کا۔ کہا گیا فلاں کردار بور کر رہے ہیں بیٹا آپ کی دلچسپی اس ناول سے ختم
 ہوتی ہوئی محسوس ہو رہی ہے۔ ایسا کیوں ہے جواب تو آپ کو دینا ہی ہوگا؟ قارئین میں جواب دینے کے
 لیے آپ کی عدالت میں حاضر ہوں۔ کسی نے کہا چند اچھی تحریروں کے ساتھ عام سی تحریر کو برداشت کرنا ہی
 پڑتا ہے شکر یہ جی آپ نے اسے برداشت کیا۔ بالکل جی یہ ناول میں نے اس دنیا میں رہتے ہوئے اپنے
 ہوش و حواس کے ساتھ لکھا ہے۔ کہا گیا فرودا اور اس کے خاندان کو جنت کی حوریں بنا دیا گیا ہے۔ میں نے
 قارئین کی سہولت کے لیے بارہا یاد دہانی کرائی یہ فیملی عباسیہ خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ افغانستان سے
 ہجرت کر کے یہاں بسی ہے۔ اگر والدین خوبصورت ہوں تو بچے بھی ہوئے۔ اُم فرودا اپنی خوبصورتی کی وجہ
 سے بلال حمید کے فریب میں آتی ہے۔ جہاں تک ملک قاسم کی فیملی کے خوبصورت ہونے کا تعلق ہے رئیس
 زادے اکثریت میں گندی رنگت کے شیکل اور وجیہ ہوتے ہیں وہ شادیاں بھی حسین خواتین سے کرتے
 ہیں تاکہ ان کی نسلیں خوبصورت ہوں میں خودز میں دار فیملی سے بیلونگ کرتی ہوں۔ اس لیے بہتر طور پر سمجھ
 سکتی ہوں ان کے اقدار و روایات کو۔ نوکرائیوں کو جنت کی حوریں نہیں بنایا بلکہ ان کے ناموں سے پکارا
 ہے۔ لیجیے آپ کی خواہش پر ناول کا اختتام کر رہی ہوں۔ قارئین کی اکثریت نے تو صنفی کلمات سے
 نوازا۔ یہاں نام لکھوں گی تو خط طویل ہو جائے گا میں ان سب کی تہہ دل سے مشکور و ممنون ہوں۔ اراکین
 دوشیزہ کی خدمت میں دعاؤں بھرا سلام۔ فی امان اللہ محبتوں کے ساتھ۔

کھ: اچھی بیٹا! سب سے پہلے تو مبارک باد کہ آپ ناول نگار بھی بن گئیں۔ بیٹا! انسان جب بھی کوئی
 کام شروع کرتا ہے۔ اسے تعریف کے ساتھ ساتھ تنقید کا بھی سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اگر کچھ لوگوں کو آپ کے

ناول پر اعتراض ہوا تو اکثریت کو یہ پسند بھی آیا سو دل پر کچھ لینے کی بالکل ضرورت نہیں۔ آپ کی مزید خوبصورت تحریروں کے منتظر ہیں۔

✉: ہماری محفل میں آج پہلی بار ندا حسین کی آمد ہوئی ہے سب سے پہلے تو میرا پیار بھرا سلام ادارہ دوشیزہ اور خال طور پر رضوانہ پرنس کی خدمت میں عرض ہو کیونکہ ان کی محبت سے متاثر ہو کر میں نے پہلی مرتبہ دوشیزہ کی محفل میں شرکت کرنے کی ہمت پائی ہے۔ امید کرتی ہوں میری شرکت آپ سب کو بھی بھائے گی۔ اب بات ہو جائے دسمبر کے شمارے کے بارے میں۔ باتیں ملاقاتیں میں فہد مرزا کا انٹرویو بے حد پسند آیا۔ منی اسکرین دوشیزہ کا ایک بالکل منفرد سلسلہ ہے میں نے اب تک اس سلسلے کو کسی بھی ڈائجسٹ میں نہیں پایا۔ اس سلسلے کا خیال بلاشبہ ایک اچھوتا خیال ہے۔ شادی مبارک میں پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل کے صاحبزادے کے دولہا بننے کا دلچسپ حال احوال پڑھا۔ کچھ باتوں پہ دل دکھا تو بہت سی باتوں پہ دلی خوشی کا بھی احساس ہوا میری جانب سے آپ کو بیٹے کی شادی بہت مبارک ہو۔ رفعت سراج ایک مجھی ہوئی رائیٹر ہیں اور ان کی تحاریر پڑھ کر ہمیشہ بہت کچھ سیکھنے کو ملا۔ دام دل بھی انہی کہانیوں میں شامل ہے اور اس کی ہر قسط ہماری دلچسپی میں مزید اضافہ کر رہی ہے۔ رحمن رحیم سدا سائیں ام مریم کی ایک شاہکار تحریروں جو دل بہ دل نقش ہوتی چلی جا رہی ہے فوڈیہ احسان رانا ایک بہت اچھی لکھاری ہیں۔ اور ان کی ہر تحریروں معاشرے کے کئی تخیل روپ آشکار کرتی نظر آتی ہے۔ لمحوں نے خطا کی تھی جیسے زبردست ناول کو تخلیق کرنے پر ڈھیروں مبارک باد۔ بحر آگہی اور گھنا سا یہ لکھی خوب رہے۔ افسانے سب ہی ایک سے بڑھ کر ایک تھے۔ منفرد اور سبق آموز۔ دوشیزہ میگزین کے سب ہی سلسلے بہت خوب ہیں۔ مختصراً کہوں گی کہ دوشیزہ ایک مکمل اور با مقصد ڈائجسٹ کے معیار پر بخوبی اترتا دکھائی دیتا ہے۔ کیونکہ یہ خط لکھنے کی پہلی کوشش تھی اس لیے کمی بیشی معاف کرنے کی خواستگار ہوں۔ دعا ہے دوشیزہ کو اللہ مزید ترقی و کامیابی عطا فرمائے آمیں بہت ہی خلوص اور اپنے پن کے ساتھ اجازت چاہوں گی۔

کھ: پیاری پیاری ندا! دیکھو تو تمہارے آنے سے محفل مزید خوبصورت لگنے لگی ہے۔ پہلی بار آئی ہو لیکن اپنی اپنی سی لگ رہی ہو۔ اب تو سب لکھاریوں کو تمہارے تبصرے کا انتظار رہا کرے گا۔ تمہارا افسانہ بھی اس ماہ لگ رہا ہے۔ یہ ایک ملاقات اب جاری رہنی چاہیے کہ دوشیزہ اچھی تحریروں کی دلدادہ ہے۔

✉: شگفتہ شفیق بھی اپنی شگفتگی کے ساتھ یہاں براجمان نظر آ رہی ہیں۔ پیاری رضوانہ ہمیشہ مسکراتی رہیں۔ کیسی ہیں؟ اب تو آپ ہمارے پاس آگئی ہیں۔ گویا کہ اب ماشاء اللہ رونقیں بحال ہونے والی ہیں۔ اور بھئی اب تو عید ملن بھی چکی ہے انشاء اللہ۔ ستمبر کا دوشیزہ بے حد پسند آیا۔ ٹائٹل سے لے کر بیوٹی گائیڈ تک پیارا تھا۔ ساتوں افسانے بہت اچھے تھے۔ ام مریم کی تحریروں کی میں بہت عاشق ہوں اور رفعت سراج کا کیا کہنا۔ میری غزل لگانے کا بے حد شکر یہ۔ صفیہ سلطانہ کو بیٹے کی شادی بہت مبارک ہو۔ پیاری سنبل آپ کی مبارک بادوں پر شکر یہ کے ساتھ آپ کے لیے بہت سی دعائیں۔ پیاری منزہ اور تمام ادارے کے راکین اور سب قارئین و رائیٹرز کو دل سے عید کی مبارک باد۔ خدا کرے کہ یہ عید سب کے لیے خوشیوں کے نئے درتے وا کرے (آمین) ایک شعر آپ کی محبتوں کی نذر۔

پوچھا تھا ہم نے کیسی رہی آپ کی یہ عید
کہنے لگے کہ تم سے ملے بن کہاں کی عید

بھ: اچھی شگفتہ! اب تو عید کو گزرے کافی دن ہو گئے اور آج کل سانحہ منیٰ کے المناک واقعے نے دل
دہلایا ہوا ہے۔ یقیناً اس پر تمہارا قلم ضرور اٹھے گا۔

✉: ہماری محفل میں پہلی بار تشریف لائی ہیں پی ٹی وی کی مشہور سابقہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر فہمیدہ
نسرین صاحبہ۔ ڈیئر رضوانہ پرنس میری اور دوشیزہ کی بہت پرانی جان پہچان ہے ان فیکٹ بہت عرصہ پہلے
جب میں لکھا کرتی تھی تو میرے کافی افسانے بھی اس میں شائع ہوئے ہیں پھر اپنی مصروفیات اور بعد میں
اپنی طبیعت کی خرابی کی بنا پر قلم سے ناٹھ جیسے ٹوٹ سا گیا تھا لیکن پچھلے دنوں جب دوشیزہ کا اتنے عرصے بعد
دوبارہ مطالعہ کرنے کا اتفاقاً موقع ملا تو نہ جانے کیوں دل میں ایک بار پھر کچھ لکھنے کی تمنا جاگ اٹھی۔ انشاء
اللہ جلدی ہی میں دوشیزہ کے لیے اک اچھا افسانہ لکھ کر بھیجوں گی۔ یہ ڈائجسٹ ایک زمانے سے میرا کافی
پسندیدہ رہا ہے۔ اور دوبارہ اسے ہاتھ میں لیا ہے تو جیسے پرانے زمانے میں واپس لوٹ گئی ہوں۔

بھ: بہت اچھی فہمیدہ آپ کا اپنی مہکتی یادوں کے ساتھ اچانک اس محفل میں آ جانا ہم سب کو بہت اچھا
لگا ہے بس آپ انے وعدے پر قائم رہتے ہوئے جلد از جلد اپنا افسانہ ہمیں بھیج دیں کہ دوشیزہ ایک
ستارے کی طرح اسے اپنے آنچل میں ٹانک لے گی۔

ہم اپنی محفل کا اختتام کرنے جا رہے تھے کہ ایک بہت پرانے دوشیزہ کے قاری اور لکھاری محمد فہیم
صاحبہ کا کراچی سے ہمیں خط موصول ہوا السلام وعلیکم رضوانہ پرنس صاحبہ یہ جان کر خوشی ہوئی کہ آپ
واپس ادارے میں تشریف لے آئی ہیں ہمیں امید ہے آپ کی موجودگی پرچے کو مزید بہتر بنانے میں عمدہ
کردار ادا کرے گی اور ان پرانے رائیٹرز کو جو پرچے سے جذباتی لگاؤ رکھتے ہیں اور پرچے کی جان اور
شان دونوں ہی تھے ان کو واپس لانے میں کامیاب ہوں گی ہم آپ کو اپنے تعاون کا ہر طرح سے یقین
دلاتے ہیں۔ اور پرچے کی کامیابی کے لیے دل سے دعا گو ہیں کہ ہم پرانے رائیٹرز ہمیشہ سے اس ادارے
کے ساتھ مخلص رہے ہیں۔

بھ: بھائی فہیم! آپ کو ہم اس محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں دیکھیے ہماری دوشیزہ بھی اپنے اتنے
پرانے ساتھی کی آمد پر خوش نظر آ رہی ہے۔ آپ کو دیکھ کر ہمیں اپنے مزید کھوئے ہوئے رائیٹرز بھی یاد
آ رہے ہیں دیکھیں ہماری پکار پر کون کون چونکتا ہے۔

اچھا دوستو اب اجازت لینے کا وقت آ گیا ہے انشاء اللہ اگلے ماہ پھر اسی محبت کے ساتھ آئیے گا اور ہاں
ایک ضروری بات۔ جنوری میں ہماری دوشیزہ کی سالگرہ منانی ہے سو جلد از جلد اس کو اپنی تحاریر کی صورت میں
تختے بھیجوائیں وہ منتظر ہے۔ خدا حافظ کہتے ہوئے یہ شعر آپ کی نظر لیکن اس کی گہرائی کو سمجھنا بھی ضروری ہے۔

دعاؤں کی طالب
رضوانہ پرنس

کس بھیس کس لباس میں مل جائے کب خدا
رکھے دعا سلام ہر اک خاص و عام سے

اریج فاطمہ



دوشیزہ کے قارئین کے پر زور اصرار پر ایک بار پھر انٹرویوز کا نیا سلسلہ.....

ہم: اوہ اس کا مطلب آپ امریکی بچی ہیں.....

حیرت سے کیا مطلب؟ اور پھر مطلب سمجھتے ہوئے زور سے ہنس پڑیں..... اچھا تو آپ میرے Star کا مذاق اڑا رہی ہیں..... ہاں بالکل میں Scorpio ہوں۔

ہم: چلیں یہ تو طے ہوا کہ آپ حسین ہونے کے ساتھ ساتھ ذہن بھی ہیں اب یہ بتائیے کہ پڑھائی میں کیسی رہیں.....؟

ارتج: میں نے میٹرک کے بورڈ میں پوزیشن لی تھی پھر ویسے میں نے موٹیسوری کورس کیا ہوا ہے۔

ہم: اچھا یہ بتائیے کہ آپ شو بزم میں کب آئیں۔

ارتج: 2011 میں میں نے ماڈلنگ شروع کی اور پہلا Zong Add کیا (پھر کچھ سوچ کر ہنستے ہوئے) اف میری اردو بہت خراب تھی بہت مشکل ہوئی Add میں پھر اس کے بعد

ہم دوشیزہ کے پڑھنے والوں کے اصرار پر انٹرویوز کا سلسلہ ایک بار پھر شروع کیا جائے اور مستقل جاری رکھا جائے تو جناب لیجئے آپ کی فرمائش پر پہلا انٹرویو شوخ و چنچل ارتج فاطمہ کا حاضر ہے۔ ارتج سے ہماری ملاقات ایک ڈرامے کے شوٹ کے دوران ہوئی جس میں وہ کل بہت مصروف ہیں مگر پھر بھی ہمیں وقت دیا۔ ہم: ارتج سب سے پہلے تو آپ کا شکر یہ کہ آپ نے دوران شوٹنگ مجھے وقت دیا۔

مسکراتے ہوئے۔ نہیں کوئی بات نہیں مگر آپ اپنا وعدہ یاد رکھیے گا کہ زیادہ وقت نہیں لیں گے۔

ہم: بالکل پکا وعدہ تو جلدی سے کچھ اپنے بچپن کے بارے میں بتائیے..... آپ کہاں پیدا ہوئیں اور ابتدائی تعلیم کہاں سے حاصل کی.....؟ میں نے 2 نومبر 89 کو امریکہ کے شہر میں پیدا ہوئی بچپن کا کچھ حصہ وہیں گزرا پھر پاکستان فیملی کے ساتھ آ گئی۔

دوشیزہ 24

READING
Section



ہم: آپ مصروف رہتی ہیں۔ فارغ وقت ملے تو کیا کرتی ہیں؟

ارتج: جی بالکل مصروفیت تو بہت ہے مگر میں اپنے اندر کا Artist گھر ساتھ نہیں لے جاتی وہیں سیٹ پر چھوڑ دیتی ہوں گھر پر میں بالکل عام لڑکیوں کی طرح وقت گزارتی ہوں۔

ہم: آپ کی بہت بڑی فین Following ہے۔ اپنے فینز کے لیے بتائیے کہ کھانا پکانے کا شوق سے یا نہیں؟

ارتج: (کھل کر ہنستے ہوئے) آپ میرا انٹرویو کر رہے ہیں یا مجھے Trap کر رہے ہیں ویسے میں اپنے فینز کو بتا دوں کہ مجھے کھانا پکانے کا بھی بہت شوق ہے۔ اور میں کافی چیزیں اچھی بنا لیتی ہوں۔

ہم: اچھا جلدی سے بتائیے آپ کے مشاغل کیا ہیں؟

ارتج: (گھڑی دیکھتے ہوئے) اب جلدی جلدی کی کرنا پڑے گی ویسے مجھے سیٹ ریڈی ہے شاپنگ کرنا اور سونا بہت پسند ہے۔

ہم: لباس کون سا زیادہ پسند کرتی ہیں؟
ارتج: مجھے لمبی قمیض اور چوڑی دار پاجامہ بہت پسند ہے۔ بڑی Elegant look آتی ہے اور یہ آپ کا آخری سوال تھا جب چھپ جائے تو مجھے ایک کاپی ضرور بھجوائیے گا۔

ہم: ضرور اور آپ کا بہت شکر یہ یوں ارتج فاطمہ سے یہ مختصر سے ملاقات تمام ہوئی لیکن میں اپنے پڑھنے والوں کو اس اچھی لڑکی کی خاص بات بتاؤں کہ ایک تو وہ بے حد ملنسار ہے اور حد سے زیادہ وقت کی پابند اور یقیناً وجہ ہے کہ آج ارتج فاطمہ ہر چینل کی Demand ہے اور کامیابی کی ضمانت ارتج ہمیشہ یونہی مسکراتی رہو۔

☆☆.....☆☆

ہم: اچھا ارتج یہ بتائیے کہ آپ کے نقوش بہت Unique سے ہیں اس کی وجہ کوئی خاص؟
ارتج: (واقعی میں) مسکراتے ہوئے دراصل پاکستانی اور ایرانی مکسچر ہوں شاید اس لیے کچھ مختلف لگتی ہوں۔

ہم: جو لوگ خود حسین ہوں دوسرے لوگ ان کو عام سے ہی لگتے ہوں گے چاہیے کہ اتنے خوبصورت کیوں نہ ہوں پھر بھی آپ کون سی پاکستانی ماڈل پسند ہے.....؟

ارتج: نہیں ایسا نہیں ہے خوبصورتی تو خوبصورتی ہی ہوتی ہے اور کوئی اسے Deny نہیں کر سکتا ویسے ماڈلز میں مجھے ایان علی بہت پسند

ہیں۔

READING
Section

روشنیزہ

چاکلیٹی ہیرو

فواد خان

17 سال کی عمر میں اپنی بیگم کو پروپوز کرنے والے ہیرو فواد خان

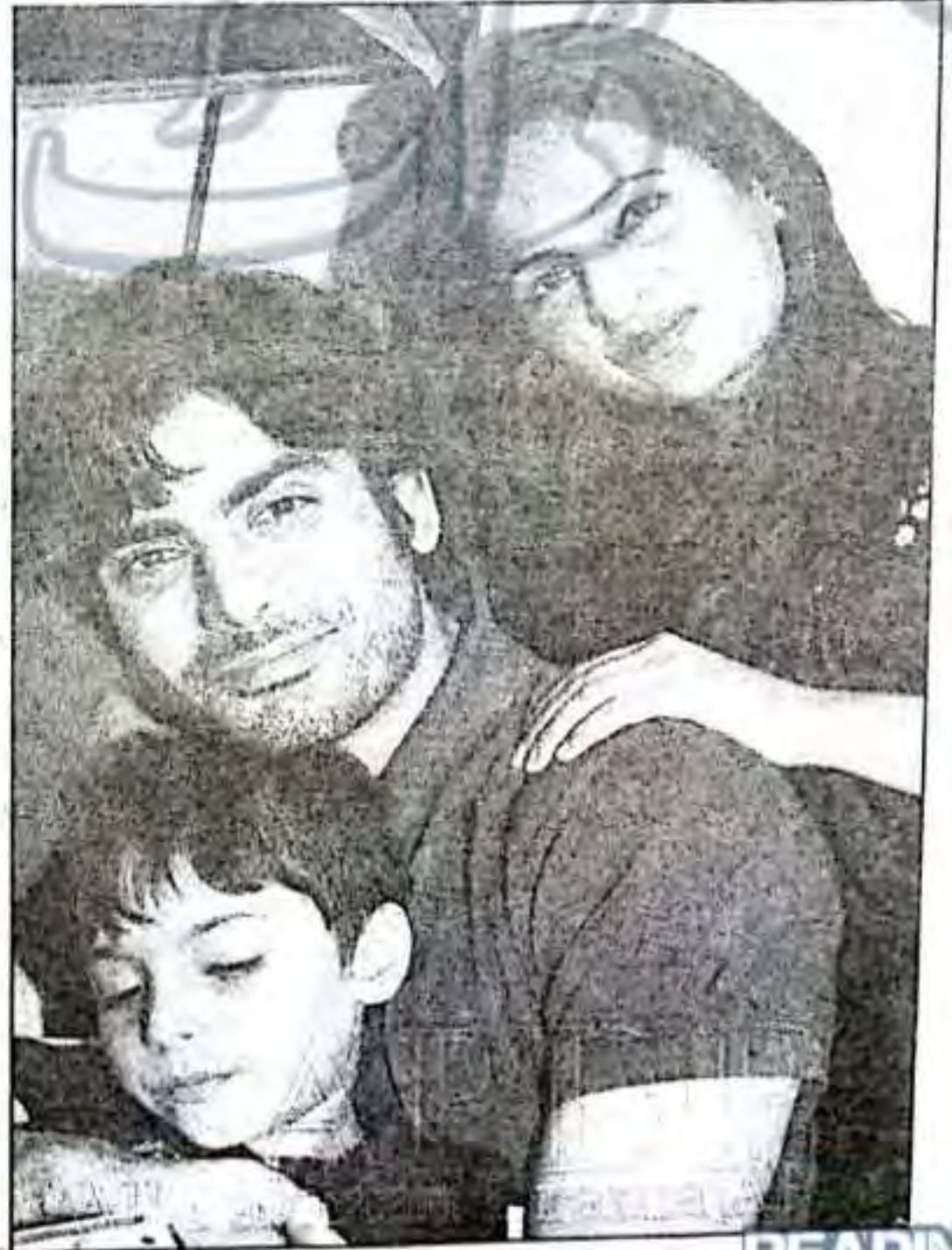
مونی خان

ابتدائی تعلیم لاہور سے حاصل کی پھر اس کے بعد نیشنل یونیورسٹی آف کمپیوٹر انجینئرنگ لاہور سے ٹیلی کام انجینئرنگ کی ڈگری لی۔ فواد بے انتہا مضبوط Will-power رکھتے ہیں جو ٹھان لیا وہ کر کے ہی دم لیا۔

2005 میں اپنے بچپن کی دوست صدف سے شادی کی یوں صدف کو وہ 17 سال کی عمر میں پروپوز کر چکے تھے۔ فواد کا ایک بہت ہی پیارا سا بیٹا 'ایان' ہے جس کی عمر 5 سال ہے۔ فواد کو بہت کم عمری میں زیا بیٹس کی بیماری نے توڑنے کی کوشش کی مگر مضبوط قوت ارادی کے حامل رہیں۔ اس ہیرو نے زیا بیٹس کو پچھاڑ کر کامیابی کا سفر جاری رکھا۔ فواد کا پہلا ڈرامہ ہٹ اینڈ بولڈ تھا اور پہلی فلم 'خدا کے لئے' جسے شعیب منصور نے پروڈیوس کیا۔ یہ فلم بہت بڑی ہٹ ثابت ہوئی۔

فواد کے کریڈٹ بے شمار کامیاب ڈرامے

29 نومبر 1981 فواد کی تاریخ پیدائش ہے
یوں وہ برج عقرب کے زیر اثر ہیں۔ فواد خان نے



دوسرے سیزن

READING
Section

چاکلیٹی ہیرو ہے جو سنگر بھی ہے۔

فواد نے بے شمار ایوارڈ حاصل کیے جس میں بہترین اداکار، اسکرین ایوارڈ اور فریش فیس ایوارڈ قابل ذکر ہیں۔ فواد بہت دوست بنانے کے قابل نہیں اپنا سب سے اچھا دوست اپنی بیگم کو مانتے ہیں۔ ہمارا یہ ہیرو انڈیا کے تمام ہیروز کے لیے خطرے کی گھنٹی ہے۔ اس خوب رو ہیرو نے بھارتی حسیناؤں کے چھلکے چھڑا دیے ہیں تقریباً تمام ہیروز کو فواد کے ساتھ



کام کرنا چاہتی ہیں..... ہم اپنی اور تمام پڑھنے والوں کی جانب سے فواد خان کو ان کامیابیوں پر مبارکباد پیش کرتے ہیں اور دعا کرتے ہیں کہ فواد کی کامیابی کا یہ سفر یونہی جاری رہے اور پاکستانی فلم انڈسٹری جو طویل عرصے کی خاموشی کے بعد ایک بار پھر اپنے قدموں پر کھڑی ہے بہت آگے جاتے فواد جیسا Talent سامنے لائے۔

☆.....☆.....☆



ہیں جیسے ہمسفر، زندگی گلزار ہے، اکبری اصغری، کچھ پیار کا پاگل پن وغیرہ، فواد نے دو فلمیں، 11 ڈرامے اور 3 ٹیلی فلمز کیں۔ سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا اداکار وحید مراد کے بعد دوسرا

دوشیزہ 27

READING
Section

کیل شرما

غربت بہت بڑی رکاوٹ ہے، انسان بہت بے بس محسوس کرتا ہے (کیل)

(ادارہ)

ہیڈ کانسٹیبل کا بیٹا جو 97 سے 2004 تک کینسر جیسے موذی مرض سے لڑتا رہا اور آخر سوائے غربت کے اپنی اولاد کو کچھ دیے بنا دنیا سے رخصت ہوا..... امرتسر سے تعلق رکھنے والے کیل

کو کالج کی فیس ادا نہ کرنے پر بار بار کالج سے نکال دیا جاتا تھا۔ تھیٹر کرنے کا شوق تھا۔ اس شوق میں لافٹر چیلنج کے سیزن 3 تک جا پہنچا مگر وہاں ریجیکٹ کر دیا گیا مگر کوششیں جاری رہیں مایوسی کو قریب نہیں آنے دیا یوں 2007 میں قسمت کی دیوی مہربان ہوئی اور پھر تو یہ سلسلہ تھما ہی نہیں اور اب تک جاری ہے کمیڈی

نائٹس میں کیل نے بھارت کے علاوہ پاکستان میں بھی بہت مقبولیت حاصل کی۔ آج کیل کے پاس وہ سب کچھ ہے جس کی انسان تمنا کرتا ہے۔ مگر دکھ ہے کہ کیل کے کیا خیالات ہیں آئیے

جانتے ہیں۔ والد نہیں رہے ان کی اس طرح خدمت نہیں کی جیسی کرنی چاہیے تھی۔ غربت بہت بڑی رکاوٹ ہے انسان بہت بے بس محسوس کرتا ہے۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ والدین کے جانے کے بعد ہی ہم Realize کرتے ہیں کہ وہ انمول تھے میرے والد کے دوست کو امرتسر میں پھل بیچا کرتے تھے اور پاکستان سے پھل

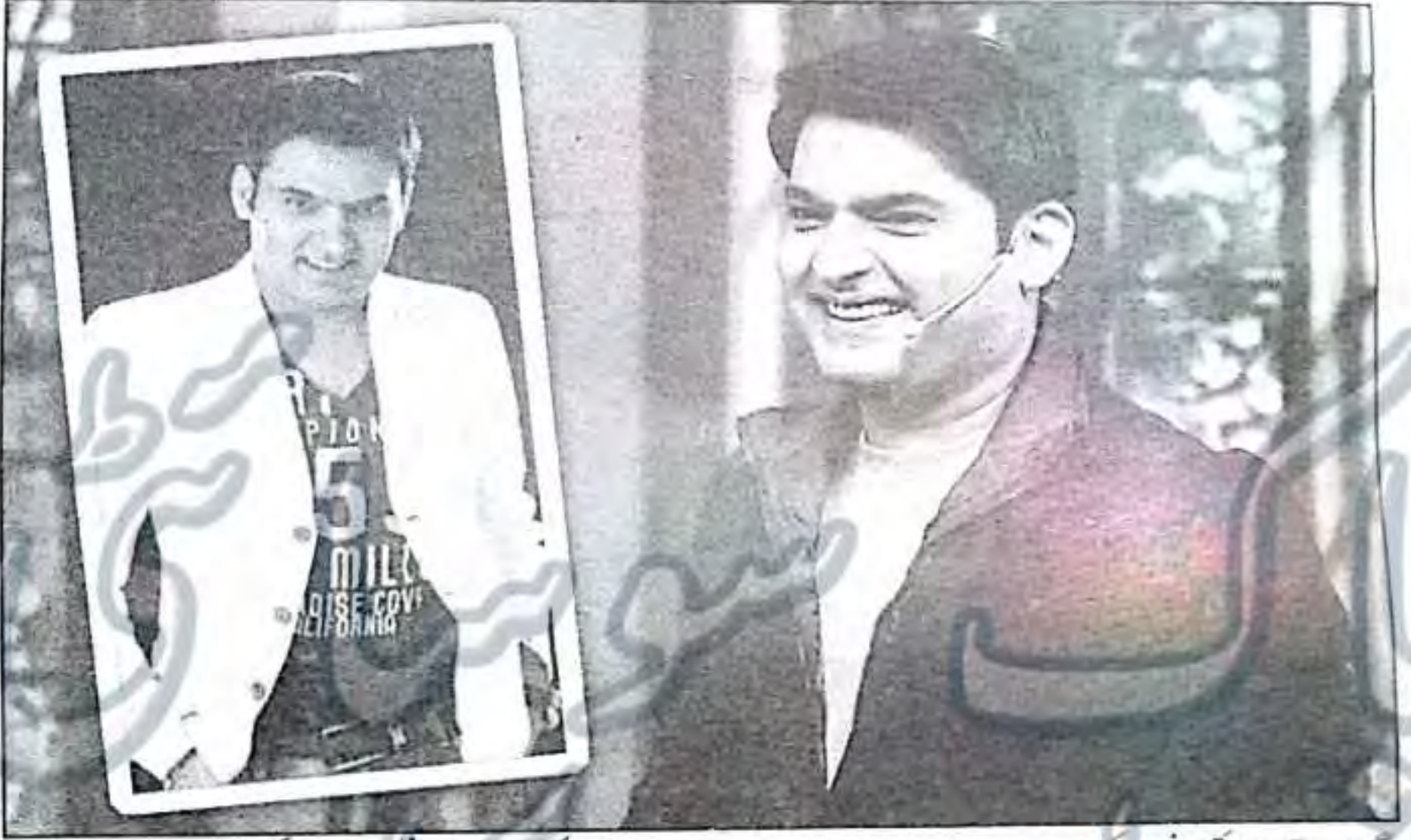


روشنیزہ 28

READING
Section

25 ستمبر کو میری پہلی فلم کس کس سے پیار کروں ریلیز ہو رہی ہے میں سب چاہنے والوں

منگواتے تھے ہمیں ضرور موسمی پھل بھجواتے تھے اس طرح میرا بچپن ہی سے پاکستان سے تعلق بن



سے یہی کہوں گا کہ فلم ضرور دیکھیں بہت خامیاں ہوں گی مگر میں انہیں دور کر دوں گا۔ میں صرف دنیا کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ وہ سب کچھ حاصل کیا جاسکتا ہے بس محنت اور لگن چاہیے ہوتی ہے عباس مسان صاحب نے مجھے اپنی فلم میں موقعہ دیا میں

گیا جو آج بھی فینز کی صورت میں موجود ہے۔ میری والدہ بہت سادہ طبیعت کی ہیں جب میں نے اپنے بہن بھائیوں کی شادی کر دی تو وہ چاہتی ہیں کہ اب میں 34 سال کا ہو گیا ہوں شادی کر لوں مگر میں صرف اپنے کام سے عشق رکھتا ہوں



ان کا بھی شکر گزار ہوں۔

اور دوستوں میں خوش رہتا ہوں۔ اور چاہتا ہوں

☆☆.....☆☆

کہ ساری دنیا میں خوشیاں بانٹ سکوں.....

رو شیزہ 29

READING
Section



دوشیزہ رائٹرز ایوارڈ

اگست 2015 کا نتیجہ: قارئین نے مندرجہ ذیل تحریر کو پسند کیا ہے

”محبت پہ یقین رکھنا“
زمر نعیم

آپ کی نظر میں اس ماہ ”دوشیزہ“ کی بہترین تحریر کون سی ہے؟

اکتوبر 2015

دوشیزہ

عنوان: _____
قلم کار: _____
نام: _____
پتا: _____

دوشیزہ
کراچی



READING
Section

اے آروائی کے خوبصورت پروگرام

مشخ

کا اعتراض اس سیریل کو ناظرین بہت توجہ سے دیکھ رہے ہیں۔ اے آروائی کی ای میل پر ناظرین اپنی پسند کا اظہار بھر پور طریقے سے کر رہے ہیں۔ اس سیریل کو تحریر کیا ہے سمیرا فضل ہدایت عامر یوسف کی ہیں جبکہ فنکاروں میں عمران عباس، ثانیہ سعید، سجا جاوید، شہریار، صبا فیصل، سندس

قارئین اے آروائی، آپ کا بے حد شکریہ آپ ہمارے حوصلے کو نئی روشنی خوبصورتی عطا کرتے ہیں آئیے اب چلتے ہیں خوبصورت پروگراموں کی طرف اے آروائی ڈیجیٹل سے سیریل "اعتراض" جبکہ اے آروائی زندگی سے سوپ ہماری بٹیا، سوپ بے گناہ، سوپ پھلجھڑیاں



ARY زندگی کے سوپ "ہماری بٹیا" میں فاطمہ آفندی

طارق، مناہل، جہاں زیب، ہاشم بٹ اور فرح ندیم قابل ذکر ہیں یہ اعلیٰ سیریل ہر منگل کی رات 8 بجے اے آروائی ڈیجیٹل سے دکھائی جا رہی ہے۔ اے آروائی ڈیجیٹل کے پروگرام ڈو پچر سیزن 2

اور سپر ہٹ پروگرام ڈو پچر سیزن 2 خصوصی طور پر دکھایا جا رہا ہے اے آروائی ڈیجیٹل کی سیریل "اعتراض" کی کہانی کچھ یوں ہے۔ یہ محبت کی ایسی کہانی ہے جس میں محبت بن جاتی ہے عمر بھر

روشنیزہ 31

READING
Section

اسے تحریر کیا ہے دلاور خان نے جبکہ ہدایت عمران بیک کی ہیں۔ کہانی کے حوالے سے اگر دیکھا جائے تو شگفتہ بیگم کا تعلق ایک مڈل کلاس گھرانے سے ہے جبکہ ان کے شوہر ریٹائرڈ آدمی ہیں اور گھر میں سکون سے رہتے ہیں جبکہ شگفتہ بیگم ایک ظالم اور لاپٹی قسم کی عورت ہیں۔ ان کے تین بچوں میں دو بیٹے اور ایک بیٹی شامل ہیں۔ کہانی کا مرکزی کردار احمر کی بیوی لائبہ اور شگفتہ کے دیگر بچے ہیں۔ لائبہ شگفتہ کے بیٹے احمر کی بیوی ہے جو کہ سسرال کے ظلم برداشت کر رہی ہے شگفتہ اس سے ملازموں

نے اپنی کامیابی کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔ مہوش حیات، شفاء فخر، فخر امام، شامسکری، دانش حیات نے اپنی اداکاری کے معیار کو برقرار رکھا اور لوگ ان کے کرداروں کو پسند کی نگاہ سے دیکھ رہے ہیں۔ ان فنکاروں نے غضب کا کام کیا ہے اس لاجواب اور منفرد شو کے ایگزیکٹو پروڈیوسر عبید خان ہیں، پروگرام میڈیوینچر سیزن 2 ہفتہ اور اتوار کی رات 10 بجے ARY ڈیجیٹل سے دکھایا جا رہا ہے جبکہ ARY زندگی سے سوپ ”پھل پھلیاں“ برکت اور شہباز دونوں کے بھائی



ARY ڈیجیٹل کے پروگرام ”مڈوینچر“ میں شامسکری اور فخر امام

سے بھی بدتر سلوک کرتی ہے جبکہ لائبہ اپنے شوہر کی بہت خدمت کرتی ہے جبکہ احمر کا افسر اُس کی بیٹی سے چل رہا ہے۔ احمر کی ماں شگفتہ بھی چاہتی ہے کہ احمر اپنے باس کی بیٹی سے شادی کرے تاکہ زندگی کے دن بہتر گزار سکیں کیونکہ لائبہ ایک غریب گھرانے کی لڑکی ہے۔ کیا احمر اپنے باس کی بیٹی سے شادی کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے؟ یہ تو اے آر وائی زندگی کے سوپ ”بے گناہ“ دیکھنے کے بعد ہی پتا چلے گا۔ اس سوپ کے فنکاروں میں

ہیں یہ دونوں آپس میں بہت محبت کرتے ہیں اور ان دونوں کی بیویاں سگی بہنیں ہیں جو ایک دوسرے کو سخت ناپسند کرتی ہیں۔ اس کی ہدایت افتخار انی، تحریر کیا ہے گل نوخیز اختر نے جبکہ فنکاروں میں اشرف خان، سلمیٰ حسن، محبت بٹ، فرح علی، آغا صدف حسن، ایمان خان شامل ہیں یہ سوپ جمعہ سے لے کر اتوار تک ARY زندگی سے شام 7 بجے دکھایا جائے گا۔ سوپ ”بے گناہ“ جو ناظرین کی توجہ کا مرکز بنا ہوا ہے

آفندی، سمن عابد، جویریہ اجمل، حماد خان،
عدنان شاہ ٹیپو، یاسر، فرحت ناز، محمد حنیف،

قاضی واجد، گل رعنا، عالیہ علی، فرقان قریشی، عمر
شہزاد، طاہر کاظمی، دیا مغل، حنیف محمد، فریال
راجپوت اور کائنات قابل ذکر ہیں۔ یہ سوپ
ARY زندگی سے جمعہ سے ہفتہ اور اتوار رات
7:30 بجے سے دکھایا جائے گا۔ ARY زندگی
سے پیش کیا جانے والا سوپ 'ہماری بٹیا' کی کہانی کا
مرکزی کردار فضا کے والد ہیں جو بے انتہا دولت
مند ہیں۔ وقت کے ہاتھوں ماڈرن زندگی اپنانے
کے باوجود اپنی روایات کی پاسداری کرتے ہیں
اور زندگی کی ہر خوشی سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔
ان کی گفتگو میں نوابوں کے سے اطوار پائے جاتے
ہے مگر ان میں روایتی تہذیب اور اخلاق کا عنصر



ARY ڈیجیٹل کی سیریل "اعتراض" میں ثانیہ سعید

فرقان قریشی اور ارشد فاروقی قابل ذکر
ہیں۔ سوپ 'ہماری بٹیا' پیر سے لے کر جمعرات
تک روزانہ 7 بجے دکھایا جائے گا۔ تمام
مشکلات کے باوجود اقرار اور ان کی ٹیم پروگرام
'سر عام' خوش اسلوبی سے کر رہے ہیں۔
پروگرام کے حوالے سے وسیم بتا رہے تھے کہ 'سر
عام' میں بہت مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے مگر
اقرار بھائی کی سنجیدہ طبیعت کے باعث ہم
مشکلات پر قابو پاتے ہیں۔ قارئین اے آروائی
کی ویب کو روزانہ تقریباً 3 لاکھ آدمی پڑھتے ہیں
جو ARY کے لیے کسی اعزاز سے کم نہیں۔

☆☆.....☆☆



ARY زندگی کے سوپ "بے گناہ" میں عالیہ علی اور دیا مغل

پایا جاتا ہے۔ اس کی ہدایت ایس حسن عباس، جبکہ
فنکاروں میں محسن گیلانی، شائستہ جمیل، فاطمہ

ناول رفعت سراج

دائِمِ اَدِل

قسط 9

معاشرے کے بطن سے نکلی وہ حقیقتیں، جو دھڑکنیں
بے ترتیب کر دیں گی رفعت سراج کے جادوگر قلم سے

چمن مشکور احمد کے ادبی ذخیرے میں سے کوئی تاریخی ناول نکال لائی تھی اور اندر سے شور غوغا کو دبانے کی
کوشش کرتے ہوئے مطالعہ کرنے میں مصروف تھی کہ عطیہ بیگم جلدی کے انداز میں دروازہ چوہٹ کھول کر اندر
چلی آئیں۔ طرز آمد اتنا غیر معمولی تھا کہ چمن کو چونک کر ہڑبڑا کر ان کی طرف دیکھنا پڑا۔



READING
Section

اس سے پیشتر کہ لب کشائی کرتی عطیہ بیگم بڑے پر جوش لہجے انداز میں گویا ہوئیں۔
شکر ہے مالک کا..... سب ٹھیک ہے..... جان سولی پر لٹکی ہوئی تھی مگر اب سکون ہے۔
کیا ہوا امی.....؟ کچھ سمجھ نہیں آئی..... چمن تجس کی انتہا پر پہنچ چکی تھی ابھی تھوڑی ہی دیر پہلے میری ثمر سے
بات ہوئی ہے۔

دشمن جان کا نام سن کر دل برے زور سے دھڑکا..... دو چاہنے والوں کے درمیان جدائی کا وقفہ از سر نو رومان
کا آغاز بن جاتا ہے ثمر کا نام ماں کے منہ سے نکلا اور دل مچلنے لگا۔
محبوب کے ٹھکانے سے آنے والی ہوائیں بھی بہشت کا تصور زندہ کر دیتی ہیں..... ماں کے انداز سے لگتا
تھا کہ خوش خبری کا توشہ پر یاں سر پر اٹھا کر لائی ہیں۔
میں نے تم سے کہا تھا نا..... میاں بیوی کا رشتہ ہے ہی ایسا دشمنوں کی طرح لڑتے ہیں بچوں کی طرح صلح
کرتے ہیں۔

..... کانوں میں کسی نے امرت یا شہد ٹپکایا تھا۔
وہ ساری رومانی راتیں نگاہوں میں ٹھہرنے لگیں جو ذات کی تکمیل کے سامان کرتی ہیں..... حتیٰ کہ کسی کی گرم
سانسیں چہرے کو یوں چھونے لگیں جیسے فاصلے محض تصور آتی تھے کوئی پاس ہی کھڑا قرب کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔
بات کیا ہوئی.....؟ یا آپ نے درخواست کی تھی.....؟ وہ محبت ہی کیا جو بدگمانی کی دلدل سے ہو کر نہ
گزرے۔

Downloaded From Paksociety.com

میں کیوں درخواست کرنے لگی..... تمہاری ساس کے مزاج سے اچھی طرح واقف ہوں..... کرلیے کو نیم پر
نہیں چڑھاؤں گی۔
ماں کا جواب اتنا معقول اور جامع تھا کہ چمن میں جان آگئی اب اس نے کلام کے بجائے سوالیہ نظروں سے
ماں کا چہرہ کا مشاہدہ کیا جلدی سے اپنی چیزیں سمیٹو..... ابھی تمہیں تمہارے گھر چھوڑ کر آتی ہوں۔ عطیہ بیگم پر ایسی
عجلت سوار تھی گویا ذرا سی دیر ہوگئی تو ثمر اپنا فیصلہ تبدیل ہونے کی خبر سنانے کے لیے فون کر دے گا۔
امی مجھے بھی تو بتائیں ایسا کیا کہا ہے ثمر نے کہ آپ اتنی رات کو وہاں جانے کے لیے تیار ہو گئیں..... آخر صبح
بھی تو ہوگی۔

ارے بیٹا! آفرین ہے تم پر..... عورت اپنے گھر سے باہر ہو اور اسے اپنے گھر جانے کی جلدی نہ ہو..... وہ
بھی کوئی عورت ہے.....
جب سے تم آئی ہو میں کتنی مرتبہ مری اور کتنی مرتبہ زندہ ہوئی ہوں کبھی تمہارے طرف کبھی تمہارے باپ کی
طرف دیکھتی تھی..... انہیں ایک اٹیک پڑ چکا ہے۔

ارے میرا تخت و تاج ہے ان سے..... میری عمر بھی ان کو لگ جائے..... چلو بیٹا شاہاش..... اب دیر نہ کرو۔
عطیہ بیگم خوش کے مارے ریشمی ہو رہی تھیں۔ داماد نے بڑا مان رکھا تھا سو کھے دھانوں پر پانی پڑا تھا وہ
کسی بھی صورت Risk لینے کو تیار نہ تھیں۔

ثمر خود کیوں نہیں آئے.....؟ انہیں خود آنا چاہیے تھا چمن کے پندار نے اسے مشکل میں پھنسانا چاہا۔
اتنی بڑی بات اس نے کہہ دی کہ اس کا گھر ہے..... وہ خود گئی ہے تو خود ہی آ جائے.....



Downloaded From Paksociety.com

READING
Section



امی.....چمن اب بھی تذبذب کا شکار ہو رہی تھی۔
 ماں پر رحم کرو بیٹا.....اللہ بگڑی بات بنا رہا ہے.....رحم کرو خود پر بھی اور ہم پر بھی.....عطیہ بیگم بولتے بولتے
 آبدیدہ ہونے لگیں تو چمن ماں کے آنسو دیکھ کر شرمندہ ہو گئی ان آنسوؤں کا باعث وہ تھی۔
 اس نے ماں کی طرف دیکھا اور انا کے چہرے پر خاک اچھال دی۔

☆.....☆.....☆

نانا جان پلیز آپ یہ ٹیبلٹ کھالیں ندا اپنے نانا شبیر حسین کو کافی دیر سے دوا کھلانے کے جتن کر رہی تھی۔
 ہاتھ میں پانی کا گلاس اور دوسرے ہاتھ پر ٹیبلٹ رکھے ایک بے بسی کی کیفیت سے گزر رہی تھی۔ بیٹا ہم نے کہا
 ناں کے ہم انگریزی دوا نہیں کھائیں گے.....ارے ان انگریزی دواؤں پر اللہ کی لعنت.....ہم نے تہیہ کیا ہوا
 ہے کہ ہم مرجائیں گے مگر یہ دوائیں نہیں کھائیں گے۔ شبیر حسن بچوں کی طرح چل کر بول رہے تھے۔ ندا کے
 لیے اس وقت نوزائیدہ بچے کی مثل تھے جسے کروٹ بھی ماں دلاتی ہے اور کرسٹل کی طرح سنبھالتی ہے۔ نانا جان
 یہ دوا نہیں ہے آپ کا Bp Low ہے۔ یہ وٹامن کی ٹیبلٹ ہے اور نچ فلیورڈ ہے کڑوی بھی نہیں ہے.....
 ارے کہا ناں جب ہمارا عقیدہ ہی نہیں ان بدیسی ٹونکوں پر تو خاک شفا ہوگی ہمیں.....اٹھا کر باہر پھینک دو۔
 میں یہ نہیں کر سکتی۔ آپ میرے پیارے نانا جان ہیں۔

کیسے اٹھا کر باہر پھینک دوں.....ندا بری طرح پریشان ہو گئی ارے ہمیں نہیں.....ان دواؤں کو.....شبیر
 حسین نے بری طرح دھاڑنے کے لیے زور لگایا زور ہوتا تو لگتا.....بری طرح ہانپنے لگے۔
 نانا جان.....ندا نے پھر کچھ کہنے کی کوشش کی شبیر حسین نے ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔

تم اچھی طرح جانتی ہو ہم ان ڈاکٹروں سے دور بھاگتے ہیں۔ ہمیں جانا ہوتا تو کب کا چلے جاتے کسی نے
 زنجیروں سے تو نہیں باندھا ہوا۔
 حکیم صاحب آنے والے ہیں.....دوا ساتھ لا رہے ہیں۔ ان کی دوا سے اچھے ہو جائیں گے.....فکر نہ
 کرو.....شبیر حسین پھولی پھولی سانسوں کے درمیان بدقت تمام گویا ہوئے۔ آپ تو ویسے ہی بہت اچھے ہیں
 میں کب آپ کو برا کہہ رہی ہوں۔
 آپ کے یہ حکیم صاحب.....دو سال سے آپ کو چورن کھلا رہے ہیں۔ درختوں کے پتے جلا کر پیس کر
 لاتے ہیں۔

خبردار.....شبیر حسن نے ہاتھ بلند کر کے ندا کو مزید بولنے سے روکا۔ ندا گھبرا کر دھپ سے ان کے قریب
 پڑی "غدر" میں بچی ہوئی نایاب کرسی پر ڈھے ہو گئی۔ یہ وہ تاریخی کرسی تھی جو شبیر حسین کے پردادا نے بہادر شاہ
 ظفر کے قید ہونے کے بعد ان سے 'تبرکا' حاصل کی تھی۔ پشت در پشت اس کی Mentainess ہو رہی تھی
 اس میں گڑی ہر سائز کی میخوں سے اس کی قدامت Certifeed ہوتی تھی۔

ایسے حاذق، جہاں ہیں، مردم شناس، نبض شناس حکیم کسی کو نصیب سے ملتے ہیں.....حکمت ان کے خون
 میں ہے۔

ارے محمود غزنوی کے لشکر میں جو شاہی طبیب ہوتے تھے ان کے دادا اس کے ہیڈ ہوتے تھے۔
 جی میں سمجھ گئی.....حکیم صاحب کے گرینڈ فادر ہیڈ آف دی ہینٹل ہوتے تھے۔

”ارے..... ہم تو کبھی پیوند خاک ہو گئے ہوتے یہ تو حکیم کے کشتوں کا کمال ہے کہ اس عمر تک بچ گئے۔ اور خبردار جو تم نے ان کے کشتوں کو چورن کہا۔ شاہی اطباء کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ انگریزوں کو اسی لیے دھکے دے کر دیس سے نکالا تھا کہ ہماری اولادیں آزاد ہو کر بھی ان کی غلامی کریں۔

ہم نے کمشنری ٹھکرا دی تھی..... صرف اس وجہ سے کہ انگریز کا پہناوا پہننے کی پابندی نہیں تھی..... شبیر حسن کا تفاخر درمیان میں کھانسی کے زور میں ٹوٹ گیا۔

انگلش تو پڑھی تھی نا تب ہی تو جا ب آفر ہوئی ہوگی..... ڈنڈے کے زور پر پڑھی تھی ہماری اماں جان نے خود کشی کی دھمکی نہ دی ہوتی تو ہم کبھی نہیں پڑھتے۔

جنت مکانی احساس کمتری کا شکار ہو رہی تھیں کہ خاندان کے سب لونڈے گوروں کی پڑھائی پڑھتے ہیں۔ ہمارے صاحبزادے ہمیں رسوا کرتے ہیں دنیا کیا کہے گی نیپو سلطان کی پڑنوا سی جاہل رہ گئی.....

مجبوری تھی..... کیا کرتے.....؟ ماں سے منہ زوری تو نہیں کر سکتے تھے ناں.....؟

آپ نے نانی جان کی اتنی باتیں مانی ہیں..... ایک میری بھی پان لیں صرف یہ ایک ٹیبلٹ کھالیں..... دوسری نہیں کھلاؤں گی ندانے اسی لیے ان کی ساری باتیں غور سے سنی تھیں کہ وہ اپنے دل کی بھڑاس نکال کر ہلکے پھلکے ہو جائیں تو وہ استاد باؤڈا لے کہ شبیر حسین مزاحمت نہ کر سکیں۔

تم زمیں آسمان ایک کر دو..... ہم نے انگریزی دو انہ کھانے کی قسم کھائی ہے شبیر حسن کی ہٹ اور ریٹ دونوں برقرار تھیں۔ نذازیج ہوگی۔

یہ تو خود کشی ہوگی نانا جان..... خدا نخواستہ آپ کو کچھ ہو گیا تو میرا کیا ہوگا.....؟

ماموں جان پورے دو سال سے کہہ رہے ہیں کہ وہ ہمیں امریکہ بلا لیں گے..... دیکھ لیجئے..... نہ آتے ہیں نہ بلا تے ہیں ندانے رونے والی شکل بنائی۔

ہمیں ویسے بھی نہیں جانا..... وہ کہتے ہیں ہم سن لیتے ہیں..... ادھر بھی تو ’چرچل‘ اور ’ماؤنٹ بیٹن‘ کی اولادیں رہتی ہیں۔ ارے ہم اسی پاک سرزمین میں دفن ہوں گے اب تم جاؤ اپنا کام کرو..... شبیر حسین نے آنکھیں ماتھے پر رکھ لیں اور ندا کی طرف سے کروٹ لے لی۔

بے بسی کی وہ انتہا آ پہنچی جب آنکھیں چھلکتے پیمانے بن جاتی ہیں جتنی دھند آنکھوں کے سامنے تھی اس سے زیادہ ذہن کے پردے پرھی۔

☆.....☆.....☆

دروازہ ثمر نے کھولا تھا۔ چمن اور عطیہ بیگم کورات گئے اپنے سامنے پا کر ایک لمحے کو تو چکرا کر رہ گیا۔ نفیس، مہربان، مہذب، ناپ تول کربات کرنے والی خوش دامن کو انتہائی مخدوش حالات کے بعد نفیس کرنا آسان نہ تھا۔ چمن تو بڑی سی چادر میں لپٹی رخ پھیرے کھڑی تھی مگر عطیہ بیگم تو براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔

السلام وعلیکم آئی..... آپ اس وقت..... آئیے پلیز..... اب ثمر نے سٹپا کر ایک طرف ہوتے ہوئے آنے کا راستہ دیا۔

وعلیکم السلام بیٹا..... جس ماں کی بیٹی کی گریہ سستی داؤ پر لگی ہو اس کے لیے دن رات برابر ہوتے ہیں۔ عطیہ

بیگم کی آواز گلوگیر ہو گئی۔

آئیے اندر بیٹھ کر آرام سے بات کرتے ہیں..... ثمر نے نگاہ بچا کر چمن کی طرف دیکھا جو قرب کی منزلوں سے گزر کر پھر سرحدوں کے پار کھڑی محسوس ہو رہی تھی۔

بیٹا میں چمن کو چھوڑنے آئی تھی۔ مشکور صاحب سو رہے تھے۔ میں نے تو انہیں بھی نہیں بتایا۔ فون کر کے ٹیکسی منگوائی تھی اب اسی میں واپس جاؤں گی۔

عطیہ بیگم کی بات سن کر ثمر کی توجہ میٹر و کیب کی طرف گئی ڈرائیور فرنٹ ڈور کے دروازے سے پشت لکائے عطیہ بیگم کی واپسی کا منتظر تھا۔

اپنی ماں کو میرا سلام کہنا۔ عطیہ بیگم نے چمن کی طرف دیکھ کر جانے کے لیے پرتولے..... اس طرح تو اچھا نہیں لگتا تھوڑی دیر بیٹھیے تو پلینز..... چمن امی سے کہو ناں ثمر نے چمن کو پوچھا مخاطب کیا جیسے دونوں چاند رات کی شاپنگ کر کے گھر پہنچے ہوں..... اور عید کی صبح کے خوش گوار احساسات سے گزر رہے ہوں۔ نہیں بیٹا اب تم دونوں اتوار کو گھر آنا..... میں انتظار کروں گی..... مشکور صاحب ویسے تو اب فجر میں ہی اٹھیں گے مگر درمیان میں بھی نیند ٹوٹ سکتی ہے میں نظر نہ آئی تو پریشان ہوں گے..... صبح پوچھیں گے تو کہہ دوں گی ثمر رات کو چمن کو لینے آیا تھا اس لیے چلی گئی۔ خدا حافظ بیٹا یہ کہہ کر انہوں نے چمن کے سر پر ہاتھ پھیرا۔ عورت کا کام صرف گھر سنبھالنا ہی نہیں مرد کو بھی سنبھالنا ہوتا ہے جاؤ اندر جا کر آرام کرو اللہ کی امان میں۔ ساس کی وضع داری اور متانت نے ثمر کے سارے نٹ پیچ ڈھیلے کر دیے۔ وہ اپنی جگہ کھڑا خاصا شرمندہ ہو رہا تھا۔ عطیہ بیگم Cab میں بیٹھیں..... چمن نے ہاتھ لہرا کر ماں کو خدا حافظ کیا۔ Cab روانہ ہوتے ہی اس نے گھر میں قدم رکھا۔ چمن اس سے چار قدم آگے گھی دھوپ چھاؤں جیسے رشتے نے چار قدم کا فرق سیکنڈ میں مٹا دیا۔

☆.....☆.....☆

ندا..... ارے ہمیں آ کر اٹھانا..... ارے میں مرا..... ندا شبیر حسین کے لیے فرمائشی دلیہ بنا رہی تھی۔ شبیر حسین کی چیخ پر چیخ اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر دور جا پڑا..... وہ گرتی پڑتی کمرے میں آئی۔ اور جو منظر آنکھوں نے دیکھا اس نے تو ہوش ہی اڑا دیے۔

شبیر حسین آدھے بیڈ پر وہ آدھے ز میں پر پڑے ہوئے تھے اور تیز تیز سانس لے رہے تھے۔ آپ کیسے گر گئے نانا جان.....؟ کیا داش روم جا رہے تھے.....؟ پہلے آواز کیوں نہیں دی.....؟ ندا روہانسی ہو کر کہہ رہی تھی اور ساتھ ہی انہیں اٹھا کر کھینچ کر بیڈ پر لٹانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر شبیر حسین اپنے حواسوں میں نہیں تھے اس کھینچا تانی میں اس کی طرف سے کسی قسم کا تعاون نہیں تھا۔ سارا بوجھ ندانے برداشت کرنا تھا..... جو خود دھان پان سی تھی۔

شبیر حسین کو بیڈ پر جیسے تیسے لٹانے میں کامیاب تو ہو گئی مگر اس کی اپنی حالت غیر ہو گئی۔ وہ شبیر حسین سے زیادہ ہانپ رہی تھی۔ شبیر حسین نیم بے ہوشی کی کیفیت میں آنکھیں بند کیے ہوئے تھے اور ندا تاریخی کرسی پر بیٹھی بڑی بے بسی اور ڈبڈبائی آنکھوں سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر اس نے بڑی بے دم سی آواز میں پکارا نانا جان..... آپ میری آواز سن رہے ہیں.....؟ پانی پلاؤں آپ کو یہ کہتی ہوئی وہ پھر کرسی سے اٹھ گئی۔

روشنیزہ 40

READING
Section

جواب میں گہری خاموشی تھی۔ سانسیں بھی مدہم تھیں۔ اب ندا کے درحقیقت جھکے چھوٹ گئے..... ابھی تک ان کے حکیم صاحب المعروف شاہی طبیب حکمت جن کے گھر کی لونڈی تھی تا حال تشریف نہیں لائے تھے۔ ڈاکٹروں سے بیر تھا اور صدیوں پیچھے ہی چلنا تھا تو کم از کم کوئی گھوڑا ہی تیار رکھتے تاکہ بروقت مریض تک تو پہنچ جاتے..... ڈاکٹر موٹر تو ماڈرن دنیا کے لوازمات ٹھہرے اور رہی ایسبولینس وہ تو سفر آخرت سے پہلے کا چھوٹا سا سفر کنسیڈر کیا جاتا تھا۔ اس کا تو نام لینا ہی قیامت تھا۔

رات کا عالم..... سیریس پیشنٹ..... اور ایک کم ہمت تنہا لڑکی ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

☆.....☆.....☆

بانو آ پا تو مسکن ادویات زیر اثر گہری نیند سوئی ہوئی تھیں۔ ان سے آنا سا مناسیح ہی ہونا تھا۔ اور پھر جو ہونا تھا وہ بہت صبر مشقت سے سہنا تھا۔

ابھی تو ایک معرکہ رات کو سر ہونا تھا۔ شدید جنگی حالات پھر مذاکرات پھر سمجھوتے، معاہدے، شرائط و ضوابط..... آئندہ جنگی صورت حال سے بچنے کی حکمت عملی، خدشات کی روک تھام..... اتنا بہت سا کام اور ایک رات وہ بھی جو آدھی گزر چکی ہو۔ چمن نے بیڈروم میں داخل ہو کر چادر اتار کر صوفے کی پشت پر ڈال دی تھی اس دوران ٹمر بیڈروم کا دروازہ Lock کر رہا تھا چمن صوفے پر بیٹھ گئی اس نے اپنے تیش طے کر لیا تھا کہ وہ بولنے میں پہل نہیں کرے گی۔ سو خاموشی سے سر جھکا کر بیٹھ گئی۔

ٹمر نے ایک اچھنی نگاہ چمن پر ڈالی اور چند قدم آگے بڑھا کر اس کے سامنے آکھڑا ہوا۔

Change کر کے آرام کرو..... آگئی ہو..... اچھا کیا..... میں گزری ہوئی کسی بات کو دہرانا نہیں چاہتا۔ گزری باتیں دہرانے سے کبھی کسی کو فائدہ نہیں ہوا۔ تلخیاں اپنی جگہ رہتی ہیں..... فاصلے بڑھتے جاتے ہیں اور یوں ساتھ رہنے کا کوئی فائدہ نہیں جیسے دو مویشی ایک استھان پر بندھے ہوں..... ایک چارے پر منہ مارتے ہوں اور ایک دوسرے سے منہ پھیر کر سو جاتے ہوں۔

ٹمر شاید مزید کچھ کہتا اس کے موبائیل پر Ring ہونے لگی تھی۔

دونوں Ring سن کر اپنی اپنی جگہ چونک پڑے۔ چمن کو فوراً ماں کا خیال آیا تھا۔ ٹمر بھی فکر مند ہو کر اپنا موبائیل اٹھا رہا تھا۔ چمن دھڑکتے دل سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔

اسکرین پر ندا کا نمبر Blink ہو رہا تھا۔ رات کے اس پہر وہ بے وقوف لڑکی اسے کیوں فون کر رہی تھی۔ دل چاہا کال ریسیو کیے بغیر فون آف کر دے اور صبح آفس پہنچ کر اسے بے بھاؤ کی سنائے مگر وہ ایسا کرنے سکا۔ دل کہہ رہا تھا کہ اتنی رات کو وہ بلا وجہ فون نہیں کر سکتی یہ الگ بات کہ ٹمر کے نزدیک وہ وجہ اہممانہ ہو اس نے محتاط انداز میں بہر حال کار یو کر لی۔

ہیلو.....؟

سر..... پلینز..... اس وقت آپ کی بہت سخت ضرورت ہے نانا جان بے ہوش ہو گئے ہیں۔ میں نے بہت مشکل سے انہیں کھینچ کر بیڈ پر لٹایا ہے میں تو ڈر کے مارے ان کی نبض بھی چیک نہیں کر رہی..... کہیں خدا نخواستہ وہ اللہ کو پیارے تو نہیں ہو گئے ٹمر کا ہیلو سن کر وہ روتے ہوئے ایک سانس میں بولتی چلی گئی۔ ٹمر کے تو یہ سن کر چھکے چھوٹ گئے تھے۔

گھر میں اور کون ہے..... میرا مطلب ہے آپ کے پاس کوئی ہے؟ ثمر نے پریشانی کی انتہا پر سوال کیا تھا۔ سردس مرتبہ بتا چکی ہوں گھر میں بس ہم دونوں ہوتے ہیں وہ بری طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ عورت کے آنسو بہت طاقتور ہتھیار ہوتے ہیں کیونکہ مرد کی آنکھوں میں آسانی سے آنسو نہیں آتے۔ جب عورت کو زار و قطار روتا ہوا دیکھتا ہے تو سمجھتا ہے کہ وہ دنیا کا مشکل ترین کام کر رہی ہے۔ شریف اور سادہ مزاج مرد کو آنسوؤں کی تاب نہیں لاپاتے۔ چمن بہت فکر و تشویش سے ثمر کی طرف دیکھ رہی تھی جو ہیلو کہنے کے بعد سے ابھی تک صرف سن رہا تھا یا پھر درمیان میں ایک مختصر سوال کر چکا تھا۔ جیسے زیر سماعت مقدمے میں جج وکیل کو سنتے ہوئے مختصراً کوئی ضمنی سوال کر جاتا ہے اور وکیل پھر سے شروع ہو جاتا ہے۔

سر پلیز..... آ جائیں..... ورنہ میں بھی بے ہوش ہو گئی تو پرائیلم ہو جائے گی..... نانا جان کے وہ منحوس حکیم صاحب بھی نہیں آئے ورنہ میں آپ کو فون ہی نہ کرتی۔ کسی منحوس حکیم کا بھی ذکر آ گیا تھا..... مگر یہ وقت نہیں تھا کہ نحوستوں اور برکتوں پر ضمنی سوال اٹھائے جاتے۔

میں آ رہا ہوں..... آپ خود کو سنبھالیے۔ بلاوے میں کہاں اثر تھا۔ ایک بے بس لڑکی کے آنسو ایٹم بن گئے تھے۔ اس نے فون بند کر کے چمن کی طرف دیکھا۔

میں ایک گھنٹے کے لیے باہر جا رہا ہوں..... ایک سیریس پیشدہ کو ہاسپٹل پہنچانا ہے۔ یہ کہہ کر اس نے آگے بڑھ کر والٹ اور کار کی چابی اٹھائی اور پھر ایک نظر چمن پر دوڑائی..... میرا انتظار مت کرنا..... سو جانا..... جلدی آنے کی کوشش کروں گا یہ کہہ کر ثمر زکا نہیں..... بڑی عجلت میں کمرے سے نکل گیا۔

یہ فون کال تو رحمت بن گئی تھی مشکل رات آسان ہو گئی تھی۔ اس نے دروازہ بند ہوتے ہی کھل کر سانس لیا جیسے ثمر نے اس کا آکسیجن سلینڈر بند کیا ہوا تھا۔

لڑکر میکے جانے والی عورت جب واپس اپنے گھر آتی ہے تو اپنا کمرہ اور بستر دیکھ کر بہت کچھ بھول جاتی ہے۔ اسے یوں لگتا ہے جیسے وہ ہزاروں راتوں کے رت جگے سے گزری ہے۔

فون کس کا تھا.....؟ پیشدہ کون ہے..... تھکے ہوئے اعصاب سوالات کا جواب لینے کے لیے عجلت میں نہیں تھے اب تو بس آنکھیں موند کر بیڈ پر گر جانے کو جی چاہتا تھا۔

اس نے شب خوابی کے لباس کی تلاش میں ڈریسنگ میں جھانکا وہ اسی طرح لٹکا ہوا تھا جس طرح وہ لٹکا کر گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ندا پتھر کا بت بنی شبیر حسین کو دیکھ رہی تھی۔ چاروں اور وحشت ناک سناٹا راج کر رہا تھا۔ چالیس سال پرانے چھت کے پتھے سے جو آوازیں پیدا ہو رہی تھیں وہی گھر اور قبر کا فرق مٹا رہی تھیں۔

معا شبیر حسین نے کراہنا شروع کیا..... ندا بری طرح چونک پڑی خوشی اور بے یقینی کی کیفیت آنکھوں میں ہو رہی تھی.....

نانا جان ہوش میں ہیں..... یا اللہ تیرا شکر ہے وہ کرسی سے اٹھ کر کے چہرے پر جھک گئی.....

نانا جان آپ میری آواز سن رہے ہیں.....؟ پانی پیئیں گے.....؟ ارے حکیم صاحب بہت دیر کر دی آپ نے..... ہماری نو اسی تو ہمیں انگریزی شفا خانے میں پھینکنے جا رہی تھی جملہ ادھورا رہ گیا بھر پور کھانسی سرکاری کارروائی کی طرح شروع ہو گئی۔

جس کا کوئی منطقی انجام نہیں ہوتا..... ندا جلدی سے دوڑ کر پانی لائی اور شبیر حسین کا سراونچا کر کے گلاس منہ سے لگا لیا۔

بمشکل دو گھونٹ پی کر انہوں نے ندا کا ہاتھ پرے کر دیا۔ ہم سمجھے حکیم صاحب آگئے۔

وہ نہیں آئیں گے ان کے وارنٹ نکلوانے پڑیں گے..... بیمار کو اس حال میں پہنچا دیا ہے..... اب کیا منہ لے کر آئیں گے اور ایک مرتبہ آجائیں..... پھر دیکھیے میں کیا کرتی ہوں..... ندا دانت کچکچا کر کہہ رہی تھی۔ اسی اثنا میں کال بیل کی آواز کسی چیخ پکار کی طرح ماحول میں اتری۔

حکیم صاحب آگئے..... شبیر حسین کی اکھڑی سانسیں بحال ہونے لگیں۔ ندا نے غصے کی شدت کو کنٹرول کرنے کی کوشش کرتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

کون..... گیٹ کے قریب پہنچ کر اس نے بڑے نردٹھے پن اور اکھڑ پن سے پوچھا تھا۔
شمر..... پس در نہایت مختصر جواب ملا۔

لحہ کی تاخیر کے بغیر ندانے گیٹ کا ذیلی دروازہ کھول دیا تھا۔ شمر اپنے معمول کے آفس والے حلیے کے برخلاف گرین ٹی شرٹ اور بلیک جینز میں اس کے سامنے تھا۔ اس لیے پہلی نظر میں وہ تو ندا کو کوئی اجنبی لگا..... گیٹ کے دونوں سروں پر لگے گول مرمری لیمپ کی روشنی بہت مدہم تھی..... رات کے اس پہر صورت ہیولہ لگتی تھی۔

السلام وعلیکم سر..... آئیے پلیز ابھی ابھی ہوش میں آئے ہیں اور اپنے چہیتے حکیم صاحب کو پکار رہے ہیں۔ اگر آپ آج انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کروا دیتے ہیں تو میں ساری زندگی آپ کا احسان نہیں بھولوں گی میں تو چاہتی ہوں میرے نانا کی عمر پورے دو سو سال ہو کیونکہ اگر وہ دنیا سے چلے گئے تو میرا کیا ہوگا۔

آپ راستہ دیں گی تو میں اندر آؤں گا۔ ندا قدرے شرمندہ ہو کر گھبرا کر ایک طرف ہو گئی۔ شمر گھر کے اندر داخل ہوا تو ندانے گیٹ بند کر دیا۔ جتنی دیر آپ گیٹ پر کھڑی ہو کر بولی ہیں اتنی دیر اگر کسی سیریس پیشڈ کو آکسیجن نہ ملے تو وہ اللہ کو پیارا ہو سکتا ہے۔

کہاں ہے آپ کے نانا.....؟

سامنے ہی ان کا کمرہ ہے..... آپ خود دیکھ لیجیے ان کی کیا حالت ہے..... اب تو میں Job بھی نہیں کر سکتی..... آپ بہت عظیم انسان ہیں سر..... اتنی رات کو.....

خاموش ہو جائیے..... اخبار آپ صبح بھی پڑھ سکتی ہیں شمر اس سے زیادہ اخلاقیات کا مظاہرہ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا تھا۔ ٹوک دیا ندا اب ڈرسی گئی اور چپ چاپ شمر کو لے کر شبیر حسین کے کمرے میں آگئی۔ شبیر حسین نے قدموں کی آہٹ پائی تو ایک دم پر جوش ہو گئے

حکیم صاحب دو اساتھ لائے ہیں ناں..... ارے آج تو ہم مر گئے بہت کمزوری ہو رہی ہے..... آپ نے

شام کو آنے کا جو بولا تھا۔ مطب میں رش بہت ہوگا.....

نانا جان..... نانا جان..... آپ کے حکیم صاحب کا انتقال ہو گیا انہوں نے غلط کشتہ کھالیا تھا۔ اسی لیے میں نے ایک نئے ماڈرن حکیم کو بلایا ہے۔

ندا بری طرح تپ کر گویا ہوئی تھی..... ثمر نے تو اپنی زندگی کا ایک تجربہ پایا تھا۔

اس کے سامنے اسی برس کا استخوانی ڈھانچہ شیشم کے قدیم جہازی سائز بیڈ پر یوں دھرا تھا گویا وسیع آسمان پر آخری تاریخوں کا آدھا کہن زدہ چاند۔

غیر جانبدار بندہ تو بزرگی و ناتوانی کی اس بھرپور تصویر کو دیکھ کر بے ساختہ طور پر یہی سوچ سکتا تھا کہ شاید فرشتے بھول گئے۔ ”ندا اپنی زبان کو لگام دو۔“ ہر وقت حکیم صاحب کی توہن کرنی ہو..... اب انہیں مرنے مارنے پر تل گئیں.....؟ شبیر حسین برہم ہوئے تو ندا کو بھی اندازہ ہوا کہ وہ مکمل ہوش میں ہیں..... السلام و علیکم..... ثمر کو احساس ہوا کہ اپنی موجودگی کا احساس خود ہی دلانا ہوگا۔

شبیر حسین ایک نامانوس آواز سن کر درحقیقت چونک پڑے کون.....؟ ان کا چوکنا ہونے اور کان کھڑے کرنے کا انداز دانہ چگتے مرنے جیسا تھا جو آہٹ پر کر ادھر ادھر دیکھتا ہے۔ نانا جان میرے پاس آئے ہیں..... سلام کر رہے ہیں..... شبیر حسین نے گردن موڑ کر اپنے دائیں جانب دیکھا ثمر بالکل قریب ہی کھڑا ہوا تھا۔

شبیر حسین کی آنکھیں پہلے سکڑیں اور پھر مقدور پھیلیں..... تشریف رکھیے..... اتنی رات کو کیسے زحمت کی.....؟

آپ کی خیریت پتا کرنے آئے ہیں..... آپ بے ہوش ہو گئے تھے..... میں نے فون کر کے بلایا ہے..... تاکہ آپ کو ہاسپٹل لے جائیں ندا نے بڑی صراحت کے ساتھ جواب گوش گزار کیا۔ تمہارا دماغ خراب ہے..... رات کو لوگوں کو پریشان کرتی ہو؟ شبیر حسین برسنے کی کوشش کی مگر کھانسی ان کے عزائم کے آڑے آگئی۔ سلسلہ کلام جاری نہ رہ سکا۔

ندا اور ثمر بڑی بے بسی کی کیفیت میں کھانسی رکنے کا انتظار کرنے لگے جو تھمنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ ہاسپٹل لے کر جانا ہے.....؟ ثمر نے آہستہ سے ندا سے پوچھا..... ہاسپٹل کا نام سن کر شبیر حسین تڑپ گئے مگر کھانسی کی وجہ سے کچھ کہنے کا یارا نہ تھا۔ اپنی کھانسی سے خود ہی عاجز آ گئے اور ہاتھ پاؤں پٹخنے لگے..... ثمر تو یہ کیفیت دیکھ کر بری طرح گھبرا گیا۔

درحقیقت اسے ندا پر بہت ترس آیا..... ایک لڑکی اس نازک صورت حال کا مقابلہ کب تک کر سکتی تھی اگر اس نے گھبرا کر ثمر کو فون کر دیا تو وہ حق بجانب تھی۔ گھر میں اترتی ہوئی خاموشی اور کھانسی خراش آواز حالات کی نزاکت اور ندا کی بے بسی کی ترجمان تھی..... انسانیت کے ناتے دل میں فوری کوئی عملی قدم کرنے کی تڑپ پیدا ہوئی آپ کے علاوہ ان کے پاس کوئی نہیں ہوتا.....؟ ثمر نے بڑی ہمدردی سے ندا کی طرف دیکھا تھا۔

شام چھ بجے تک میڈ ہوئی ہے..... پڑوس میں ایک آنٹی ہوتی ہیں وہ بھی ہمارا بہت خیال رکھتی ہیں آج کل وہ حیدر آباد شادی میں گئی ہوئی ہیں کوئی بات ہو تو میں ان کو بلا لیتی ہوں۔

اوہ..... ثمر کو شدید تاسف ہوا..... اسے احساس ہوا کہ ندا جو ہر وقت حواس باختہ اور پریشان نظر آتی ہے تو

اپنی جگہ درست ہے۔ دیکھا جائے تو بڑی ہمت سے حالات کی جنگ لڑ رہی ہے اسے اپنی اس ڈانٹ پھٹکار پر ندامت محسوس ہوئی جو وہ اکثر کرتا رہتا تھا۔ یہ بھی سمجھ آ گئی کہ ندا کی آنکھیں ہر وقت چھلکنے کو کیوں بے تاب رہتی ہیں؟

آپ کا بہت بہت شکریہ..... آپ نے بہت تکلیف کی..... نا سمجھ بچی ہے..... درگزر فرمائیں..... ہم تو جی سنبھلتے ہی شکرانہ پڑھیں گے کہ ہمیں ہوش آ گیا ورنہ یہ تو ہمیں اسپتال میں پھینک دیتی اور اسپتال والے مردہ خانے پہنچا دیتے۔

بعد مرگ برف کی سلوں پر بڑے رنے سے تو اچھا ہے کہ گھر سے نکلیں اور قبر میں اتر جائیں۔ کھانسی کا زور ٹوٹے ہی شبیر حسین نے شمر کا شکر یہ ادا کیا اور اپنے قیمتی خیالات سے بھی فیض یاب کیا..... ان کی بات سے شمر کو ندا کی مشکلات کا ٹھیک ٹھیک اندازہ ہو گیا..... آئی ایم سوری سر..... میں نے آپ کو بہت پریشان کیا..... شارق آفس میں مجھے بہت ہیلپ کرتا ہے میں نے پہلے اسی کو فون کیا تھا مگر شاید وہ آف کر کے سوتا ہے اگر اس سے بات ہو جاتی تو میں کبھی اتنی رات میں آپ کو ڈسٹرب نہ کرتی۔

-Its ok

No problem ساتھ کام کرنے والے ایک دوسرے سے Help مانگ لیتے ہیں..... مجھے بتائیے اب کیا کرنا ہے.....؟ شمر نے آہستہ سے پوچھا۔

نانا جان تو ہوش میں آنے کے بعد کسی بھی طرح ہاسپٹل نہیں جائیں گے..... بالکل نہیں جائیں گے..... اسپتال تو مرنے کے لیے جاتے ہیں آخر میں اپنے گھر میں کیوں نہ جان ویں؟ شبیر حسین کی سماعتیں چوکس تھیں..... وہ دونوں کی باتیں بہت توجہ سے سن رہے تھے اسی لیے درمیان میں ہی پھٹ پڑے۔

بہر حال..... میرا ہر طرح کا تعاون آپ کے ساتھ ہے Any Time آپ مجھے فون کر سکتی ہیں اور دل لگا کر نانا جان کی خدمت کیجیے۔ چھٹی کے لیے ایک Mail جزیٹ کر دیجیے گا۔ ہم سے زیادہ آپ کے نانا جان کو آپ کی ضرورت ہے۔ یہ کہہ کر شمر کھڑا ہو گیا اور ایک نگاہ شبیر حسین پر دوڑائی۔ جو آنکھیں بند کیے گہری سانسیں لے رہے تھے ہونٹ اور تھننے ایک ساتھ پھڑک رہے تھے شاید اب مزید گویائی کی تاب نہ تھی۔ ورنہ کچھ نہ کچھ ضرور بولتے۔

حکیم صاحب نے جو دوا دی ہے آپ وہی دیجیے بہر حال حکمت اپنی جگہ ایک حقیقت ہے بہت سے لوگ ہر بل دوا سے ہی ٹھیک ہوتے ہیں۔ دوا انسان تیار کرتے ہیں شفا اللہ دیتا ہے۔

جی..... اندانے سر ہلایا۔

شمر نے اطراف میں نظر دوڑائی..... پرانی وضع کا بنا ہوا گھر فرش کا ماربل جو سیاہ اور سفید دانوں کی صورت میں بچھایا گیا تھا کئی جگہ سے اکھڑ رہا تھا۔

فرنیچر کے نام پر جو چیز نظر آتی تھی۔ اپنی تاریخی حیثیت کا اعلان کرتی نظر آتی تھی۔ فرنیچر پر انا ضرور تھا مگر مضبوط اور قیمتی تھا۔ جس سے یہ تو پتا چلتا تھا کہ ماضی کے مکینوں کا شمار خوش حال لوگوں

میں ہوتا تھا۔

وقت ایک سا کسی کا نہیں رہتا۔ بادشاہ خزانوں کے مالک ہو کر کبھی رنگوں میں قید ہو جاتے ہیں۔
کبھی قید خانوں کے روزن سے اپنے خوابوں کی تعبیر تاج محل کی صورت تعمیر ہوتی دیکھتے ہیں۔

☆.....☆.....☆

خاموشی اور سکون دونوں میسر تھے آرام وہ بستر بھی نصیب تھا۔ مگر نیند کا نام و نشان تک نہ تھا۔ کبھی صبح کا تصور پریشان کرتا کہ ساس سے مڈ بھینٹ ہونا پاتی تھی۔ کبھی شمر کا انتظار جان لیوا ہونے لگتا۔ کسی نازک صورت حال کی وجہ سے ہی وہ گھر سے باہر تھا اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ بہر حال ہر بات پر عمل کبھی پہلی بار ہی ہوا کرتا ہے۔ پہلی بار اتفاق ہوتا ہے دوسری بار تجربہ بار بار ایک ہی تجربہ ہوتا وہی عمل اپنے سابقہ نتیجے کی وجہ سے سائنس بن جاتا ہے کیونکہ سائنس بار بار ایک عمل دہرانے پر ہی ایک ہی نتیجہ حاصل کرنے کو کہتے ہیں۔

آج کا اتفاق محض اتفاق ہی تھا کیوں کہ چمن کو سو فیصد یقین تھا کہ اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا اور نہ آئندہ ہوگا.....
حالات دل پسند ہوتے ہیں تو شمر اسے تمام تفصیلات سے آگاہ کرنے کے بعد ہی گھر سے باہر قدم نکالتا۔
مگر..... روٹھے ہوؤں کے درمیان گہری خاموشی ہی تو صلح کی بنیاد بنتی ہے۔

طلبل جنگ بجتا ہے.....

گھمسان کارن پڑتا ہے.....

کانٹے کا مقابلہ ہوتا ہے.....

کبھی تلوار ٹوٹی ہے.....

کبھی ڈھال گرتی ہے.....

کبھی عزم ابھرتا ہے.....

کبھی مورال گرتا ہے.....

آخر کار جنگ بندی ہو جاتی ہے.....

دل کا غبار چھٹ جاتا ہے.....

جلے ہوئے خیموں کی راکھ اڑتی ہے.....

جنگی جنون تاسف اور پشمانی پر انجام پزیر ہوتا ہے پھر جن کو ہتھیار اٹھانا آسان لگا تھا انہیں زبان ہلانا مشکل لگا۔
شمر آیا سے سوتا سمجھ کر جلے پاؤں کی گلی بن کر بہت محتاط انداز میں اپنا نائٹ سوٹ پہن کر بیڈ کے کنارے پر یوں دراز ہو گیا کہ غلطی سے بھی ہاتھ چمن کو نہ چھو جائے..... جو آنکھیں بند کیے سوچ رہی تھی۔
خوشگوار گھڑیوں میں بندھنے والا بندھن ایک عذاب ایک سزا لگ رہا تھا.....

چل کر تو آگئی ہے.....

اب کیا پاؤں چھو کر اپنے ناکردہ گناہ کی معافی بھی مانگے..... پندار کو زخم کے بجائے گہرا گھاؤ لگے تو وہ مندمل نہیں ہوتا ناسور بن جاتا ہے.....

اور جب پندار ناسور کی مشقت میں پڑ جائے تو محبت اپنے نادیدہ آبائی وطن رخصت ہو جاتی ہے.....

زندگی صرف سمجھوتہ بن جاتی ہے.....

اور سمجھوتے کی ریت بار بار ہاتھوں سے پھسلتی ہے۔
 بچھڑتے وقت دلوں کو اگرچہ دکھ تو ہوا
 کھلی فضا میں سانس لینا مگر اچھا لگا
 یاداشت کے روزن سے ایک بھولا بھٹکا شعر جھانکا تو وہ تجربے کا ایک نیازینہ عبور کرتے کرتے چونک
 پڑی۔

بے حد..... بے پناہ..... بے انتہا..... چاہت کے بعد ایک نیا موڑ..... جب جدائی نعمت لگتی ہے.....
 جب کھل کر سانس لینا اچھا لگتا ہے.....
 کمال ہی ہے..... یہ تجربہ بھی محبتوں کے باب ہی میں ہے دو قطرے آنکھوں سے ٹپکے..... تکیے میں جذب
 ہو گئے اچھا ہوا سو گئی.....

ایسی بھلائی تو پیوی کے سامنے اعتراف گناہ ہی لگتی ہے۔
 شمر سکون کا سانس لے کر سوچ رہا تھا۔
 بانو آ پانچ سویرے اپنے معمول کی تسبیح کے ورد میں لگی ہوئی تھیں۔ چہرے پر تفکرات کا جال بچھا ہوا تھا.....
 تسبیح کے زور پر شمر کتنا قابو میں آسکتا تھا جبکہ تعویذ گھول کر پلانے کے عمل بھی ساتھ ساتھ چل رہا ہو۔ اسی ادھیڑ پن
 میں انہیں پتا ہی نہ چلا کہ شمر اپنے شب خوابی کے ملبوس میں اس کے قریب چلا آیا۔

السلام علیکم امی..... شمر کا سلام گویا ایک دھماکہ تھا بری طرح چونک پڑیں۔
 یہ نور کے تڑکے ماں کو سلام کرنے چلا آیا..... یا اللہ خیر بانو آپا کا ماتھا ٹھکنے لگا۔
 اشارے سے سلام کا جواب دے کر اشارے ہی سے بیٹھنے کے لیے کہا کیونکہ ابھی تسبیح کے چند دانے باقی
 تھے۔ شمر ماں کا اشارہ پاتے ان کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔

بانو آپا نے تسبیح مکمل کی اور شمر کے چہرے پر پھونک ماری۔ پھونک میں اتنا زور تھا کہ گویا گیلی بکڑیاں سلگا
 رہی ہوں اور انتہائی قریب ہونے کی وجہ سے شمر کو پھونک آنڈھی کے پہلے جھکڑ کی طرح لگی تھی۔
 خیریت ہے بیٹا! آج منہ اندھیرے اٹھ گئے۔ دشمنوں کی طبیعت تو خراب نہیں.....؟ انہوں نے لاڈلار کا
 آغاز کیا ایسے وقت کو تو وہ ترستی تھیں کہ شمر خود اپنے ارادے سے ان کے پاس آ کر بیٹھے۔

ہم سے دشمنی کر کے کسی کو کیا ملے گا امی..... ہمیں دوستیاں نبھانے کی فرصت نہیں، شمر نے دھیرے سے ہنس
 کر جواب دیا، پھر بھی بیٹا آج بڑی جلدی بستر چھوڑ دیا.....؟
 آہ..... ہا..... ساتھ ہی انہوں نے ایک آہ سرد سینے سے آزاد کی عورت ذات ہے ہی ناشکری۔ مرد خون
 پسینہ ایک کر کے گھر کا سکھ دیتا ہے مگر.....

امی..... چمن رات کو واپس آ گئی ہے..... آپ سو رہی تھیں اس لیے آپ کو جگانا مناسب نہیں لگا.....
 شمر نے بانو آپا کو مزید بولنے سے روک دیا۔ اور وہ بات کی جس کی خاطر وہ صبح دم اپنا کمرہ چھوڑ کر ماں کے
 پاس آیا تھا۔

اور یہ اقدام حفظ ماتقدم کے طور پر تھا..... اسے اندازہ تھا کہ چمن کو سامنے پا کر بہت گڑبڑ ہو سکتی ہے اس نے
 تو ماں کی ہر بات پر آج تک آنکھیں بند کر کے یقین کیا تھا۔ اس بات پر بھی کہ شدید Stress کی وجہ سے ان

کے بازو میں درد ہونے لگتا ہے جو ہارٹ اٹیک کی ابتدائی علامت سمجھی جاتی ہے۔

بانو آ پا کو یوں لگا جیسا ابھی صبح نہیں ہوئی وہ سو رہی ہیں اور کوئی بہت بھیا تک خواب دیکھ رہی ہیں۔ ان کی قوت گویائی وقتی طور پر سلب ہو گئی تھی..... بس ٹکر ٹکر کر شمر کی صورت لگا کی۔ بس اب جو ہونا تھا ہو گیا..... وہ بھی سب کچھ بھلا کر آ گئی ہے آپ بھی سب کچھ بھلا دیجیے۔ امن اسی طرح سے ہوتا ہے۔ اور زندگی میں سکون اور امن سے قیمتی کوئی شے نہیں ہے اور نہ اب آپ کی عمر ایسی ہے کہ ہر وقت Stress برداشت کریں شمر ماں کی دل جوئی کرتے ہوئے انہیں ذہنی طور پر تیار کر رہا تھا۔ تم لینے گئے تھے.....؟ بانو آ پا کی آواز کنویں سے ابھری اور وادی کی بازگشت بن کر پھیل گئی۔

عطیہ آنٹی کے ساتھ آئی تھی..... اچھی بات ہے..... گھر برسوں میں بنتے ہیں پل میں ٹوٹ جاتے ہیں۔ شمر نے پھر بہت حلم اور اپنائیت کے ساتھ ماں کا ذہن تیار کیا۔

ارے..... ان لوگوں نے تو بالکل ہی ناک کٹا کر کچرا کنڈی میں پھینک دی۔ خاندانی لوگوں کی ایک آن بان ہوتی ہے۔ کوئی بات ہوتی ہے۔

پرانے وقتوں میں تو زبان سے بیٹی بیاتے تھے کاغذ پر قول قرار نہیں لکھے جاتے تھے۔ اس خاندان نے تو حیا شرم بچ کر کھالی ہے۔

کنواری کھائے روٹیاں..... بیاہی کھائے چوتیاں۔ دو دن بیٹی کو روٹی نہ کھلا سکے۔ اماں انگلی پکڑ کر پھر ہماری دہلیز پر بیٹھ گئیں۔ ارے تم نے گھر کے اندر آنے کی اجازت ہی کیوں دی..... گالیاں دے کر گئی تھی تمہیں..... بانو آ پا کو شمر کی کمزور یادداشت پر غصہ نہیں طیش آیا تھا وہ شمر کو کئی دن پہلے کی پوزیشن پرواپس پہنچانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے لگیں..... جس گالی پر ان کے نوالے کڑوے ہو کر حلق سے نیچے اتر رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے وہ گالی ہی بھلا دی۔

اسے کہو ابھی..... اسی وقت اپنی ماں کے گھر چلی جائے۔

بانو آ پانے ٹھان لیا کہ ابھی کچھ کر سکیں تو بچت ہے ورنہ پھر ان کی ساری بھاگ دوڑ اور شاہ جی کے چلے ضائع ہو جائیں گے اس لیے حتمی، قطعی اور فیصلہ کن انداز تھا۔

شمر نے نرمی سے ماں کا ہاتھ تھام لیا۔

غلطی کسی سے بھی ہو سکتی ہے..... اگر کسی کو اپنی غلطی کا احساس ہو جائے تو اللہ بھی معاف کر دیتا ہے حالانکہ وہ بدلہ لینے کی زبردست قدرت رکھتا ہے۔

بیٹا اللہ کو درمیان میں لے آیا تو بانو آ پانے ہاتھ میں پکڑی تسبیح آہستگی سے سائیڈ ٹیبل پر رکھ دی..... مبادا وہ چمن کے حق میں وعدے وعید یا حلف برداری تک نہ آ پہنچے۔

تم بھول جاؤ..... میں تو نہیں بھول سکتی۔

کیکر پر انگوڑی کی بیل چڑھاؤ گے تو بہت پچھتاؤ گے۔ بانو آ پا صدے اور ناکامی کے احساس سے اندر ہی اندر بری طرح کلک رہی تھیں۔

میری خاطر امی..... سالوں کا ساتھ ہے..... مجھے عادت ہو گئی ہے اس کی۔ آپ دوسری شادی کی بات کرتی ہیں۔ میں تو تصور بھی نہیں کر سکتا.....

ایک بالکل نئی عورت کے ساتھ نئے سرے سے زندگی شروع کرنا کوئی مذاق ہے امی.....؟ یہ کہہ کر شمر کھڑا ہو گیا گویا اپنی طرف سے بات مکمل کہہ دینے کا اظہار کر دیا۔

صدے سے بانو آ پا کی آواز ہی گھٹ گئی۔ اتنی عبرت ناک شکست ایک ناقابل برداشت احساس..... کتنے طمطراق سے اسے گھر سے نکالا تھا۔ بیٹے نے معاف کر کے پھر سر پہ بٹھالیا تھا۔ شمر نے جانے کے لیے قدم بڑھائے تو بانو آ پا کی آواز نے قدموں کو زنجیر کیا۔

تم ذلت پر سمجھوتے کرو..... مگر ماں کو مجبور نہیں کر سکتے اسے کہہ دینا مجھ سے کلام نہ کرے..... اور نہ میرے کھانے پینے کی فکر کرے۔

شمر نے سنا اور خود کو باور کرانے لگا کہ یہ وقتی کیفیت ہے وقت کے ساتھ ساتھ اور چمن کے صبر و برداشت سے حالات بہت جلد معمول پر آ جائیں گے آگے بڑھتا چلا گیا۔ بانو آ پا کا جی چاہا کہ اڑ کر افشاں کے پاس پہنچیں اور اس اندوہناک حادثے کی اطلاع بہم پہنچائیں۔

بے بسی کی کیفیت میں پہلے سینے پر زور سے ہاتھ مارا پھر دو ہتھراپے سر پر مارے۔

☆.....☆.....☆

چمن واش روم سے باہر آئی تو دیکھا شمر بڑی بے قراری سے ٹہل رہا ہے چمن پر نظر پڑتے ہی یوں رکا جیسے شدت سے اسی کے باہر آنے کا انتظار کر رہا تھا۔

نگاہیں ملیں..... جیسے ٹرین میں نشست سنبھال کر مسافر ایک دوسرے کو جانچتے اور آتکتے ہیں کہ ہمسفر کس ڈھب کا ہے سفر کیسا گزرے گا..... ایسی نگاہ جس میں ماضی نہیں ہوتا صرف حال ہوتا ہے۔

امی کو سمجھا دیا ہے تم ان سے کوئی بات نہیں کرنا سلام کرتی رہو..... کسی دن جواب دے ہی دیں گی۔

بانو آ پا شمر کی ماں تھیں ساس نہیں..... ہر شریف بیٹے کی ماں گنگا میں اشان کر کے گھر سنبھالتی ہے۔

چمن جواب میں خاموش رہی..... شمر وارڈ روپ سے اپنے کپڑے نکالنے لگا..... چمن نے شمر کی طرف دیکھ کر چند ثانیے سوچا..... آپ کا ناشتا بناؤں.....؟ اسے اپنی آواز ساتویں آسمان سے آتی ہوئی محسوس ہوئی۔

جب سے شادی ہوئی ہے میرا ناشتا تم ہی بنا رہی ہو..... شمر کے الفاظ میں بلا کی احتیاط تھی کہ غلطی سے بھی لہجہ تیکھا اور الفاظ تیزی نہ ہو جائیں۔

وہ پورے خلوص اور سچائیوں کے ساتھ اس کے ہمراہ تھا..... اسے احساس تھا کہ اپنی انا کی قربانی کسی کو فتح کا احساس دینا..... ایک بہت ہی کھٹن عمل ہوتا ہے۔

جو پہلے سے کھڑی زیر بانا شتے کا پوچھ رہی تھی اسے کچھ طنزیہ کہنا تو کفر کے زمرے میں ہی آ سکتا ہے۔

نرم لہجہ..... بظاہر قدرے اجنبی..... چمن کے نیم مردہ سے وجود میں نئی روح پھونک گیا۔ سر جھکا کر کمرے سے باہر نکل گئی۔ صبح صبح ماں کو سمجھانے گیا تھا۔

پاؤں دھرنے کے لیے زمین بچھادی تھی۔ ایک مضبوط بندھن کے احساس کو تقویت دینے کے لیے یہ عمل جہاد سے کم تو نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

فردوس ایک بہت خوبصورت کپڑے کے بیگ میں بچے کے کپڑے اور ضروری لوازمات رکھ رہی تھی۔ بیگ

پر بٹھا تھا۔ بڑے بڑے سرخ شوخ گلاب عجب بہار دے رہے تھے۔

ارے واہ پوتے کے لیے بیگ بھی زبردست لیا ہے۔ کہاں سے لیا ہے بھئی..... بہت خوبصورت ہے حامد حسین کش لگاتے بیڈروم میں داخل ہوئے تو فردوس کو تیاری میں مصروف پایا۔

میری ایک سہیلی دوہئی سے لائی تھی۔ آج نہیں دس سال پہلے میں نے اس وقت نیت کی تھی کہ جب ہاسپٹل اپنا پوتا لینے جاؤں گی تو اس کی ساری چیزیں اس میں رکھ کر لے جاؤں گی۔

بیگ نیا..... کپڑے نئے..... سب کچھ نیا.....

ہاں بھئی..... جس دن بیٹا پیدا ہوتا ہے ماں اسی دن سے بہو کے سپنوں میں کھو جاتی ہے اور جس دن بہو گھر میں آتی ہے اس دن سے پوتے کا انتظار شروع کر دیتی ہے..... حامد حسین بھی آج دل کھول کر خوش ہو رہے تھے۔ اُمیدوں بھری گھڑیاں بہت قریب آ پہنچی تھیں۔

”صرف“ ارے بارہ سوٹ اور وہ بھی صرف بارہ.....؟ اتنے ڈھیر کپڑے تیار کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ شیرخوار کا قد تو ہر ہفتے بڑھتا ہے۔ ایک مہینے میں سب چھوٹے پڑ جائیں گے۔

حامد حسین نے تڑپ کر بیگم کی شاہ خرچی پر واویلہ کیا۔

ارے کیا جن کا بچہ پیدا ہو رہا ہے جو ہر ہفتے بڑھے گا؟ فردوس نے بھویں تانیں.....

شوہر کا آ بجیکشن می لارڈ تو چلتا تھا مگر یہ ہر روز تنقید جن میں سوائے کنجوسی کی بُو کے اور کچھ نہ تھا اس عظیم خوشی کے موقع پر برداشت نہیں کی جاسکتی تھی۔

اتنے بچے کے ایک دن میں چار مرتبہ کپڑے بدلے جاتے ہیں فردوس نے حامد حسین کی معلومات میں گراں قدر اضافہ کیا اس گرائی کے دور میں کون اپنے شیرخوار بچے کو چار جوڑے نئے پہنائے گا.....؟

ہم پہنائیں گے..... اب خاموش ہو جائیں..... نیک گھڑی آ پہنچی..... منہ سے اچھی اچھی باتیں نکالیں.....

فردوس نے پوتے کی دادی بننے کے زعم میں حامد حسین کو اچھی خاصی جھاڑ پلا دی..... جو انہوں نے پی بھی لی۔

گویا فردوس کسی فاؤنڈری سے آرڈر کا پوتا لاکران کی سات پشتوں پر احسان کر رہی ہوں۔

☆.....☆.....☆

چمن شمر کے سامنے ناشتا رکھ رہی تھی کہ اس نے اپنے سیل فون کی آواز ڈانٹنگ میں سنی۔

تمہارے سیل پر Ring ہو رہی ہے۔ شمر کو گمان ہوا شاید چمن نے Ring کی آواز نہیں سنی۔ جبکہ چمن Ring سن کر سوچ رہی تھی کہ شمر کو ناشتا کرا کر دیکھ لے گی..... پتا نہیں کس کا فون ہو اور صبح کوئی لمبی بات کرنا پڑ جائے..... شمر ویسے بھی آج لیٹ جا رہا تھا۔

سن لو..... ہو سکتا ہے عطیہ آنٹی کا فون ہو..... شمر نے خود ہی اس کی مشکل آسان کر دی۔

اس نے قد بڑھایا تو Ring کی آواز بند ہو گئی..... وہ یہ سوچ کر آگے بڑھی کہ یہی دیکھ لے کہ کس کی کال آ رہی تھی۔

Ring دوبارہ ہونے لگی اب چمن تیز قدموں سے بیڈروم میں داخل ہوئی اور ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا سیل فون

عجلت کے انداز میں اٹھالیا۔

یاور بھائی..... صبح صبح یاور بھائی کا فون۔ اللہ رحم کرے اس کا ذہن فوراً ایمن کی طرف گیا۔

دوشنبہ 50

READING
Section

ہیلو..... اس نے دل سنبھال کر منہ سے آواز نکالی جس میں فطری طور پر ہلکا سا ارتعاش در آیا.....
 السلام علیکم..... کون چمن.....؟ یاور کی آواز کان سے نکرائی۔ جی یاور بھائی چمن بات کر رہی ہوں۔
 چمن ایسا ہے کہ ایمن کو ایمر جنسی میں لے جانا پڑا۔ خون کی بہت کمی ہے ڈاکٹر ز کہہ رہے ہیں آپریشن سے
 پہلے کم از کم تین بوتل Blood لگے گا..... یاور بول رہا تھا بیک گراؤنڈ میں بے ہنگم سا شور بھی سنائی دے رہا تھا۔
 آپریشن.....؟ پہلی دو ڈیلیوری تو نارمل تھیں یاور بھائی اس مرتبہ سیزر کا کہا ہے۔ چمن کے تو ہاتھ پاؤں
 ٹھنڈے پڑنے لگے۔

ہاں..... میں نے اس لیے فون کیا تھا کہ میں ایمن کو لے کر ہسپتال آ گیا ہوں۔ گھر پر بچیاں اکیلی ہیں امی
 بھی ہسپتال آ گئی ہیں۔ بچیوں کو اپنے ساتھ گھر لے آ دیا وہیں ان کے پاس رُک جاؤ۔ بس یہی کہنے کے لیے فون
 کیا تھا یاور نے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر دیا۔ اور کسی Statue کی طرح ساکت کھڑی رہ گئی۔ جیسے ذہن نے
 کام کرنا ہی بند کر دیا ہو۔ چمن.....! شمر کی آواز نے اس کے پتھریلے وجود میں فوراً تحریک پیدا کی۔
 جی..... آ رہی ہوں وہ فون کر رکھو واپس ڈانگ میں آئی۔ کس کا فون تھا.....؟ شمر چمن کے چہرے کی طرف
 بغور دیکھ رہا تھا جس پر تفکر و پریشانی جلی حروف میں لکھی ہوئی تھی۔
 یاور بھائی کا آپا کو ہسپتال لے گئے گیس..... بتا رہے تھے کہ ان کو تین بوتل Blood لگے گا۔ بچیاں گھر پر
 اکیلی ہیں..... مجھے ان کے پاس جانا ہوگا۔

اوہ..... شمر بھی سن کر متفکر ہو گیا۔ ہاتھ میں پکڑا چائے کا کپ رکھ کر ریٹ وائچ پر ٹائم دیکھا.....
 تیار ہو جاؤ میں تمہیں ایمن کے گھر ڈراپ کر دوں گا۔
 بچیاں بہت چھوٹی ہیں ان کا گھر میں اکیلے رہنا ٹھیک نہیں۔ فطری ہمدردی اور انسانیت کے مظاہرے نے
 پھر ایک معجزہ کر دکھایا وہ فاصلے جو صدیوں پر محیط لگ رہے تھے۔ نقش براب ثابت ہوئے۔ کیا نرالہ رشتہ ہے میاں
 بیوی کا..... پانچ ہزار کلومیٹر نی گھنٹہ کی رفتار سے آنے والا سمندری طوفان کبھی کبھی سیکنڈ میں رُخ بدل لیتا ہے اور
 بڑی بچت ہو جاتی ہے اور پھر انسان سکون سے غور و فکر کرتا ہے کہ نیلو فر ہوتی ہے یا ہوتا۔؟

☆.....☆.....☆

عطیہ بیگم، فردوس، حامد حسین، یاور، شہر کے مشہور میڈیکل سینٹر کے وسیع و عریض لاؤنج میں بیٹھے ہوئے تھے۔
 عطیہ بیگم بڑی سی چادر میں لپٹی سر جھکائے تسبیح پر کوئی ورد کر رہی تھیں حامد حسن یوں ادب سے سینے پر بازو لپیٹے
 بیٹھے تھے کہ جسے ہی خوش خبری کانوں میں پڑے گی وہیں کھڑے ہو کر شکرانے کے نفل کی نیت باندھ لیں گے۔
 فردوس مریض اور تیمار خواتین کے کپڑوں کے ڈیزائن اور پرنٹ اور کوالٹی پر غور و فکر کر رہی تھیں۔ دو بوتل
 Blood لگ چکا تھا تیسری بوتل اشارت ہو چکی تھی۔
 جب تمنا میں تڑپتی ہیں تو وقت رک جاتا ہے۔

☆.....☆.....☆

خالہ..... ماما اور بابا کب آئیں گے.....؟ مہوش منہ بسور رہی تھی۔ بیٹا..... اللہ سے دعا کرو ماما آپ کے لیے
 بہت پیارا سا بھائی لے کر آئیں خالہ..... ماما بھائی لینے گئی ہیں؟ ماہ پارہ نے خوشی اور حیرت سے آنکھیں پھیلائیں۔
 خالہ..... ماما کو بولیں ہمیں بہت چھوٹا بھائی نہیں چاہیے..... اگر وہ چھوٹا ہوگا تو ہمارے ساتھ کیسے کھیلے

گا.....؟ ماہوش نے فرمائش نوٹ کرائی ساتھ ہی وجہ بھی بتادی۔ چمن بے ساختہ انداز میں مسکرا پڑی بچیوں کی معصومانہ باتوں نے ذہن کی ساری تھکاوٹ دور کر دی تھی۔ شمر اُسے ڈراپ کر کے باہر سے باہر چلا گیا تھا۔ راستے میں کوئی بھی خاص بات نہیں ہوئی مگر چمن کے لیے یہی بہت تھا کہ اس نے موقع کی نزاکت پر بھرپور اپنائیت کا احساس دیا تھا۔ اسی وجہ سے وہ خود کو بہت ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔

اللہ آپ کو ایک بیٹا دے دے تاکہ ان کی جان چھوٹ جائے۔ اللہ رحم کر دے میری بہن پر..... دل کی دعا ہونٹوں پر لرزاں ہوئی تو ناشتا کرتی ایمین کی بڑی بیٹی ماہ نور نے چونک کر چمن کی طرف دیکھا۔

خالہ..... آپ اللہ میاں سے کیا کہہ رہی ہیں؟
کچھ نہیں بیٹا..... اللہ میاں سے آپ کے لیے بھائی مانگ رہی ہوں..... چمن نے مسکرا کر مہوش کو سلاؤس کا ایک ہانٹ کھلایا.....

خالہ آپ بھی ایک بھائی لے آئیں..... ایک میں لے لوں گی ایک مہوش، ماہ پارہ نے پھر ایک معمولی سا مہ فرمائش کی۔

چمن کے دل کو کچھ ہوا۔ ہلکی سی نمی آنکھوں میں اترنے لگی۔

دعا کرو بیٹا..... اللہ خالہ کو بھی نواز دے.....؟ وہ منہ ہی منہ میں بد بدائی جو دونوں بہنیں سن نہ سکیں ورنہ کوئی نیا سوال اور ہوتا۔

Downloaded From Paksociety.com

☆.....☆.....☆

ایمین آپریشن تھیٹر میں تھی اس کی زندگی سخت خطرے میں تھی۔ اس لیے ایمر جنسی آپریشن کی تیاریاں ہو چکی تھیں۔ خوشیوں بھرا انتظار اب عظیم مشقت میں تحلیل ہو چکا تھا..... OT کے بند دروازے سے آنکھیں ٹکرائیں اور پتھر کی ہو رہی تھیں۔ عطیہ بیگم کے دونوں ہاتھ پھیلے ہوئے تھے ایک ماں اولاد کی زندگی کی بھیک مانگ رہی تھی۔ جبکہ فرروس اور حامد حسین بڑی بے قراری سے ٹہل رہے تھے۔

جانگل انتظار کی گھڑیاں ختم ہوئیں بالآخر..... ایک بڑی ایکٹیو اسمارٹ سی نرس نے آکر فرروس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔

آپ سب کو بہت بہت مبارک ہو..... اللہ کی رحمت آئی ہے ماشاء اللہ بہت پیار بچی ہے۔

بچی.....!!؟ بارودی سرنگ میں زبردست دھماکہ ہوا۔

عطیہ بیگم کو یوں لگا جیسے ان کا سارا وجود مفلوج ہو گیا ہو اور وہ جنبش کرنے کے قابل نہ رہیں ہوں۔

حامد حسین کے اعصاب مردانہ اعصاب تھے۔ دھچک لگا تو رد عمل کے لیے بے تاب ہو گئے۔ عطیہ بیگم کی طرف دیکھا اور طنزیہ بولے مبارک ہو..... چھپڑ پھاڑ کر خوش خبری آئی ہے۔

اس وقت یاور تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا باپ کے قریب آیا تھا اس نے پہلے صدمے سے پتھر بنی ماں کی طرف دیکھا پھر باپ کی طرف حامد حسین اسی طرف دیکھ رہے تھے۔

مبارک ہو بہت برا تیر مارا ہے آپ کی بیگم نے..... طنز کی چھین دماغ سے ہوتی ہوئی دل میں ترازو ہو گئی۔

(رشتوں کی نزاکت اور سفاکی دکھاتے اس سحر انگیز

ناول کی اگلی قسط انشاء اللہ آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

For Next Episodes Visit
Paksociety.com

READING
Section

تیرے عشق نچایا

عشق کی راہدار یوں، طبقہ اشرافیہ اور اپنی مٹی سے
جڑے لوگوں کی عکاسی کرتے سلسلے وار ناول کی

آخری قسط

Downloaded From Paksociety.com

”چاچا جی بزرگ ہیں اسی لیے تو اتنی تمیز سے بات کر رہی ہوں۔ اگر کوئی عام بندہ ہوتا تو آپ بھی دیکھتے میں اُس کا حشر کیا کرتی۔“

”ماہین پہلی بات یہ کہ میں نے کسی سے ایسا کچھ نہیں کہا۔ میں اور تمہاری چاچا خود ہر وقت مصطفیٰ علی کے لیے دعا گورہتے ہیں۔“

”چاچا جی آپ اور آپ کی برادری یہ بات اچھی طرح ذہن میں بٹھالے ملک قاسم علی کے گھرانے کی خواتین کے سروں پر تین مردوں کا ہاتھ ہے اور ان چھ ہاتھوں سے بڑھ کر اللہ پاک کا ایک ہی ہاتھ ہماری حفاظت کے لیے بہت کافی ہے۔ میں ملک عمار علی کی بیوہ دس مردوں کی جگہ اکیلی رکھتی ہوں۔ کوئی سوچے بھی نہ کہ یہ دو خواتین کمزور ہیں۔ اس بھول کو سب دماغ سے نکال دیں بس مجھے آپ سے اتنا ہی کہنا تھا۔ امید کرتی ہوں آپ برادری کو بھی سمجھا دیں گے۔ ہمارا گائیڈ برادری کا کوئی شخص نہیں بنے گا بلکہ اللہ جل شانہ بنے گا۔“

”سنو تو ماہین پتر تم بہت غصے میں ہو۔ تمہیں کسی نے غلط اطلاع دی ہے۔“ ماہین نے فون بند کر دیا تھا۔ دل کی بھڑاس نکال کر اب قدرے اطمینان میں تھی۔

وہ اٹھی اور وضو کرنے کی نیت سے واش روم کی جانب بڑھ گئی۔ رات کافی ڈھل چکی تھی وہ جائے نماز بچھائے عبادت الہی میں مشغول ہو گئی۔ اُس نے اپنے مالک سے مدد مانگنی تھی اور وہ مدد کرنے کے لیے تیار تھا۔ اب گہرا سکون اُسے میسر آچکا تھا۔ اللہ کے ذکر سے بندہ گہری تقویت پاتا ہے۔ روح کے تمام نہال خانوں میں سکون اتر جاتا ہے۔ اس وقت ماہین کی بھی ایسی ہی کیفیت تھی۔

☆.....☆.....☆

اسما عیل دکان پر جانے سے پہلے اُم فروا کو یہاں ڈراپ کر جانا۔ اسما عیل کا کام اچھا چل رہا تھا۔ اب اُس نے گاڑی بھی خرید لی تھی۔ وہ خوشحال ہو چکے تھے۔ لیکن مولوی ابراہیم بخش کے گھر کا ماحول سابقہ سادگی برقرار رکھے ہوئے تھا۔ مہر النساء بیگم ارسلان کی کارکردگی سے مطمئن تھیں۔ لین دین کا حساب تو مہر



Downloaded From Paksociety.com

READING
Section



النساء ہی کے پاس تھا۔ ماہین کی مشاورت سے وہ تمام امور انجام دیتیں۔
 ویک اینڈ کے اس دن لاہور کا موسم بہت اچھا تھا۔ آسمان بادلوں سے ڈھک گیا تھا۔ سبک خرام ہوا
 میں ہلکی سی خشکی عود رہی تھی۔ جو طبیعت کو اچھا محسوس ہو رہی تھی۔ اس وقت ماہین سی ایم ایچ جا رہی تھی کہ
 راستے میں کاشان احمد کا فون آ گیا۔

”تم کہاں ہو؟“

”سی ایم ایچ جا رہی ہوں۔“

”ٹھیک ہے تم ریسپشن پر میرا انتظار کرنا میں دس منٹ میں پہنچتا ہوں۔“

سیوریٹی کو شناخت اور کارڈ لینے کے بعد علی بخش کو اس نے مین انٹرنس پر رکنے کو کہا وہ گاڑی سے اتر گئی
 تو علی بخش گاڑی پارکنگ ایریا کی طرف لے گیا۔ یہاں پر باوردی سیوریٹی گارڈ نے اسے سلام کیا تھا۔ وہ
 کشادہ برآمدے کے ایک ستون کے پاس رُک کر کاشان احمد کا انتظار کرنے لگی۔ ماہین نے وہیں کھڑے
 کھڑے اُم فروا کا نمبر ملا یا تھا۔

”اسلام علیکم ماہین۔“

”وعلیکم اسلام فروا تم پہنچ گئی ہو؟“

”جی۔“

”کیسے ہیں مصطفیٰ بھائی؟“ اُم فروا مسکرائی۔

”بہت اچھے ہیں۔“

”ہوں۔“ ماہین بھی افسردگی سے مسکرائی ملک مصطفیٰ علی کو کوما میں گئے دو ماہ ہونے والے تھے۔ ماہین
 جب گھر سے نکلتی تو فروا کے ساتھ ایسے ہی مختصر مکالمے چلتے تھے۔ کاشان احمد دور سے آتا ماہین کو دکھائی
 دیا۔ ماہین کو دیکھ کر اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا۔

”ہیلو گور جیس لیڈی۔“

”ہائے ہینڈسمین۔“ جواباً اُس نے بھی نہایت خوشی سے اپنے بچپن کے دوست کا خیر مقدم کیا۔
 دونوں ایک سال بعد مل رہے تھے۔

”ملک مصطفیٰ علی کی طبیعت کیسی ہے؟“

”شان دعا کرو مصطفیٰ بھائی کے لیے۔“ اس ذکر پر وہ رنجیدہ ہو گئی تھی۔

”انشاء اللہ بہت جلد کوما سے باہر آئیں گے۔“ باتیں کرتے ہوئے وہ دونوں اوپی ڈی اور دو تین
 کوریڈور کراس کرنے کے بعد لفٹ کی جانب بڑھے تھے۔

”انکل اور آئی کیسے ہیں۔“

”اچھے ہیں۔ ماہین اس دوران تم سے رابطہ نہ رہا۔“

”ہاں عمار کے جانے کے بعد کچھ یاد نہیں رہا سوائے عمار کے۔“ اچانک سے یورش کرتی آنکھوں کے
 درمیان سفاکی سے مسکراتی ہوئی وہ بہت اچھی لگ رہی تھی۔ کاشان احمد کی تمام توجہ اُس پر تھی اس کے بچپن
 کی دوست کس قدر بدل گئی تھی۔ جسے وہ لڑکا بار بار سائیکل سے گرایا کرتا تھا۔

وہ باتیں کرتے مصطفیٰ علی کے روم تک پہنچ گئے تھے۔ باوردی مستعد نرسیں اور باقی عملہ دکھائی دے رہا تھا۔ ہلکی سی دستک دے کر ماہین اندر آگئی اُس کے پیچھے کا شان احمد تھا۔ اُم فروا مصطفیٰ علی کے قریب ایزی چیئر پر بیٹھی تھی۔ انہیں دیکھ کر کھڑی ہوگئی۔ اُم فروا نے سلام کیا۔ کا شان احمد ایک ٹک اُم فروا کو دیکھتا رہا۔ جس حیرت تھی اُس کی آنکھوں میں۔ اس وقت اُم فروا سادہ سے ڈریس میں کھلی کھلی لگ رہی تھی۔ دوٹے کے ہالے میں اُس کا دمکتا چہرہ جس پر مقناطیت سے مزین سیاہ آنکھیں کا شان احمد کو شش و پنج میں مبتلا کر گئیں۔ ماہین نے کا شان احمد کا انہماک توڑا۔

”شان یہ اُم فروا ہے مصطفیٰ بھائی کی بیوی تین ماہ پہلے ان کا نکاح ہوا تھا۔ اب رخصتی ہونی تھی کہ مصطفیٰ بھائی کا ایکسڈنٹ ہو گیا۔“

”اوہ!“ واقعی کا شان احمد کو دکھ ہوا تھا۔

”فروا یہ کا شان احمد ہیں۔ اسلام آباد میں ہمارا بچپن ساتھ گزرا ہے۔ ہم بیسٹ فرینڈز تھے۔“ اُم فروا نے اثبات میں آنکھوں کو جنبش دی۔

”آپ بیٹھیں۔“ اُم فروا نے سامنے پڑے صوفوں کی جانب اشارہ کیا۔ کا شان مصطفیٰ علی کو دیکھتا رہا۔ اُس نے فرسٹ ٹائم مصطفیٰ علی کو دیکھا تھا۔ بدستور اُن کے چہرے پر تازگی تھی۔ نین نقش نمایاں تھے۔ کا شان احمد نے دل ہی دل میں انہیں سراہا۔ اور ماہین کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گیا۔

اُم فروا پھر سے کرسی پر بیٹھ چکی تھی۔ اُس کی نظریں ملک مصطفیٰ علی کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ انہیں دیکھتے دیکھتے وہ تھکتی ہی نہیں تھی۔ اللہ نے کتنی انیسیت بھردی تھی۔ اُم فروا کے دل میں ملک مصطفیٰ علی کے لیے۔ مصطفیٰ علی سے دوریوں کا مدوجذرا اُس کے اندر واویلا برپا کرتا۔ وہ رب کو پکارتی انشاء اللہ میرے ملک جی اس ظالم بے حس سیاہ نیند کی اوٹ سے نکل آئیں گے۔ ملک مصطفیٰ علی نے اُس لڑکی کو اپنی زوجیت میں لے کر اس پر احسانِ عظیم ہی تو کیا تھا۔ ایسا اُم فروا بار بار سوچتی تھی۔

کن اکھیوں سے کا شان احمد اُم فروا کی طرف دیکھ لیتا۔ لیکن وہ یہاں پر باقی نفوس سے لاتعلق صرف اپنے ملک جی کو سوچ رہی تھی۔ جن کے ایک ہاتھ پر ڈرپ لگی تھی اور دوسرا ہاتھ اُن کے پہلو میں گرا ہوا تھا۔ چمک دار اسکن والا ہاتھ جس کی لابی مضبوطی انگلیاں آج بھی اُم فروا کو اپنی پناہوں میں لینے کے لیے بے قرار تھیں۔

ماہین اور کا شان احمد مصطفیٰ علی ہی کی بابت باتیں کر رہے تھے کہ اب رخصتی کی تاریخ مقرر کرنی تھی۔ تب تک می نے بھی آ جانا تھا۔ انہوں نے پندرہ دن کے لیے آنا تھا۔ ماہین کا شان کو اپنے مسائل کے متعلق بتا رہی تھی کہ اُن کی برادری کے لوگ کس طرح کی باتیں پھیلا رہے ہیں۔ کئی رشتے دار تو چاہتے ہی نہیں کہ مصطفیٰ بھائی ٹھیک ہوں۔ وہ سمجھتے ہیں تنہا خواتین کیا کریں گی۔ جن میں ایک ضعیف اور دوسری نو عمر ہے آسانی سے انہیں قابو کر لیں گے۔“

کا شان احمد ماہین کے لیے فکر مند دکھائی دینے لگا تھا۔ شان میں اب پہلے والی ماہین نہیں رہی ہوں ان سب کو لگ جائے گا پتا۔ ملک محمد خان کی پوتی اور قاسم علی کی نواسی ہوں۔ اگر کوئی بھول اُن کے دلوں میں ہے تو وہ جلد نکل جائے گی۔ میرے بھائی مصطفیٰ علی جیسے میرے بچے جیسے۔ کسی کی جرأت ہے جو ملک قاسم

علی کی ریاست کی طرف میلی آنکھ کر کے دیکھے۔“

”ماہی پھر بھی تم احتیاط کرو تمہارے بچے ابھی بہت چھوٹے ہیں۔ ایسے غنڈے ٹائپ لوگوں سے دور رہو تو بہتر ہے۔“

”شان ایسے لوگ کمزوروں کو اور دباتے ہیں۔ مصطفیٰ بھائی جب ٹھیک تھے تو کسی کی جرأت نہیں تھی کہ جہان آباد کی حدود عبور کر لے۔ اب گیڈر خود کو شیر کہلانے لگے ہیں۔ ماموں جان کے دوستوں کے فون آتے رہتے ہیں کہ کوئی مسئلہ ہو تو انہیں ضرور بتاؤں۔“

”ماہی تم اُس علاقہ کے ڈی سی یا مجسٹریٹ سے کیوں بات نہیں کرتی ہو۔ ماہین وہاں کون ہے ڈی سی۔“ کا شان احمد کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”ہاں ایک مرتبہ مصطفیٰ علی نے ذکر کیا تھا۔ وہ اُس سے ملے بھی تھے۔ شاید شاید.....“ وہ سوچتے ہوئے بدستور انگلی گال پر ٹیک رہی تھی۔ آئی مین..... ہاں ”التمش بخاری میرا قریبی دوست ہے۔ ایک مرتبہ فون پر اُس نے بتایا تھا آج کل وہ ضلع خوشاب میں تعینات ہے۔ میں اُس سے بات کروں گا۔ وہ خود ہی پتا لگوا لے گا۔ بس تم لال حویلی کا پہرہ بڑھا دو بچوں کا خاص خیال رکھو۔ کوئی مشکوک شخص بھی لال حویلی کے صدر گیٹ کے آس پاس نہ بھٹکے۔“

”ہاں شان ایسا ہی کروں گی۔“

”ماہی تم بالکل بے فکر ہو جاؤ۔“ شان ماہین کے چہرے پر نگاہیں مرکوز کیے آہستگی سے بولا تھا۔ ماہین کی آنکھوں میں اس مخلص دوست کے لیے احترام عقیدت اور اپنائیت آٹھ رہی تھی۔ شان نے ہمیشہ ہمیشہ ہر موقع پر اُس کی مدد کی تھی۔ ہر بار وہ رحمت کا فرشتہ بن کر اُس کے سامنے آ جاتا۔ ہمیشہ اُس کے ڈگمگاتے قدموں کو سہارا دیا۔ اسے اپنے پیروں پر کھڑا ہونا سکھایا۔ ماہین کی ازدواجی زندگی کی نیا سرکش سمندر کے گہرے پانیوں میں ہلکورے کھا رہی تھی۔ کا شان احمد ہی اُسے کنارے تک لایا تھا۔

آج ان دونوں نے خوب باتیں کی تھیں۔ اس کے دل پر بڑی گانٹھیں اپنی ایک ایک گرہ کھولتی اس کے دل کو کس قدر ہلکا کر گئیں تھیں۔ عرصہ بعد وہ عمیق گہرائیوں سے مسکرائی تھی۔

نہ فروان کی باتیں سن رہی تھی نہ ہی وہ اُم فروا کے دل کا حال جانتے تھے۔ وہ تو بس اپنے ملک جی کی ذات میں گم تھی۔ اپنے شفاف ہاتھ کی پشت بار بار اُن کے گال پر سرسراتی تب ہونٹ اُن کے کان کے نزدیک لے جا کر سرگوشی میں کہتی۔ ملک جی آپ میرا لمس محسوس کر رہے ہیں ناں؟ وہی آپ کی فروا ہوں جس کے فراق کی گھڑیاں آپ کو بے کل رکھتی تب کتنے لمحات بیت جاتے آپ اپنی بے قرار یوں کے ان گنت موتی پروتے چلے جاتے۔ اور میں سیل فون کان سے لگائے مسکراتے ہوئے آپ کی باتیں سنتی رہتی۔ میں بھی تب آپ کا مذاق اڑاتی۔ آپ ہنس کر گویا ہوتے۔ ”فروا کرونگ اب دھبت فراق کی یہ لمبی گھڑیاں سمٹ کر اختتام پذیر ہونے والی ہیں۔ تم سے ایک ایک بات کا حساب لوں گا۔“ وہ شوخ ہونے لگتے۔

”ملک جی پلیز اب اٹھ جائیں۔ میں آپ کو اس حالت میں اب نہیں دیکھ سکتی۔“ جانے اُم فروا کو کیا ہوا کہ آنسو ایک دم بغاوت پر اُتر آئے جو اچانک سے اُس کے چہرے کو جل کھل کر گئے۔ اُس نے جلدی

سے ہتھیلیوں میں تمام آنسو جذب کر لیے معامائین نہ دیکھ لے۔ لیکن وہ آج شان کی باتوں میں ایسی محو تھی۔
 ماہین کی توجہ اس کی طرف نہیں تھی۔ اچانک دروازہ کھلا آرمی یونیفارم میں ملبوس نرس اور روم بوائے سلام
 کرتے انٹر ہوئے۔

”ایکسکیوز می مسز ملک، انہیں اسٹیج ہاتھ دینا ہے۔“ ام فروا نے اثبات میں سر ہلایا۔ ماہین اور کا شان
 احمد بھی کھڑے ہو گئے۔ تینوں باہر آ گئے۔ ماہین ام فروا کی گلابی ڈوروں سے بھری آنکھیں دیکھ کر چونکی۔
 یہ نئی بات تھوڑی تھی۔ اکثر و بیشتر وہ ام فروا کی گلابی آنکھیں دیکھتی تھی۔ ماہین نگاہیں کتراتے یہ نہ کہتی فرو
 جان تم ان خوبصورت آنکھوں کو گلابی نہ کیا کرو۔“

”کینٹین چلتے ہیں وہاں چائے پیتے ہیں۔“ ماہین نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔ ماہین اور
 ام فروا قدرے ایک سنان کارنر پر آ کر بیٹھ گئیں۔ شان کا ڈنٹر پر چلا گیا تھا۔ واپسی پر بھری ہوئی ٹرے
 اُس کے ہاتھوں میں تھی۔ چیز چکن سینڈویچ بون لیس چکن بریسٹ ودا سٹیم اور اسپیشل چائے۔
 ”شان اخلاقاً تو مجھے تمہیں یہ سب آفر کرنا چاہیے تھا۔“ ماہی کوئی بات نہیں سوچا اتنے عرصہ بعد بچپن کی
 دوست ملی ہے۔“ ام فروا ان دونوں کی باتوں پر مسکرائی۔

”پلیز ماہین۔“ کا شان احمد نے ام فروا کو دیکھتے ہوئے ماہین کی طرف اشارہ کیا کہ ام فروا کی پلیٹس
 اُس کے سامنے رکھے۔ ماہین نے ام فروا کے سامنے دو پلیٹس اور چائے کا گگ رکھ دیا۔ آرمی کینٹین کا
 ماحول خوشگوار اور ہادقار تھا۔ یہاں پر معزز گید رنگ موجود تھی۔ اکثریت آرمی کی فیملیز کی تھی۔ پرائیویٹ
 افراد کم کم تھے۔ کینٹین میں موجود نفوس کی نگاہیں غیر ارادی میں بار بار ام فروا کی جانب اٹھ رہی تھیں۔
 شعلہ آتش بے مثال حسن اور اُس پر اداسی کی دبیز تہہ ایسا مکمل حسن تو خداوند کسی کسی کے نصیب میں دیتا
 ہے۔ کیا وہ کوئی یونانی شہزادی تھی یا پرستان سے آئی پری تھی۔ خود پر لوگوں کی نگاہوں کا اٹھنا۔ ام فروا کو
 شدید کوفت محسوس ہوتی۔ حجاب میں رہتی تھی تو وہ اس کے لیے بہتر تھا۔ یہ ملک مصطفیٰ علی ہی کی فرمائش تھی
 نکاح کے چند روز بعد انہوں نے اُس سے کہا تھا۔

”فرو تم صرف دوپٹہ لیا کرو۔ عبایا چھوڑ دو۔“
 ”کیوں ملک جی۔“ اُس کی آواز میں خاصی حیرانی تھی۔

”بس میرے ساتھ جہاں جاؤ گی دوپٹا لوگی یاں جہان آباد جاتے ہوئے یا بازار کے لیے تم چادر لے
 سکتی ہو۔ ماہین عمار بھائی کی خواہش پر چادر لیتی تھی۔ اور ماں جی نے بھی ہمیشہ چادر لی۔“ وہ ہنستے ہوئے
 بولی تھی۔

”ملک جی حیرت ہے پھر آپ مجھے عبایا سے کیوں منع کر رہے ہیں۔“
 ”فرو میں باہر نکلنے والا آدمی ہوں بخوبی جانتا ہوں عبایا کا استعمال کس قدر غلط طریقے سے کیا جا رہا
 ہے۔ اور پھر تمہارا حسن ایسا ہے اس پر مکمل حجاب۔ میں نہیں چاہتا کہ کوئی میری بیوی کے بارے میں ایسا
 ویسا سوچے۔ ہاں عبایا کی جگہ تم تین گز کا دوپٹا ضرور لے سکتی ہو۔“

”ٹھیک ہے سر تاج جو آپ کا حکم!“ اب وہ جب بھی باہر نکلتی چادر سے چہرہ ڈھانپ لیا کرتی۔ مصطفیٰ
 علی کے روم میں آ کر وہ چادر اتار دیتی اور دوپٹے میں اچھی طرح خود کو کور کر لیتی۔ ماہین اور شان اب بھی

اپنی باتوں میں منہمک تھے۔ اُم فروا خا موٹی سے اپنے سامنے رکھی پلیٹس کی طرف متوجہ تھی۔ ایک گھنٹہ گپ شپ لگانے کے بعد وہ تینوں کینٹین سے باہر کا شان احمد نے رسٹ واپس دیکھی ایک بج رہا تھا۔

”بہت ٹائم ہو گیا اب مجھے چلنا چاہیے پاپا کوچ کے لیے ایک دوست کے گھر ڈراپ کرنا ہے۔ ماہی اتمش بخاری سے بات کر کے کل میں تمہیں بتاؤں گا۔“

”شان تم کل لال حویلی آ جاؤ ناں۔ پھوپھی ماں سے تمہیں ملواؤں گی۔ تم سے مل کر وہ یقیناً خوش ہوں گی۔ وہ بھی پریشان رہتی ہیں۔ کل ڈنر بھی ہمارے ساتھ کرنا۔“

”ان تکلفات کی ضرورت نہیں ہے۔ ویسے میں آ جاؤں گا۔“

”شان بھول گئے تم میرے بچپن کے دوست ہو۔“ وہ مسکرایا۔

”او کے بائے۔“ اب کا شان نے اُم فروا پر الوداعی نگاہ ڈالی اور پارکنگ کی جانب بڑھا۔ وہ دونوں لفٹ ڈور کی طرف چلنے لگیں۔

☆.....☆.....☆

بلال حمید اب دل ہی دل میں دعائیں کر رہا تھا۔ اللہ کرے ملک مصطفیٰ علی کبھی کو ما سے باہر نہ آئیں وہ بد نیتی پر اتر آیا تھا۔ اپنے رب سے اُس نے کیسے کیسے توبہ استغفار کی تھی۔ خدا کو منانے کے لیے طویل سجدے کیے تھے۔ دوبارہ سے شیطان کے درغلانے میں آ رہا تھا۔ اپنی تمام وضاحتیں ضائع کر رہا تھا۔ جو اللہ سے معافی اور اُس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اُس نے کی تھیں۔ اُس وقت تو اس نے سچے دل سے توبہ کی تھی۔ اب پھر سے پرانی رفاقتوں کی طلب اُس کے اندر کیوں واویلا ڈال رہی تھی۔

کیا اُم فروا اب بلال حمید کی طرف لوٹ آئے گی اس پر اعتبار کرے گی۔ وہ تو اُس کی شکل کیا اُس کے ذکر سے بھی گھن محسوس کرتی ہوگی۔ کیا کروں میرے روم روم کے وجدان میں صرف اُسی کے احساس کی گونجیں کلبلائی ہیں۔

وہ اب بھی نماز باجماعت پڑھتا تھا۔ اپنے لیے سیدھا راستہ مانگتا تھا۔ پانچ ٹائم کی نماز میں لیکن گھناؤنی سوچوں کو دماغ سے نہیں نکال پارہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ملک مصطفیٰ علی کو کو ما میں گئے دو ماہ سات دن ہو چکے تھے۔ اب تو اُم فروا کا دل پھٹنے لگا تھا۔ اُسے لگتا اگر اب اس کے ملک جی اس بھیانک نیند سے نہ جاگے تو اُس کا دل بند ہو جائے گا۔ وہ بیٹھے بیٹھے مرجائے گی۔ اُسے جب لگ گئی تھی کوئی بات کرتا تو مختصر جواب دیتی۔ ماں جی اور ماہین سے دل نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے باتیں کرنا پڑتیں۔

ان تینوں خواتین کا درد مشترک تھا اس۔ مہر النساء، ماہین اور اُم فروا سے یکساں محبت کرتی تھیں۔ عرفان اسلم نے بھی اب مصطفیٰ علی کی کنڈیشن کے بارے میں بات کرنا کم کر دی تھی۔ روزانہ کئی بار ملک مصطفیٰ علی کو آ کر دیکھتے۔ دوسرے دن کا شان احمد نے ماہین کو فون پر بتایا تھا۔

”میری ڈی سی اتمش بخاری سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ اب تم بے فکر ہو جاؤ۔“

”تاراض تو نہیں ہوگی؟“

دوشیزہ 59

READING
Section

”بھلا میں تم سے ناراض ہو سکتی ہوں۔ کل آ جانا اور ڈنر ہمارے ساتھ ہی کرنا۔“

”سوری کل بھی فارغ نہیں ہوں، فرائی ڈے کو ضرور آؤں گا۔“

”اب عین ٹائم پر پروگرام کیمنسل نہ کر دینا۔“

”انشاء اللہ ضرور آؤں گا۔“

فرائی ڈے کی شام کو ماہین نے شاہ جی سے کہہ کر پُر تکلف ڈنر تیار کروایا تھا۔ بہت عرصہ بعد اس نے شاہ جی سے چائیںز اور اٹالین چند ڈشز کی فرمائش کی تھی۔ شاہ جی بہت خوش ہوئے تھے۔ عرصہ بعد ماہین نے اُن سے فرمائش کی تھی ورنہ جب بھی شاہ جی پوچھتے کہ چھوٹی ملکانی کیا بناؤں؟“ تو وہ کہتی۔

”شاہ جی کچھ بھی بنا لیں۔“

اُم فروا کا کھانا پینا برائے نام رہ گیا تھا۔ بے بے جی اُس کے لیے فکر مند تھیں۔ اُم زارا بھی اصرار کرتی لیکن وہ دو چار نوالے لے کر ہاتھ کھینچ لیتی۔ جب سے اس کے ملک جی اس سفاک نیند کی نذر ہوئے تھے۔ اُس نے رغبت سے کھانا نہ کھایا تھا۔ سب ہی پُر امید تھے کہ وہ جلد کو ما سے باہر آئیں گے۔ اب تو اُم فروا کی نیند بھی برائے نام رہ گئی تھی۔ وہ دیر تک عبادت الہی میں مشغول رہتی۔ کئی کئی گھنٹے ہتھیلیاں ملائے رب سوہنے سے اپنے ملک جی کا سچا اور دائمی ساتھ مانگتی۔

اس فرائی ڈے کی شب واقعی کا شان احمد آ گیا تھا۔ ماہین نے سکیورٹی گارڈ کو انٹر کام پر کہا تھا۔ لاہور کی نیم پلیٹ والی سیاہ کرو لاجوہیلی کے احاطے میں ہے اس کے لیے اندر کا گیٹ کھول دیا جائے۔“ لال حویلی کے صدر گیٹ پر بھی دربان نے فون کر کے پوچھا تھا۔ اجازت ملنے پر کا شان کی گاڑی لال حویلی کی حدود میں داخل ہوئی تھی۔

تمام مرحلے طے کرنے کے بعد اب رہائشی ایریا کے ڈرائیو وے پر گاڑی رُک چکی تھی۔ لال حویلی کی سکیورٹی ماہین کی ہدایت پر مزید سخت کر دی گئی تھی۔ کا شان احمد باہر نکلا۔ بیک سیٹ سے سفید گلابوں کے بکے اور کیک کا بیگ اٹھایا۔ کرم دین نے اُس کی رہنمائی کرتے ہوئے حویلی کی دوسری منزل کے رہائشی پورشن کی سیڑھیوں کی طرف اوپر جانے کا اشارہ کیا۔ سر کی جنبش سے شکریہ ادا کرتے ہوئے اتہائی قیمتی اور نفیس میرون سیڑھیاں پھلانگتا صدر دروازے پر آ کر رُک گیا۔ ہلکی سی دستک دینے پر ماہین ہی نے دروازہ کھولا تھا۔

”میں نے سوچا اپنے بچپن کے دوست کا خیر مقدم میں خود کروں۔“ جو اب کا شان احمد مسکرایا۔ لاؤنج کی آرائش یہاں کے مکینوں کی امارت کا منہ بولتا ثبوت پیش کر رہی تھی۔ اُس نے طائرانہ نگاہ سے جائزہ لیا۔

”شان یہاں بیٹھو گے یا ڈرائنگ روم میں بیٹھیں۔“

”ماہی ڈرائنگ روم مہمانوں کے لیے ہوتا ہے۔“ اور لاؤنج اپنوں کے لیے ہوتا ہے۔“ ماہین نے اُس کی بات اچک لی۔

”بالکل۔“

”اچھا بیٹھو تو سہی۔“ وہ سامنے کاؤچ پر بیٹھ گیا۔ ماہین اُس کے لفٹ ہینڈ صوفہ پر ٹک چکی تھی۔

”تمہارے بچے اور ساس کہاں ہیں؟“
 ”آتی ہیں۔“ گل پری فریش جوس اُن دونوں کے سامنے رکھ کر چلی گئی تھی۔
 ”گل پری پھوپھی ماں کو بتاؤ کا شان احمد آئے ہیں۔“
 ”جی اچھا۔“

مہر النساء بیگم کو آتے دیکھ کر کا شان احمد کھڑا ہو گیا انہوں نے حسان علی کی انگلی پکڑی ہوئی تھی۔ حازم علی کو گل پری نے اٹھایا ہوا تھا۔
 ”السلام علیکم جی۔“

”وعلیکم السلام تشریف رکھیے۔“ کا شان احمد مہر النساء کی پرسنالٹی سے مرعوب ہوا تھا۔
 ”آئی آپ خیریت سے ہیں۔“

”الحمد للہ!“ اُن کی دھیمی شیریں آواز میں قنانت کا عنصر نمایاں تھا۔
 ”ماہین اکثر آپ کا ذکر کرتی ہے۔“

”ان کا شکر گزار ہوں۔“ کا شان احمد اس وقت مقابل کی شان کے مطابق اپنی گفتگو کو رنگ دینا چاہ رہا تھا۔

”آئی انشاء اللہ بہت جلد ملک مصطفیٰ علی کو ما سے باہر آ جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ پھوپھی ماں اور ماہین نے بیک وقت کہا۔ ادھر ادھر کی باتوں کے دوران وہ اصلی مدعا کی طرف آیا تھا۔ گل پری بچوں کو اُن کے کمرے میں لے گئی تھی۔

”میری ڈی سی الٹمش بخاری سے تفصیلی بات ہوئی ہے۔ کل وہ لاہور میں تھا اُس کے ساتھ ایک طویل نشست بھی تھی۔ جہان آباد کے ملکوں کو وہ جانتا ہے۔ ملک قاسم علی کو اچھے الفاظ میں یاد کر رہا تھا۔ الٹمش نے تو یہ جملے کہہ کر بات ہی مکمل کر دی تھی کہ جس علاقہ کی رعایا اپنے مالک سے خوش ہو اُس سربراہ کے متعلق رائے تو خود بخود سامنے آگئی ناں۔“

”واقعی ملک صاحب ایسے ہی تھے۔“ اپنے خاوند کے ذکر پر وہ اُداسی سے بولی تھیں۔

”آئی الٹمش نے مجھ سے وعدہ کیا ہے وہ پہلی فرصت میں جہان آباد کا سروے کرے گا۔ اطراف کی تمام ریاستوں کے ملک صاحبان کو اچھی طرح سمجھا دیا جائے گا کسی کی ہمت نہیں کہ جہان آباد کی ریاست کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے۔ آپ بے فکر ہو جائیں۔ الٹمش بخاری بہت جلد جہان آباد کا وزٹ کرے گا اور سب لوگوں کو اکٹھا کر کے سمجھائے گا۔“

”شکر یہ کا شان احمد۔“

”آئی یہ میرا فرض تھا۔ آئندہ بھی جس قدر مجھ سے ممکن ہو میں آپ سے رابطے میں رہوں گا۔ انشاء اللہ وہ دن قریب ہے جب ملک مصطفیٰ علی کو ما سے باہر آئیں گے۔ آپ اور ماہین کو ہمت سے کام لینا ہوگا۔“ وہ نپے تلے لفظوں میں بول رہا تھا۔

”کا شان احمد آپ نے اس سے پہلے بھی ایک بہت بڑا احسان کیا ہے ہم پر۔“

”نہیں آئی میں نے ایسا کچھ نہیں کیا۔“

”کاشان ماہین نے آپ کی بہت ساری باتیں مجھ سے کیں ہیں۔ ماہین آپ کی بات مانتی ہے۔“
تب کاشان احمد نے ممنون نگاہوں سے ماہین کی جانب دیکھا تھا۔
”کاشان احمد اگر آپ ایسا نہ کرتے تو آج میں تنہا ہوتی۔ ماہین ہی تو ہے جو میری ہمتیں بندھاتی ہے۔ عمار کی جگہ اس نے رکھی ہوئی ہے۔ عمار ہی کی طرح مجھے گلے لگائے ہوئے ہے۔ میرے ڈگمگاتے حوصلوں کو ہمتوں میں بدل دیتی ہے۔“ کاشان نے کن اکھیوں سے ماہین کی طرف دیکھا۔ جیسے کہہ رہا ہو۔
ماہی میں سمجھ نہیں پارہا تمہاری ساس کی باتیں۔“ ماہین نے اثبات میں سر ہلایا گہری مسکان اُس کے چہرے پر عود آئی۔

”کاشان احمد آپ ہی نے اس کا گھر ٹوٹنے سے بچایا۔ عمار علی کس قدر اچھا انسان ہے اور کیسے ٹوٹ کر اس سے محبت کرتا ہے۔ یہ احساس آپ نے اس کے دل میں چکایا۔ آج آپ میرے سامنے آئے ہیں تو میں کھل کر آپ کا شکر یہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ جانے پھر زندگی موقع دے نہ دے۔“
”آئی آپ شرمندہ نہ کریں۔ یہ میری بچپن کی دوست ہے اور ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے مخلص ہیں۔ اب بھلا وہ یہ کیسے کہہ دیتا۔ میں نے ماہین کو ٹوٹ کر چاہا میں سوچتا اگر یہ مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔ میری سانسیں بند ہو جائیں گی۔ میں دنیا میں ناکارہ ایک ناکام شخصیت بن کر رہ جاؤں گا۔ میں نے تو اسے فلاح کی طرف لے کر جانا تھا۔ آنے والے عذاب لمحوں سے بچانا تھا۔ گلنار نے کھانا لگ جانے کی اطلاع دی۔ تینوں طویل راہداری عبور کرتے وسیع و عریض ڈانگ ہال میں آگئے۔

سوموار کے اس دن مہر النساء بیگم چند روز کے لیے جہان آباد جا رہی تھیں۔ اتمش بخاری نے جہان آباد کا وزٹ کیا تھا۔ ارسلان سے بھی ملاقات ہوئی تھی۔ ارسلان نے تمام معلومات بہم پہنچائی تھیں۔ اب اسی سلسلے میں مہر النساء بیگم جہان آباد جا رہی تھیں۔ ناشتے کی ٹیبل پر وہ ماہین سے کہہ رہی تھیں۔

”ماہین پتر کئی دنوں سے ایک بات سوچ رہی ہوں۔“
”کیا پھوپھی ماں۔“ وہ خاموش ہو گئیں تھیں بلاوجہ چائے میں چیچ چلا رہی تھیں کتنی گرہیں اُن کے ذہن میں اُجھتی جا رہی تھیں۔

ہمیں مولوی ابراہیم بخش کے گھر جانا چاہیے۔“
”کسی دن چلے جائیں گے۔“ وہ سلاکس پر شہد لگاتے ہوئے بولی۔

”ماہین میں چاہ رہی ہوں۔ مولوی صاحب ہمیں اُم فروا کی رخصتی دے دیں۔“ ماہین نے چونک کر حیرت سے پھوپھی ماں کی طرف دیکھا۔ ماہین سوچ رہی تھی دولہا کے بغیر بھی کبھی رخصتی ہوئی۔

”پھوپھی ماں انشاء اللہ مصطفیٰ بھائی بہت جلد کومہ سے باہر آ جائیں گے۔ پھر رخصتی بھی کرا لیں گے۔“
”ماہین بس میں چاہتی ہوں مولوی صاحب اُم فروا کو رخصت کر دیں۔“ مہر النساء بیگم گلوگیر لہجے میں

گو یا تھیں۔ گہرا اٹھملا اُن کی آنکھوں میں عیاں تھا۔ برجستگی میں جواب دینے والی ماہین بھی اُداس ہو گئی تھی۔ امید کے جگنو انہیں بند مٹھی سے آزاد نہیں کرنے تھے۔

”پھوپھی ماں پریشان نہ ہوں اپنے آپ کو سنبھالیں۔“
”ماہین پتر میری بات پر غور تو کرو۔“ اُن کے ذہن میں اس وقت صرف یہی ایک بات تھکی ہوئی تھی۔

مولوی صاحب سے درخواست کرتے ہیں وہ اُم فروا کو رخصت کر دیں، مصطفیٰ علی کی جب یہ نیند ٹوٹے گی تو پھر ہم بہت بڑا فنکشن کریں گے۔“ اس وقت مہر النساء اپنی آنکھیں کھلی ہوئے سے بچار ہی تھیں۔

”پھوپھی ماں بس آپ دعا کرتی رہیں۔ مصطفیٰ بھائی کو ما سے باہر تو آئیں پھر ایک ہفتے تک جشن منائیں گے۔“

”ماہین تم اُم فروا سے بات تو کر کے دیکھو۔ کیا اُس کے والدین مان جائیں گے۔“

”آپ پریشان نہ ہوں میں اُم فروا سے بات کرو گی۔“ اس وقت مہر النساء کا چہرہ لال ہو رہا تھا۔

ماتھے کی نیس ابھر آئی تھیں۔ اکثر ڈپریشن کی حالت میں اُن کا بی پی شوٹ کر جاتا تھا۔

”پھوپھی ماں آپ بلڈ پریشر کی میڈیسن باقاعدگی سے کھا رہی ہیں ناں۔ جب میں گھر پر نہیں ہوتی تو گلنار آپ کو دو اٹانم پر دیتی ہے ناں؟“ پھوپھی ماں اپنی خواب گاہ میں چلیں میں آپ کو دوا کی دیتی ہوں۔

کچھ دیر آرام کر لیں۔“ ماہین پریشان تھی اگر یونہی بات بات پر اُن کا بی پی ہائی ہوتا رہا تو کیا ہوگا؟ انہیں دماغ پر کسی قسم کا بوجھ نہیں ڈالنا چاہیے۔ اب ماہین کو مہر النساء کی فکر ستانے لگی تھی۔ اب پھوپھی ماں کو کیسے سمجھاؤں کہ دولہا کے بغیر کبھی بارات دلہن کے گھر گئی؟ مجھے نہیں لگتا مولوی صاحب رخصتی دیں گے۔

اُس رات وہ ایسی ہی سوچوں میں غلطاں تھی کہ می کا فون آ گیا۔ خیریت معلوم کرنے کے بعد ماہین پوچھ رہی تھی۔

”ممی آپ کب آئیں گی؟“ ان دنوں اُسے می پاپا بھائی بہت یاد آ رہے تھے۔ اُن سے ملے بہت عرصہ ہو گیا تھا۔

”کل تمہارے پاپا ٹکٹ کے لیے اپلائی کریں گے۔ جیسے ہی ٹکٹ کنفرم ہوتے ہیں ہم آنے کی تیاری شروع کر دیں گے۔“

”ممی میں آپ کو مس کرتی ہوں۔“

”ماہی جان اب آ رہے ہیں ناں۔“

”ممی مصطفیٰ بھائی کے ایکسیڈنٹ نے ہماری لائف بہت ڈسٹرب کر دی ہے۔ وہ تنہا تھی ہر طرف بحر بیکراں کے طویل سلسلے تھے جو اسے اپنی اسیری میں لیے لیے پھرتے جن سے نبرد آزما ہونا اس کے لیے دشوار ہوتا جا رہا تھا۔ بظاہر پُر اعتماد اور باہمت دکھائی دیتی۔“

”ممی پھوپھی ماں چاہ رہی ہیں مصطفیٰ بھائی کی بیوی کو رخصت کرالائیں۔ مجھے تو یہ بات کسی طرح بھی مناسب نہیں لگی، بغیر دولہا کے فرو کے پرنٹس کیسے رخصت کر دیں گے بیٹی۔ داماد جو کو ما میں ہے۔ جانے کب اُس کی نیند ٹوٹے۔ والدین تو سوچتے ہیں ناں بیٹیوں کے بہتر مستقبل کے لیے۔“

”ماہی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ لیکن مہر بھابی بھی درست ہیں۔ اُم فروا اُن کے اکلوتے بیٹے کی منکوحہ ہے وہ یہی چاہیں گی فروا ہمیشہ اُن کی بہو بنی رہے۔ مصطفیٰ کی بیوی کے روپ میں اُسے دیکھنا چاہتی ہیں۔ اپنی آنکھوں کے سامنے مصطفیٰ کی بیوی کو دیکھیں گی تو پُر سکون رہیں گی۔ اس طرح اُن کی امیدوں میں آس کی رفق مضبوط ہو جائے گی کہ مصطفیٰ علی کو خداوند ضرور ٹھیک کر دیں گے۔“ انشاء اللہ رب ضرور اپنا معجزہ دکھائے گا۔“

”آمین۔“ ماہین نے دل کی گہرائیوں کے ساتھ گلوگیر لہجے میں کہا تھا۔
 ”ماہی فروا کے آجانے سے تمہیں بھی خاصی ڈھارس ملے گی۔ پھر تم تینوں مل کر حالات ہینڈل کر سکو
 گی۔“ مئی مجھے پہلے اُم فروا کا سوچنا ہے اپنا مفاد پس پشت رکھ کر۔“ ماہین تم اُم فروا سے کھل کر بات کرو۔
 وہ کیا چاہتی ہے کیا وہ مصطفیٰ علی کے بغیر رخصت ہو کر سرال آنا چاہتی ہے۔ اگر وہ ایسا چاہتی ہے تو تب مہر
 بھابی مولوی صاحب سے رخصتی کی بات کریں۔“

”مئی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میں بھی یہی سوچ رہی تھی پہلے فروا سے بات کر لوں۔“

☆.....☆.....☆

فرانی ڈے کی اس سہ پہر ملک مصطفیٰ علی کے روم میں صوفہ پر بیٹھی ماہین نے اُم فروا کو آہستگی سے
 پکارا۔ اُس نے چونک کر ماہین کی طرف دیکھا۔

”فرو یہاں میرے پاس آ کر بیٹھو۔“ وہ چیخ سے اٹھی اور ماہین کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔

”جی ماہین؟“ وہ ہم تن گوش تھی۔

”فرو مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔“ ماہین غیر ارادی طور پر سرگوشی انداز میں گویا تھی معاً مصطفیٰ علی

ان خواتین کی باتیں سن لیں۔

”فرو پھوپھی ماں آج کل ایک ہی بات مسلسل سوچ رہی ہیں تکرار کر رہی ہیں۔ وہ جب زیادہ سوچنے

لگتی ہیں تو اُن کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ بی پی شوٹ کر جاتا ہے۔ اُن کے ذہن پر ایک ہی بات مسلط

ہے۔

”کیا؟“ اُم فروا نے توجہ سے ماہین کی طرف دیکھا۔

”وہ مولوی صاحب سے تمہاری رخصتی کی تاریخ لینا چاہتی ہیں۔ میں نے انہیں تسلی بخشی دی ہے۔ سوچا

پہلے تم سے بات کر لوں۔ فرو تم کیا چاہتی ہو؟“ اُم فروا ایک بارگی دم سادھ چکی تھی۔

”بولو اُم فروا جو تم چاہو گی وہی ہوگا۔ بلا جھجک اپنا فیصلہ سنا دو کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہے تم پر۔“

”ماہین میرے والدین جو فیصلہ کریں گے وہی میرے لیے مقدم ہوگا۔“

”ہاں فروا میں جانتی ہوں وہ تمہاری بہتری کے لیے ہی فیصلہ کریں گے۔ لیکن یہاں سچویشن مختلف ہے

بغیر مصطفیٰ علی کے تمہیں رخصت ہو کر لال حویلی آنا ہوگا یقیناً مولوی صاحب تمہاری رائے کو اولیت دیں

گے۔ فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ دیکھو اُم فروا جو فیصلہ کرنا اپنی خوشی اور مطمئن سوچ کے ساتھ کرنا۔“

”ماہین میرا خدا کی ذات پر بھروسا بہت مضبوط ہے۔ انشاء اللہ یہ جلد اس سفاک نیند سے باہر آئیں

گے۔“ اُم فروا نے ملک مصطفیٰ علی کی طرف دیکھا۔

”ماہین اگر یہ ہیں تو میں ہوں ورنہ میں، میں نہیں ہوں۔ میں آخری سانسوں تک ان کی ہوں اور

رہوں گی۔ یہ میری پہلی سچی محبت ہیں جس کی گواہی میرا روم روم دیتا ہے۔ میں تو اپنے ملک جی کے اندر گم

ہوں۔ خدا کے بعد ان کے نام کی سبج میری ہر سانس چپتی ہے۔“ ماہین مسکرائی ملک مصطفیٰ علی کے لیے اُن

کی ایسی فیملنگز سے بہت اچھا لگا تھا۔

”فرو تم کھل کر بتاؤ ہم تمہیں رخصت کرالائیں۔ پھوپھی ماں کی طبیعت ٹھیک نہیں رہتی اُن کی خوشی کے

READING
Section

دوشیزہ 64

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

لیے میں اور می بھی بہی چاہ رہے ہیں۔“
”پھر ٹھیک ہے۔“ اُم فروا گویا ہوئی۔

”تھینک یو فرو۔“ ماہین نے اسے گلے لگا لیا۔

”تم نے ہم سب کے دل رکھ لیے۔ واقعی تم اپنے ملک جی سے بہت محبت کرتی ہو۔“ اُم فروا جھپٹی۔
”میں آج ہی پھوپھی ماں سے بات کرو گی پھر ہم جلد تمہارے گھر آئیں گے مولوی صاحب سے درخواست کرنے کے لیے کہ وہ ہماری امانت ہمیں سونپ دیں۔“ تب اُم فروا آسودگی سے مسکرائی تھی۔
اُم فروا کو امید تھی کہ ابا جی اُس کی رخصتی ضرور کرادیں گے۔ کیونکہ میں اب ملک جی کی منکوحہ ہوں وہ مجھے زیادہ دیر اپنے گھر میں نہیں بٹھائیں گے۔ اللہ کے حکم کو مقدم جانیں گے۔ میری رضامندی پائیں گے تو رخصتی کا ارادہ کر لیں گے۔ اس کے اندر نئی نئی کونپلیس مہک رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

محمد علی کی پوسٹنگ کوئٹہ ہو چکی تھی۔ پنجاب رجمنٹ کی جانب سے وہ کوئٹہ جا چکے تھے۔ اُن کا سامان بھی ملٹری ٹرکوں پر کوئٹہ پہنچ گیا۔ امل نے اپنے بیٹے احمد علی کا ایڈمیشن بھی کرانا تھا وہاں کے حالات ان دنوں سازگار نہیں تھے۔ زندگی کا سلسلہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔ کوئٹہ جانے سے پہلے وہ ایک چکر لالپو حویلی کا لگالے۔ اسی شام وہ بائے ایئر لاہور پہنچی تھی۔ اُس نے اپنے آنے کی اطلاع صرف ماہین کو دی تھی۔ لیکن ماں جی کے لیے سر پرانز تھا۔ مہر النساء بیگم نے جب اچانک اپنے سامنے امل اور اس کے بچوں کو پایا تو بے حد خوش ہوئیں۔

”امل فون تو کر دیتی۔“ اُس کی خنداں پیشانی پر اپنے ہونٹ رکھتے ہوئے وہ کھل اٹھی تھیں۔

”ماں جی اگر آپ کو بتا دیتی تو اس وقت آپ کے چہرے پر جو خوشی ہے اس سے محروم رہ جاتی۔“ وہ ماں کے ہاتھ آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔ اچانک بیٹی کو سامنے پا کر اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ احمد اور مریم اُن کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ امل کے آنے سے پہلے شام کی چائے پر ماہین نے مہر النساء کو بتایا تھا۔

”میں نے اُم فروا سے بات کر لی ہے رخصتی کی اُس نے جواب دیا ہے آپ ابا جی سے بات کریں۔“

”یعنی اُم فروا کو اعتراض نہیں ہے۔ مصطفیٰ علی کے بغیر رخصت ہو کر آنے کا؟“

”نہیں اور مجھے امید ہے پھوپھی ماں مولوی صاحب کو بھی اعتراض نہیں ہوگا۔ وہ مذہبی شخصیت ہیں اللہ

اور اُس کے رسول ﷺ کے بتائے احکامات پر عمل کرنے والے۔“

”ہوں۔“ وہ مطمئن دکھائی دینے لگی تھیں۔ ماہین پتر تو نے میرا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اور اب اچانک امل

آگئی تھی۔ آج کا دن اُن کے لیے خوشیاں لایا تھا۔ وہ سوچ رہیں تھیں امل سے کہو گی کچھ دن رُک جائے

اور بھابی کو رخصت کرالائے۔“

ماہین اس وقت کچن میں جا کر شاہ جی کو چند مخصوص ڈشز بنانے کے لیے کہہ رہی تھی جو امل کو پسند تھیں۔

امل سوچ رہی تھی ماہین کتنی بدل گئی ہے۔

ماہین اور مہر النساء بیگم نے امل کو تفصیلی بتایا تھا اُم فروا کی رخصتی کے لیے۔ وہ بھی خوش تھی امل نے اپنا

قیام چند دن مزید بڑھا دیا تھا۔ میجر محمد علی سے بھی کہا تھا آپ ضرور شرکت کریں گے۔ میجر صاحب کا شیڈول ان دنوں بہت ٹف تھا۔ پھر بھی انہوں نے حامی بھری تھی۔
کھانے کے بعد امل اور ماہین مصطفیٰ علی کو دیکھنے سی ایم ایچ گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

جب سے ملک مصطفیٰ علی کو ما میں گئے تھے کوئی ایسا دن نہیں گزرا تھا جب اُم فروا ہا اسپتال اُن کے پاس نہ آئی ہو۔ وہ صبح ہی اپنے ملک جی کے پاس پہنچ جاتی تھی۔ جبکہ ماہین دن کے بارہ بجے تک سی ایم ایچ پہنچی تھی۔ آج ماہین نے رائے ونڈ روڈ پر فیکٹری میں جانا تھا۔ فیکٹری کے حالات قدرے بگڑ رہے تھے۔ میر صاحب نے اُسے بریفنگ دی تھی۔ آج اُس نے ارجنٹ میٹنگ کال کر رکھی تھی۔ سپلائی کا کام کچھ کھٹائی کی روش اختیار کر رہا تھا۔

مال ٹائم پر ڈیلیور نہیں ہو پارہا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی ہی کی طرح ماہین سنجیدگی و دلچسپی سے تمام امور پر نظر رکھے ہوئے تھی۔ میر صاحب نے بتایا تھا بلال حمید جو ڈیلیور سپروائزر ہے۔ اُس کی شکایات موصول ہو رہی ہیں۔ ہمیشہ سے شاہ جہان فوڈز کا شمار پاکستان کے معتبر بزنس فیکٹریز میں ہوتا تھا۔ جس کی مصنوعات کی مانگ کا گراف بہت اوپر تھا۔

امل کو ماہین نے سی ایم ایچ چھوڑا اور خود ڈرائیور کے ساتھ فیکٹری چلی گئی۔ اسے تفصیلی بریفنگ دی گئی تھی۔ میٹنگ کافی گھنٹوں تک چلی تھی، جہاں تمام امور پر کھل کر بات ہوئی وہیں کھپت ڈیلیوری چارجز تمام ڈیٹا ماہین نے چیک کیا تھا۔ میٹنگ میں ہر ایشو پر تمام اراکین کو ڈیٹیل سے بات کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ تین ڈیلیور سپروائزر کی کارکردگی کی ماہین نے تفصیل مانگ لی تھی۔

”میر صاحب پلیز آپ آج ہی تمام ڈیٹا مجھے ای میل کریں۔“

”میم میں ویٹکی رپورٹس ملک صاحب کے ای میل ایڈریس پر سینڈ کر دیتا ہوں۔“

”ٹھیک ہے اُن کا لیپ ٹاپ میرے پاس رہتا ہے۔ میں وقتاً فوقتاً چیک کرتی رہتی ہوں۔“ ماہین ملک قاسم علی کی بہو تھی۔ ایسے کاموں میں وہ کبھی نہ پڑی تھی۔ اب اُسے یہ سب بہت سمجھداری اور ذمے داریوں سے انجام دینا تھا۔ ریاست کا خیال تو ارسلان کر رہا تھا۔ جو ماہین اور مصطفیٰ علی کا کزن تھا۔

امل نے اُم فروا کو بتایا تھا آج شام ہم تمہارے گھر آئیں گے۔ ماہین شاہ جہان فوڈز فیکٹری سے سی ایم ایچ چھ بجے پہنچی تھی۔ پہلے اُس نے اُم فروا کو اُس کے گھر چھوڑنا تھا کیونکہ آج اسماعیل بخش نے اُسے لینے نہیں آنا تھا۔ وہ شہر سے باہر گیا ہوا تھا۔ پھر ان سب نے پھولی ماں سمیت مولوی صاحب کے گھر آنا تھا۔ اندرون موجی گیٹ جامعہ مسجد کے قریب براؤن گیٹ والے گھر میں اُم فروا کو چھوڑنے کے بعد ماہین اور امل لال حویلی آگئیں تھیں۔

مہر النساء بیگم پہلے ہی تیاری کر کے بیٹھی تھیں۔ فروٹس کے کئی کریٹ اور مٹھائیوں کے ٹوکڑے انہوں نے منگوا لیے تھے۔ آٹھ بجے یہ لوگ مولوی ابراہیم بخش کے گھر پہنچے تھے۔ مولوی صاحب گھر پر ہی تھے۔

سیماں نے مٹھائی اور فروٹس کے کریٹ وسیع و عریض برآمدے میں رکھ دیے تھے۔ کبھی پر تپاک انداز میں ملے تھے۔ امل سب کے لیے تحائف لائی تھی۔ تمام نفوس سنبل کے نرم و گداز فلور کشن پر بیٹھ چکے تھے۔

مولوی ابراہیم بخش اپنے کمرے سے نکلے۔ علیک سلیم کے بعد انہوں نے سب کی خیریت پوچھی۔
”آپ باتیں کریں میں چلتا ہوں۔“

”بھائی صاحب آپ بیٹھیں مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔“ مولوی صاحب بے بے جی کے نزدیک بیٹھ گئے ام فروا اور ام زارا کچن میں چلی گئیں۔ مہر النساء بیگم کچھ سوچ رہی تھیں۔ ماہین نے انہیں بات کرنے کا اشارہ کیا۔ وہ موزوں الفاظ تلاش کر رہی تھیں۔ وہ جو کہنا چاہ رہی تھیں عجیب ہی تو بات تھی۔ ساڑھے تین ماہ سے ان کے داماد ملک مصطفیٰ علی کو ما میں تھے۔ داماد کے بغیر اپنی بیٹی کو رخصت کر دیں کہ یہ ایک بیٹی کی ماں کی خواہش ہے۔ مولوی صاحب منتظر تھے۔ مہر النساء گویا ہوئیں۔
”دراصل مولوی صاحب ہم اس لیے حاضر ہوئے ہیں کہ اپنی امانت کو آپ کے گھر سے اپنے گھر میں لے جانے کی درخواست آپ سے کریں۔“ مولوی صاحب بے طرح چونکے تھے ان کی جھکی نگاہیں تیزی سے اوپر اٹھی تھیں۔

”دراصل مولوی صاحب پھولی ماں کی یہ شدید خواہش ہے وہ اپنی بہو کو رخصت کرا کر اپنی زندگی میں اپنے گھر لے جائیں۔ انشاء اللہ مصطفیٰ بھائی بہت جلد کوما سے باہر آئیں گے۔ کئی مرتبہ ان کی انگلیوں اور آنکھوں میں جنبش ہوئی ہے۔ ڈاکٹر زید امید ہیں کہ مصطفیٰ علی بہت جلد کوما سے باہر آ جائیں گے۔“ ماہین ملتجانا نگاہوں سے خاموش بیٹھے مولوی صاحب کو دیکھ رہی تھی۔ بے جی بھی اچانک حیرت زدہ ہوئی تھیں۔

”پلیز مولوی صاحب آپ ہمیں یہ خوشی سوچ دیں۔“ بات کرتے امل کا لہجہ رندہ گیا تھا۔ آنکھوں میں نمی پھیلی جسے اُس نے پلکیں جھپک کر جبراً روکا تھا۔
”بے جی آپ بھی تو کچھ بولیں۔“ ماہین نے ان کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ بے جی مصلحتاً مسکرائیں لیکن بولیں کچھ نہیں۔ ان کی بیٹی کے مستقبل کا سوال تھا۔ آگے چل کر کچھ بھی بعید تھا۔
”ہم مشورہ کر لیں پھر آپ کو بتا دیں گے۔“ مولوی صاحب اس دوران پہلی مرتبہ گویا ہوئے تھے۔
”مولوی صاحب ہمیں مایوس نہ کیجیے گا۔“ مہر النساء کی آنکھوں میں امیدوں کی جوت ڈگمگ رہی تھی۔
”بہن اللہ بہتر کرے گا۔“ مولوی صاحب سوچ رہے تھے ام فروا سے پوچھ لیں وہ کیا چاہتی ہے۔ اگر اُس کی مرضی کے خلاف رخصتی کرادوں تو گناہ گار ٹھہراؤں گا۔

”بہن جی دو دن تک فون کر کے آپ کو بتا دیں گے۔“ بے جی گویا ہوئیں۔
”بے جی ہمیں ہر صورت ہاں میں جواب چاہیے۔ میں اسی لیے یہاں رُک گئی ہوں۔“ امل نے کہا۔
”امل پتر! میرا ب جیسا چاہے گا اور جو اُسے منظور ہوگا وہی ہوگا ناں۔“ بے جی مسکرائیں۔
تھوڑی دیر بعد مولوی صاحب اٹھ کر مسجد چلے گئے تھے۔ انہوں نے اجازت چاہی لیکن بے جی نے کھانے کے لیے اصرار کیا۔ تھوڑی دیر بعد ام فروا اندر آئی۔
”کھانا تیار ہے ماں جی ادھر ہی دسترخوان لگا دیں۔“ ام فروا نے ساس سے اجازت چاہی۔
”ہاں پتر! ادھر ہی لگا دو۔“ ام زارا دسترخوان لے آئی تھی۔ کھانا بہت مزے دار تھا۔ سب نے رغبت سے کھانا کھایا اور کھانے کی تعریف بھی بہت کی۔

اس دوپہر اہل اور ماہین سی ایم ایچ کے لیے نکلنے ہی والی تھیں کہ مہر النساء کے سیل فون پر بے بے جی کا فون آ گیا۔ علیک سلیک کے بعد مہر النساء بیگم کی ہمت ہی نہیں تھی کہ اصل مدعا پر بات کرتیں۔ بے بے جی خود ہی گویا ہوئیں۔

”بہن جی تمام گھر والوں کے باہمی مشورے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ام فروا آپ کی بہو ہے۔ ملک مصطفیٰ علی کی بیوی ہے۔ ہم اس کی رخصتی کے لیے رضامند ہیں۔ آگے ہماری بیٹی کا نصیب۔ ہم نے اس کے تمام معاملات خدا کے حوالے کر دیے ہیں وہ ضرور اس کے حق میں بہتری کرے گا۔ جو مالک کی رضا اس کے حوالے ہماری بیٹی۔“

”بہت بہت شکر یہ فاطمہ بہن۔“ رقت آمیزی سے مہر النساء کی زبان گنگ ہو رہی تھی۔ ہاتھ کانپ رہے تھے یہ احساس ہی ان کے لیے کس قدر خوش کن تھا ان کے مصطفیٰ علی کی دلہن اپنے سسرال آ رہی ہے۔

”بہن مولوی صاحب سے مشورہ کر کے رخصتی کے لیے کوئی مناسب دن مقرر کر دیں۔“

”مولوی صاحب نے کہا ہے جمعہ کا دن مبارک ہے۔“

”ٹھیک ہے ہم صرف گھر کے لوگ ہی آئیں گے۔ جہیز وغیرہ یا کسی قسم کے تکلفات کی قطعی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ ہے انہی بچوں کا ہے۔ بہت مہربانی۔ آپ سے پھر بات ہوتی ہے۔ میں اہل اور ماہین کو بتاتی ہوں۔“

Downloaded From Paksociety.com

اہل اپنے کمرے سے نکلی تو ماں جی کو اس قدر خوش دیکھا۔

”کیا ہوا اماں جی!“

”مولوی صاحب نے رخصتی کے لیے حامی بھری ہے اسی جمعہ کو۔“

”واہ زبردست!“ خوشی سے اہل چیخی۔

”کیا ہوا بھئی۔“ ماہین حازم کو اٹھائے بیٹھیاں اترتی بولی۔

”ماہین مولوی صاحب نے جمعہ کا دن رخصتی کے لیے دے دیا ہے۔“

”ویری گڈ! پھوپھی ماں بہت بہت مبارک ہو۔“ ماہین ان کے گلے لگ گئی تھی۔ انہوں نے اس کی پیشانی کا بوسہ لیا اور حازم کو اس کی گود سے لے لیا۔ سیماس، گلنار اور گل پری بھی آگئی تھیں۔ وہ بھی خوش تھیں کہ ان کی دلہن آ رہی ہیں۔ ملک مصطفیٰ علی کی بیوی۔“ عرصہ بعد خوشی کی نوید آئی تھی یہاں کے مکینوں کے لیے سب ہی کے چہرے دمک رہے تھے۔

”اہل محمد علی کو فون کر کے بتاؤ تا کہ وہ جلدی پہنچ جائے۔“

”ماں جی آپ بے فکر رہیں علی رخصتی میں ضرور شامل ہوں گے۔“

”پھوپھی ماں تھوڑی دیر پہلے می سے میری بات ہو رہی تھی۔ کل پانچ بجے کی ان کی فلائٹ ہے۔ پہلے وہ

دہلی لینڈ کریں گی، وہاں سے لاہور پہنچیں گی۔“

”اچھا، اچھا میرے مالک تیرا شکر ہے۔ ایک ساتھ ٹونے کتنی خوشخبریاں دے دی ہیں۔“ مہر النساء

بیگم یوں خوش تھیں جیسے ان کا اکلوتا بیٹا گہری کیسی مہیب اندھیری نیند سے جاگ گیا ہو۔

”اچھا ہم ہاسپٹل جا رہے ہیں۔ اُم فروا کا فون آیا تھا۔ وہ وہیں پر ہے۔ پھوپھی ماں میں کچھ کیش رکھ لیتی ہوں واپسی پر لبرٹی کا چکر بھی لگاتے آئیں گے۔ اور اُم فروا کی پارلر میں بکنگ بھی کرا لیں گے۔ ماہین نے مصروف سے انداز میں انہیں بتایا۔“

ماہین ڈرائیور سے کہنا وہ لال حویلی کی مسجد کے امام صاحب سے کہے۔ سوال کا کلمہ شریف اور آیت کریمہ کا ختم کرا دیں اور زردہ پلاؤ کی دیکھیں پڑھنے والے بچوں میں تقسیم کرا دے۔“

”پھوپھی ماں میں علی بخش سے کہے دیتی ہوں۔ آپ اکرام کو فون کریں کہ جہان آباد کی مسجد میں رات کو شبینہ کرائے۔ اور مصطفیٰ لالہ کی صحت کے لیے خصوصی دعا کرائی جائے۔“ امل اُن کے نزدیک بیٹھتے ہوئے بولی۔

”میں ابھی فون کرتی ہوں۔ تم لوگ جاؤ ناں بہت کام باقی ہیں۔“ مہر النساء بیگم بات بات پر مسکرا رہی تھیں۔

”خداوند میری ماں کو ہمیشہ خوش رکھنا۔“ امل نے چپکے سے اُن کے لیے دعا کی تھی۔ سہماں نے آ کر بتایا گاڑی مردان خانے کے ڈرائیور پر آ چکی ہے۔ آج لال حویلی کے کبھی نفوس خوش تھے۔

☆.....☆.....☆

امل اور ماہین پہلے سی ایم ایچ آئیں حسب معمول اُم فروا پہلے سے موجود تھی۔ خوشی بھری اُداسی ہنوز اُس کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔ ماہین اور امل نے اُسے گلے لگا کر خوب پیار کیا۔ بے تحاشا دعائیں دی تھیں۔ وہ دبی دبی مسکان کے ساتھ شکر یہ ادا کرتی رہی، آنکھوں کی سطح میں اترے آنسوؤں کو جھڑک کر پیچھے دھکیلتی رہی۔

”اُم فروا کچھ دیر پہلے بے بے جی کا فون آیا تھا۔“ امل اُس کا ہاتھ پکڑے اُم فروا کو صوفے تک لے آئی۔ انہوں نے جمعہ کو رخصتی کر دینے کے لیے کہا ہے۔“ اُم فروا نے اثبات میں سر ہلایا۔ اور اپنے حنائی ہاتھوں کو بغور دیکھنے لگی جن کا رنگ اُس نے کبھی پھیکا نہیں پڑھنے دیا تھا۔ ماہین بھی اُس کے قریب بیٹھ چکی تھی۔

”فروا اُداس ہو۔“ امل نے اُس کی ٹھوڑی اپنی جانب ہلکے سے موڑی۔

”خوش ہوں امل آپ۔“ وہ بمشکل کہہ پائی۔

”جب تم آ جاؤ گی تو انشاء اللہ لالہ بہت جلد جاگ جائیں گے۔“

”انشاء اللہ۔“ اُم فروا کے ہونٹ سرگوشی میں کپکپائے۔ بار بار پکپک کر اُم فروا آنسوؤں کا سیلاب روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”اُم فروا میں اکیلی بور ہوتی رہتی تھی اب تم آ جاؤ گی تو خوب مزہ کریں گے۔ پھوپھی ماں کو میری وجہ سے یہاں رُکنا پڑتا ہے۔ پھر وہ جہان آباد چلی جائیں گی۔“

”ماہین ایسا نہیں ہو سکتا انہیں ہم گھر لے جائیں۔ تب ہر لمحہ یہ میرے سامنے رہیں گے۔“ سسکاریاں عمیق پاتالوں میں جبراً روکتے ہوئے اُم فروا نے ملک مصطفیٰ علی کی طرف اشارہ کیا، جو ساڑھے تین ماہ سے بے خبری کی نیندا ڈھسے سو رہے تھے۔ اُن کے پیاروں پر کیا گزر رہی ہے؟ وہ بے خبر تھے۔ اس وقت چھاتی تک چادر اوڑھے وہ کتنی طمانیت آمیزی چہرے پر لیے دکھائی دے رہے تھے۔

”فرو۔“ امل نے اس کا کندھا تھپتھپایا۔ وہ بے طرح چونکی۔

”بھلا ہم لالہ کو کیسے گھر لے جاسکتے ہیں۔ یہاں پل پل اُن کا خیال رکھا جاتا ہے۔ ایک ڈرپ ختم ہونے کے بعد دوسری لگتی ہے ان ڈرپس میں جانے کون کون سے انجکشن شامل کیے جاتے ہیں۔ کئی کئی بار اُن کی نبض ہارٹ بیٹ چیک ہوتی ہے۔“

”اے اے! یہ سب گھر پر بھی تو ہو سکتا ہے۔“ اُم فروا بضد تھی۔

”نہیں ہو سکتا فروا۔“ اے اے نے اُسے سمجھانے کی کوشش کی۔ ماہین خاموشی کے ساتھ دونوں کی گفتگو سنتی رہی۔

☆.....☆.....☆

مہر النساء بیگم نے اپنے اور ملک قاسم علی کے بہن بھائیوں کو رخصتی میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ یہ کیسی رخصتی تھی جو دولہا کے بغیر ہونے جا رہی تھی۔ جہاں سب خوش تھے۔ پُر ملاں بھی تھے۔

”اُم فروا نے ایک بار پھر دلہن کا روپ دھار لیا تھا۔ اُس کے حسن کا دم بخود کر دینے والا فسوں اور کچھ کمال بیوٹیشن کے باکمال ہنر کا جس نے مزید نکھار بخش دیا تھا۔ بار بار بیوٹیشن گویا تھی۔“ میں نے اپنے کیرئیر میں ایسی مکمل حسین دلہن نہیں دیکھی۔“ سب کا یوں سراہنا اُم فروا کو اچھا لگ رہا تھا۔ جس کے لیے وہ سچی سچی کاش وہ اے دیکھتا تب نازاں ہونے پر اُس کا بھی دل چاہتا۔

مہر النساء بیگم بہت خوش تھیں۔ اُم فروا کا روپ دیکھ کر سورتیں پڑھ پڑھ کر اُس پر پھونکتی رہیں۔ ماہین اور اے اے بھی اُم فروا کے دو آتے حسن کے سامنے جیسے تو صغی القاظ زبان کے اندر گنگ کر بیٹھی تھیں۔ جو دیکھتا بے اختیار کہہ جاتا ایسی حسین دلہن ہم نے آج سے پہلے اپنی زندگی میں نہیں دیکھی۔

رات کو اُم فروا رخصت ہو کر لال حویلی آچکی تھی۔ اُس کا دل ہمتا رہا۔ وہ پہلے سی ایم ایچ جانا چاہتی تھی۔ آج دو پہر لال حویلی کے تمام مزارعوں میں پُر تکلف کھانا تقسیم کیا گیا تھا۔ رعایا ملک مصطفیٰ علی کی صحت یابی کے لیے دعائیں کر رہی تھی۔ لال حویلی کی مسجد میں ہر عشاء کی نماز کے بعد ملک مصطفیٰ علی کی صحت یابی کی خصوصی دعا ہوتی تھی۔ جہاں آباد میں بھی یہ سلسلہ جاری تھا۔

مہر النساء نے تمام رسمیں ادا کی تھیں۔ فوزیہ کو اُم فروا اور اس کی فیملی بہت پسند آئی تھی۔ ڈرائنگ روم میں اُم فروا کے سامنے بیٹھی فوزیہ اُس کے سہاگ کے ٹھیک ہو جانے کی مسلسل دعائیں کرتی رہیں۔ وہ نپے تلے لفظوں میں اُم فروا کی ہمتیں بڑھا رہی تھیں۔

اُم زارا اور اسماعیل بھی تھوڑی دیر بعد لال حویلی آئے تھے۔ اُم زارا بہت خوبصورت لگ رہی تھی آف وائٹ پٹوا اور چوڑی دار پاجامے دوپٹا سلیقے سے سر پر ہے۔ وہ خطرناک حد تک اچھی لگ رہی تھی۔ اُم فروا بہت حسین تھی لیکن اُم زارا بھی کم نہیں تھی۔ جانے کتنے لوگوں نے اُسے اپنے سیل فون کے کیمروں میں قید کیا تھا۔ میجر ڈاکٹر عرفان اسلم کے بھائی عدیم اسلم حال ہی میں امریکہ سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے ساتھ لوٹا تھا۔ اُم زارا کے ہر ہر لمحے کو اُس نے کیمرے میں اسیر کیا تھا۔ عدیم کی تو مسکراہٹ رُک ہی نہیں رہی تھی۔ طمانیت آمیز مسکان کے بچوں بیچ ہونٹ کھلے جا رہے تھے۔ رخصتی کے وقت بھی عدیم کی نگاہیں اُم زارا پر ہی مرکوز رہیں اور اب لال حویلی میں اُم زارا کو دیکھ کر اُس کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ پیرنٹس شادی کے لیے لڑکیاں دیکھ رہے تھے۔ کوئی لڑکی پسند ہی نہیں آ رہی تھی اُسے۔ عدیم کی چھوٹی بہن خولہ بھی لمحہ بہ لمحہ بھائی کی نگاہوں کے زاویے کے تاقب میں لگی ہوئی تھی۔ خولہ خوش ہو گئی۔ چلو اس کے

نخریلے بھائی کی نگاہ کسی لڑکی پر ٹھہری تو سہری اور پھر اُم زارا ایسی ویسی لڑکی تھوڑی ہی تھی وہ تو پرستان کی سردارنی تھی بے پناہ خوبصورت اور آج تو اس آف وائٹ و میرون ہیوی کا مدار ڈریس اُس کی جلوہ آرائیوں کی حدیں انتہاؤں کو چھو رہی تھیں۔ اس وقت مہر النساء بیگم سوچ رہی تھیں کاش اُن کا ایک اور بیٹا ہوتا تو اُم زارا کو بھی اپنی بہو بناتیں۔ ماہین نے سوچا میرے بھائی بہت چھوٹے ہیں ورنہ میں اسے بھابی بناتی۔ اہل کو بھی اُم زارا بہت اچھی لگی تھی۔ لیکن اُس کا اکلوتا دیور بھی شادی شدہ تھا۔ خولہ نے عدیم کے کان میں سرگوشی کی۔

”بھائی آج تو بہت خوش نظر آ رہے ہو۔“ عدیل نجل ہو کر مسکراتا ہوا آگے نکل گیا تھا تو وقف بعد گھوم کر پھر سے اُم زارا کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا تھا۔ اُم زارا جو اُم فروا کے پاس ہی صوفہ پر بیٹھی بہن سے باتیں کر رہی تھی۔ اُم فروا کی اداسی دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُم فروا بس یہی سوچ رہی تھی وہ کب سی ایم ایج جائے گی۔ ملک مصطفیٰ علی کو دیکھے گی۔ لیکن وہ تو اسے نہیں دیکھ سکیں گے۔ دو دن سے اُم فروا نے ملک مصطفیٰ علی کو نہیں دیکھا تھا لگ ایسے رہا تھا جیسے صدیاں بیت گئیں انہیں دیکھے۔

آج سب لوگ خوش تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کی دلہن جو آگئی تھی ماں جی کی خوشی دیدنی تھی۔ اہل ماہین آج دل سے مسکرا رہی تھیں۔ آج اُن کی تیاری بھی خصوصی تھی۔ ماہین وہی پہلے والی ماہی دکھائی دینے لگی تھی۔ ماہین کو یوں تیار دیکھ کر فوزیہ خوش تھیں۔ ماہین نے آج اپنی بری کے درشتی زیورات پہنے تھے۔ اکثر فوزیہ کا دل دکھی بھی ہو جاتا اُن کی بیٹی بیوہ ہو گئی۔ ایک سال ہونے والا تھا۔ ملک عمار علی کو اس دنیا سے گئے پہاڑ جیسی زندگی تنہائی میں کیسے گزارے گی؟

☆.....☆.....☆

رات کو پُر تکلف ڈنر تھا۔ عدیم تو پاگل ہو رہا تھا اُم زارا کے لیے۔ اُسے اُم فروا سے زیادہ حسین اُم زارا لگ رہی تھی یہ تو عدیم اسلم کی نظر کا سحر تھا۔ ورنہ اُم فروا کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ خولہ نے اپنی والدہ کو بھی اُم زارا دکھائی تھی جبکہ وہ بھی متاثر ہوئیں تھیں۔ اُم زارا کی خوبصورتی سے۔

اگر عدیم اسلم کا بس چلتا تو آج ہی اُم زارا کو رخصت کرا کر اپنے سنگ اپنے آبائی ضلع خوشاب کے گاؤں چک سردار پور لے جاتے مگر ایسا ممکن نہیں تھا سوا نہیں صبر ہی کرنا تھا۔ اُم زارا کے جانے کے بعد اب عدیم کا بھی یہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔

”ماہین اور اہل اب بہو کو اس کے کمرے میں لے جاؤ، تھک گئی ہوگی۔“ مہر النساء نے محبت پاش نگاہوں سے اُسے دیکھا۔ اُم فروا کے دل میں گانٹھیں پڑ گئیں۔ وہ ساس سے کیسے کہہ دیتی تھوڑی دیر کے لیے مجھے اپنے ملک جی کے پاس جانے دیں۔ ماہین اُس کے چہرے پر اداسی دیکھ کر بولی۔

”فروکل ہم صبح صبح مصطفیٰ بھائی کے پاس جائیں گے۔ اب تو رات بہت ہو چکی ہے۔ وہ ملک مصطفیٰ علی کے کمرے میں آگئی۔ اندر پہلا قدم رکھتے ہوئے وہ مبہوت ہو کر رہ گئی۔ اُسے ایک بارگی لگا جیسے بہشت میں آگئی ہے۔ اُس کی مسہری موتیا چمیلی اور سرخ گلابوں سے بچی ہوئی تھی۔ ریڈ مہین شہنیل کا بیڈ پوش تھا جس پر انڈرے جیسا سفید بادلوں کے گلابوں جیسا گداز کمبل تھا۔ سفید کارپٹ پر اُس کی چھ اونچ والے سینڈل غائب ہو چکے تھے۔ اُس کی نرم فرل کے اندر انتہائی نفیس کرشل نیبل میچنگ آبنوسی صوفہ جس پر بے شمار یا قوت جڑے ہوئے تھے۔ بیڈ کے دائیں جانب کی دیوار پر اُس کی نظر پڑی تو دم بخود رہ گئی۔

71

READING
Section

اس کے نکاح کی دیوار گیر تصویر نفیس فریم میں آویزاں تھی، جس نے پوری دیوار کو اپنے پیچھے چھپا لیا تھا۔ وہ تو بس عالم شوق میں خواب آگئیں کیفیات میں اپنے بجائے اپنے ملک جی کو دیکھ رہی تھی۔ جو کس قدر وجیہ لگ رہے تھے۔ سات گز کی سفید گھیرے دار شلوار پر دو گھوڑے بو سکی کا کرتا، نفیس کام والی آف وائٹ شیروانی سر پر سفید ٹکڑا جس کے بارڈر پر بلکا سا نفیس کام تھا پیروں میں انتہائی بیش بہا قیمتی زری کھوسہ جو ان کے لمبے مضبوط پیروں کو مزید چارم بخش گیا تھا۔ مضبوط سراپا چھ فٹ سے نکلتا قدریراؤنش شہد آگئیں آنکھوں کی خیرہ کرتی چمک عجب ہوش ربائی تھی ان غلانی آنکھوں میں۔ ان کے ساتھ کھڑی ام فروا بہت اچھی لگ رہی تھی۔ اس وقت ام فروا کا دل چاہ رہا تھا ایک لمحے کے لیے اس کے ملک جی تصویر سے نکل کر اس کے سامنے آجائیں اور کہیں کہ فرود اپنی خواب گاہ میں تمہیں خوش آمدید کہتا ہوں۔“

امل نے اس کے کندھے پر نرمی سے ہاتھ کا دباؤ بڑھایا۔
 ”فروا اب لالہ کے خیال سے باہر بھی آ جاؤ۔“ وہ جھینپ کر مسکرائی۔
 ”یہ لالہ ہی کی خواب گاہ ہے آج سے یہ تم دونوں کی ہوئی۔ اب تم آرام کرو۔ تمہارے ڈر۔ سز ڈرینگ روم کی وارڈ روب میں ہیں۔“ امل نے دائیں جانب کے ڈور کی طرف اشارہ کیا۔ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بیل دے دینا۔ گلنار اور گل پری کوریڈور میں ہی ہوتی ہیں۔ رات بہت ہو چکی ہے تم چھینچ کر کے اب آرام کرو۔“ ماہین نے مسکرا کر اسے دیکھا۔

”جی۔“ ام فروا نے اثبات میں ہونٹوں کو جنبش دی۔ ماہین اور امل جا چکی تھیں وہ کاؤچ پر آ کر بیٹھ گئی۔ دل افسردہ تھا آج اس کی سہاگ رات تھی لیکن اس کا سہاگ اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ سی ایم ایچ کے ایک سفید بستر پر دنیا و ماہیا سے بے نیاز اپنی ہی دنیا میں گم تھا۔

☆.....☆.....☆

دن کافی چڑھ آیا تھا۔ وہ گہری اور ایسی پرسکون نیند سوئی تھی۔ دروازے پر دستک ہوئی تو وہ اٹھ گئی۔ دوپٹا درست کرتے ہوئے ام فروا دروازے تک آئی۔ سامنے ماہین کھڑی تھی۔
 ”ویلکم مسز ملک مصطفیٰ علی۔“ ماہین مسکرائی۔ تو اس کی آنکھوں میں حیا کی رمت پھیلی۔ وہ لجائی۔ جیسے رات بھر اس کے خدائے مجازی اس کے ساتھ تھے۔ اس وقت اپنی ذات میں کبھی آنکھوں میں نیند کا کچا خیار گلابی پوٹے تلے پر کیف آنکھیں۔ ماہین دل و جان سے ام فروا پر فدا ہوا تھی۔ ماہین کے پیچھے امل تھی۔ دونوں نے اسے گلے لگا کر پیار کیا اس کے چہرے پر گداز طمانیت آمیز چمک چمک رہی تھی۔ انہوں نے ام فروا کو بہت ساری دعاؤں سے نوازا۔

”رات نیند ٹھیک سے آئی۔“ وہ دونوں صوفے پر بیٹھتے ہوئے درمیان ام فروا کو بٹھا چکی تھیں۔
 ”جی۔“ آواز اس کی اب بھی بوجھل تھی۔

”فریش ہو جاؤ ماں جی ناشتے پر تمہارا انتظار کر رہی ہیں۔“ اس نے وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ پونے دس بج رہے تھے۔ اسے شرمندگی محسوس ہوئی۔ فجر کی نماز پڑھ کر سوئی تھی۔ آنکھ ہی نہیں کھلی۔ ام فروا جھل ہو کر گویا ہوئی۔

”ارے تو کیا ہوا۔ اب فٹ آ جاؤ۔“

”میں پانچ منٹ میں آئی۔“ وہ واش روم کی طرف بڑھ گئی۔
 ناشتے کے دوران ہلکی پھلکی گفتگو جاری رہی۔ ماں جی اُس سے کہہ رہی تھیں۔
 ”چھوٹی دلہن مصطفیٰ علی ٹھیک ہو جائیں تو ہم دعوتِ دلیمہ کریں گے۔“
 ”جی ماں جی۔“ اُم فروانے سر ہلایا۔

”چھوٹی دلہن ناشتے کے بعد تیار ہو جاؤ اور ماہین امل کے ساتھ جا کر اپنے شوہر سے مل آؤ۔“
 ”جی ماں جی۔“ اندر سے وہ اُداس تھی لیکن سب کے درمیان مسکرا رہی تھی۔ یہاں کی ایک ایک چیز کو
 دلچسپی سے دیکھ رہی تھی۔ جو یہاں کے مکینوں کی امارات کا منہ بولتا ثبوت تھا۔
 وہ ابھی ابھی امل اور ماہین کے ساتھ سی ایم ایچ پہنچی تھی۔ سفید چادر اُس نے اوڑھ رکھی تھی اس وقت
 وہ بیچ کمر کے ڈریس میں ملبوس تھی۔ کلائیوں میں گولڈ کی زرقون جڑواؤں چوڑیاں اور انگلیوں میں ڈائمنڈز
 رنگز اُس کی مہندی لگے ہاتھوں میں خوب سج رہی تھیں۔ ماہین اور امل باہر رُک گئیں تھیں۔
 ”فروتم اندر جاؤ ہم ابھی آتے ہیں۔“ اُم فروانے پھسکی مسکان اُن دونوں کی طرف اچھالی۔ یہ سبھی
 لوگ بہت اچھے ہیں۔“ اُس نے سوچا۔ اس نے سچ سچ کر کمرے کے اندر پیر رکھے۔
 وہ آنکھوں میں وارنگی سموئے ٹکر ٹکر ملک مصطفیٰ علی کو دیکھ رہی تھی۔

”ملک جی۔“ کمال ضبط کا مظاہرہ کرتے ہوئے اُم فروانے انہیں پکارا۔ پہلو میں گرے اُن کے ہاتھ
 پر اس نے اپنا حنائی ہاتھ رکھ دیا۔ ملک جی کل میں رخصت ہو کر آپ کے گھر آ گئی ہوں۔ پلیز اب تو اٹھ
 جائیں۔ کیا یہ خوشی ہم دونوں ملک کر نہیں مناسکتے؟“ اگر ایک بار ملک مصطفیٰ علی کی نگاہیں اس سوگوار حسن
 جوالا پر پڑ جائیں تب وہ کبھی یوں آنکھیں موندے نہ سوتے۔
 ”ملک جی۔“ اُم فروانے اُن کے چہرے کو چھوا۔

”آپ کب جاگیں گے؟“ اُس کی سوچیں بے بسی سے سلگ رہی تھیں۔ بے ربط لفظ اپنی ادائیگی
 بھولتے گنگ ہونے لگے تھے۔ اب کی بار اُس کے پیر اپنا بوجھ اٹھانے سے انکاری ہو رہے تھے۔ وہ کرسی پر
 بیٹھ گئی۔ اب بھی پلکیں جھپکائے بغیر انہیں اپنی روح میں اتار رہی تھی۔ غیر ارادری طور پر اُن کی مخروطی
 انگلیاں اُن کے ہاتھ پر لرزش کھا رہی تھیں۔ وہ اپنے آپ میں سمٹ کر بے خودی میں مسکرائی جیسے اُن کی
 مشکبار ہونٹ اس کے خنداں ماتھے پر اپنے لمس کے ستارے ٹانگ رہے ہوں۔ اس عزیز از جان شخص کی
 خاموشیاں اُسے دار پر لٹکا گئی تھیں۔

ماہین اور امل نے دروازے پر دستک دی وہ سیدھی ہو کر بیٹھ گئی۔ اب امل اور ماہین اس جوڑے کے
 پاس آ گئیں۔ وہ بھی اُداس تھیں۔ اُم فروا کھل کر مسکرائی۔

☆.....☆.....☆

اُم فروا کولال حویلی میں رخصت ہو کر آئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ یہاں آ کر ملک مصطفیٰ علی اُسے اور
 بے تابوں سے یاد آتے اکثر اُس کی بے بسی کی شدتیں دیدنی ہو جاتیں۔

وہ ہمیشہ سادہ لباس میں ملبوس دکھائی دیتی۔ بس ایک بار میرے ملک جی جاگ جائیں۔ پھر روز دلہن
 ہوگی ہر دن عید اور رات شب رات ہوگی۔ وہ زور سے ہستی۔ اُس کی ہنسی بھی پیاری تھی ملک مصطفیٰ علی نے

آج تک اُس کی ہنسی کی آواز نہیں سنی تھی۔

”گل پری اسے بلانے آئی تھی۔ چھوٹی دلہن جی، نکلی ملکانی جی آپ کو بلا رہی ہیں۔“

”آ رہی ہوں۔“ ہینڈ بیگ کی زیپ دوبارہ کھول کر موبائل چیک کرتے ہوئے وہ دروازے لاک کرتی باہر آ گئی۔ ماہین اسی کا انتظار کر رہی تھی۔

”فرد تمہیں سی ایم ایچ چھوڑ کر مجھے فیکٹری جانا ہے۔“ رخصتی کے بعد اُم فروا میں بہت اعتماد آ گیا تھا۔ یہ اعتماد اس کے ملک جی کی ہی وجہ سے اس میں آیا تھا۔

اس وقت ملک مصطفیٰ علی کاروٹین کا چیک اپ ہو رہا تھا۔ اُم فروا باہر ہی رک گئی تھی۔ دو کرنل سرجنز کے ساتھ میجر ڈاکٹر عرفان باہر آئے۔ اُس نے سب کو سلام کیا۔ عرفان نے اُن سے اُم فروا کا تعارف کرایا۔

”یہ مسز مصطفیٰ ہیں۔“ وہ سراہتی نگاہوں سے اُسے دیکھ رہے تھے۔

”آپ دعا کرتیں ہیں ناں مسز مصطفیٰ کے لیے۔“ کرنل عاطف پراچہ اُم فروا اُم فروا سے گویا تھے۔

”سر میں اپنے ہزبینڈ کے لیے بہت دعائیں کرتی ہوں۔“

”انشاء اللہ بہت جلد ان کی بے ہوشی ٹوٹ جائے گی۔“ کرنل پراچہ کی بات پر میجر عرفان تائیدی انداز میں مسکرائے۔

”بھابی آپ مصطفیٰ کے پاس جائیں۔“ وہ اندر آئی۔ آج بھی وہ ہمیشہ کی طرح سیدھے لیٹے ہوئے تھے۔ غلانی بند آنکھیں اس وقت اُن کے بیضوی چہرے پر بہت بھلی لگ رہی تھیں۔ کھنی مڑی ہوئی پلکیں ساکت تھیں۔

”میرے مالک یہ آنکھیں کھول دے رب تو ہی اس ظالم نیند سے انہیں نجات دلانے والا ہے۔“ اُم فروا نے دل و جان کی گہرائیوں سے اس وقت اللہ کو پکارا تھا۔

”ملک جی۔“ اُس نے اُن کے ہاتھ پر دہکتے ہونٹ رکھ دیے تھے۔ اپنے جذبات پر قابو پانے کی کوشش میں اُس کی آنکھیں گلابی ہو گئیں کمال ضبط سے رندھے گلے میں تمام سسکیاں اتار گئی تھی۔ اب ملک مصطفیٰ علی کا مضبوط ہاتھ اس کے مرمریں ہاتھ میں تھا۔ اچانک سے اُم فروا کو لگا انہوں نے بازو کھینچا ہے۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اُس کے پیر کانپ رہے تھے۔ وہ اللہ اٹھ کر انٹرکام کی بیل نہیں دبا سکتی تھی۔ اس نے جب اٹھنا چاہا ٹانگوں نے جواب دے دیا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اس دوران مصطفیٰ علی دو تین بار پلکیں جھپک چکے تھے۔ وہ ڈاکٹر ز کو پکارنا چاہتی تھی۔ چیخنا چلانا چاہتی تھی لیکن آواز دھوئیں کے گولے بناتی گلے میں پھنس چکی تھی۔ وہ بمشکل دروازے تک آئی، گزرنی نرس سے بولی۔

”پلیز ارجنٹ میجر عرفان اسلم کو بلو الیس۔“ پانچ منٹ سے بھی پہلے میجر عرفان اُس کے سامنے تھے۔ وہ سرعت سے مصطفیٰ علی کی طرف بڑھے تھے۔ اب بار بار مصطفیٰ علی پلکیں جھپک رہے تھے۔ میجر عرفان کے چہرے پر گونا گواطمینان تھا۔ جو اُن کے چہرے سے عیاں ہوتا اُم فروا بھی دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے سٹرسے کہہ کر سرجنز کو بھی بلوایا تھا۔ ملک مصطفیٰ علی کا معائنہ ہو رہا تھا۔ اُم فروا صوفے پر بیٹھی اپنے رب سے گڑگڑا کر دعائیں کر رہی تھی۔ اُن کے پیر کا انگوٹھا بھی کئی بار حرکت میں آیا تھا۔ ڈاکٹر ز جا چکے تھے اب

پھر وہ اسی پوزیشن میں تھے۔

ماہین فیکٹری سے کافی لیٹ لوٹی تھی۔ اُم فروا بے چینی سے اُس کا انتظار کر رہی تھی۔ اب وہ ماہین کو تفصیل سے بتا رہی تھی کہ ڈاکٹر بہت پُر امید ہو چکے ہیں۔ ماہین بہت خوش تھی۔

”ماہین میں نے ماں جی کو جان کر نہیں بتایا کہ وہ بے چین ہو جائیں گی۔ ہر لمحہ منتظر رہیں گی کہ کب انہیں ہوش آتا ہے۔“

ماہین نے فوراً امل کو میسج کیا تھا۔

”امل تم بہن ہو، خوب خوب دعائیں کرو۔“ امل خوش تھی اللہ کی ذات سے پُر امید تھی فوراً امل کا فون آ گیا دیر تک بات کرتی رہی۔

”فروا اب گھر چلنا چاہیے بچوں کو جا کر دیکھو۔“

”ماہین میں آج یہی رُک جاتی ہوں۔“

”فروا ہم صبح آج آجائیں گے۔ رات کو یہاں پرنس ہوتی ہے جو بہت کیئرفل ہیں۔“

”ماہین اگر رات کو انہیں ہوش آ گیا تو؟“ ماہین اُس کی بات پر مسکرائی۔

”فوراً ہمیں انقارم کر دیا جائے گا۔“

”ماہین میں رُک جاتی ہوں۔“

”فروا گھر چلو رات کو پُر سکون نیند لو۔ پورا دن تم اسی چیئر پر بیٹھی رہتی ہو۔ تھک جاتی ہوگی۔“

”بخدا میں کبھی تمہاں محسوس نہیں کرتی۔“ لیکن ماہین اُسے زبردستی لے آئی تھی۔ یوں دن رات بیٹھے

بیٹھے وہ بیمار پڑ سکتی تھی۔

☆.....☆.....☆

مزید دو دن آس ویاست میں گزر گئے۔ ماہین ابھی ابھی اُم فروا کو سی ایم ایچ ڈراپ کر کے فیکٹری کے لیے نکلی تھی۔ روزانہ صبح پہلے اُن کے کمرے کی صفائی ہوتی پھر ملک مصطفیٰ علی کو فریش کیا جاتا۔ اُم فروا روم سے باہر سیٹ پر بیٹھ گئی تھی۔ اندر بوائے کیئر اور نرس تھے۔ اُن کی شیو بنائی گئی، چہرے کو اسپنج کیا گیا۔ اُن کے گون تبدیل ہوئے۔ اُن کے ہڈ کو چینیج ہوئے۔ باہر نکلتے ہوئے اُن دونوں نے اُم فروا کو سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا انہیں ٹھیکس کہا۔ اور تیزی سے روم کی جانب بڑھی۔ ملک مصطفیٰ علی اس وقت کھلے لگ رہے تھے۔ اُم فروا نے مسکرا کر دیکھا اور اُن کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس وقت اُس نے وہ ڈریس پہنا ہوا تھا جو مصطفیٰ علی نے نکاح کے بعد اُسے گفٹ کیا تھا۔

وہ کافی دیر تک اُن کے پاس کھڑی کھٹکی باندھے انہیں دیکھتی رہی۔ جانے کتنا وقت گزر گیا وہ کھڑی رہی۔ اس کے پاؤں سو ج گئے تھے لیکن اُسے پتہ نہ چلا۔ وہ چونکی۔ پھر چونکی چلی گئی۔ اُس نے پھر دیکھا۔ پھر دیکھا۔ دیکھتی چلی گئی۔ ملک مصطفیٰ علی مسلسل پلکیں جھپک رہے تھے۔ وہ سانس روکے ساکن تھی۔ حیران آنکھوں میں خوشی کی جھانجریں بج رہی تھیں۔ وہ اُڑ کر باہر جانا چاہتی تھی ڈاکٹر ز کو بلوانے۔ لیکن اپنی جگہ سے ہل نہ سکی جیسے زمین نے اُس کے پیر پکڑ لیے تھے۔ وہ حیران رہ گئی اب اس کے ملک جی نے آہستہ آہستہ ہاتھ پہلو سے اٹھا کر سینے پر رکھا۔ اُم فروا نے اپنے کپکپاتے ہونٹوں پر ہتھیلی رکھے سختی سے بھینچا ورنہ

دو سیرہ 75

READING
Section

اُس کی چیخ نکل جاتی۔

اب ملک مصطفیٰ علی مسلسل پلکیں جھپک رہے تھے تقریباً چالیس سیکنڈ سے۔

وہ ہونٹوں پر ہاتھ رکھے بھیگی آنکھوں کے ساتھ یوں ہی مسکراتی رہی۔ اب اُن کی آنکھیں بند ہو چکی تھیں۔ وہ ہول اٹھی اس کا گلانو کیلے کانٹوں سے بھر گیا زہر آلود دھواں اُس کے گلے میں اتر گیا۔ چند لمحوں بعد انہوں نے پھر پلکیں جھپکی۔ اب وہ نیم وا آنکھوں سے سامنے کی دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ کتنے لمحے بیت گئے۔ وہ سانسیں رو کے کھڑی رہی۔ اُس نے انہیں پکارا نہیں۔ اُس میں ہمت ہی نہیں تھی زبان خشک ہو کر تالو سے چپک گئی تھی۔ اب آہستہ آہستہ انہوں نے پوری آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اب بھی سامنے کی سفید دیوار کو دیکھ رہے تھے۔ وہ شا کڈ تھی۔

”ملک جی۔“ وہ بمشکل بول پائی۔ انہوں نے سر کو ہلکا سا خم دے کر اُس کی طرف دیکھا جہاں سے انہیں آواز آئی تھی۔ چند لمحے وہ اُسے دیکھتے رہے۔

”ملک جی۔“ اُن کے ہاتھ کو اُس نے زور سے دبایا۔

”فرو۔“ نقاہت بھری آواز سے بمشکل کہہ پائے۔

”جی..... جی آپ کی فرو۔“ جواباً وہ مسکرائے۔

”میں یہاں کیوں ہوں۔“ وہ آہستہ روی سے زبان ہلا پارہے تھے۔ جو اُن کے لیے خاصا دشوار تھا۔

انسٹرکام اُس نے زور سے ہاتھ مارا۔ ہاتھ اوپر اٹھا اور پھر دبتا چلا گیا۔

چند لمحوں میں نرس کمرے میں موجود تھی۔

”پلیز ڈاکٹرز.....“ نرس نے ملک مصطفیٰ علی کی کھلی آنکھیں دیکھیں۔ اُس کی آنکھوں میں خوشی کی لہر

کوندی۔ وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔

”ملک جی آپ بے ہوشی سے نکل آئے ہیں۔“

”فرو اتم یہاں کیسے اور میں اس بستر پر؟“ آنکھوں میں کئی سوالیہ نشان تھے۔ میجر عرفان تقریباً بھاگتے

ہوئے اندر داخل ہوئے تھے۔

”مصطفیٰ۔“ وہ اُن کے چہرے کو تھپتھپا رہے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی مسکرائے میجر عرفان اسلم بے حد

ایموشنل ہو رہے تھے۔ فرط جذبات میں وہ بہت اونچا بول رہے تھے۔

”میں یہاں کیوں ہوں عرفان۔“

”ابھی تمہیں سب بتاتے ہیں۔“ آن کی آن میں سرجن بھی آگئے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی کے چیک اپ

کے دوران سب مسکرا رہے تھے۔ اُم فرو اسے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ اُسے لگ رہا

تھا خوشی سے اُس کا دل بند ہو جائے گا۔ کانپتی انگلیوں سے اُس نے ماہین کو میسج بھیجا تھا۔

”میں آرہی ہوں۔“ اُس کا فوراً جواب آ گیا۔

راستے میں ماہین نے ماں جی اور امل کو بھی فون کر دیا تھا۔ مئی کو اُس نے ٹیکسٹ کیا تھا۔ ماں جی اور امل

ابھی ابھی نکلنے کا کہہ رہی تھیں۔ اُن سب کی جیسے نئی زندگی لوٹ آئی تھی۔

کرنل سرجن ظہیر الوین ملک مصطفیٰ علی کے سامنے کھڑے آہستہ آہستہ بتا رہے تھے کہ کس طرح اُن کا

ایکیڈنٹ ہوا اور وہ کوما میں چلے گئے تھے۔ مصطفیٰ علی کی نگاہیں اُم فروا کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ سرجن جا چکے تھے عرفان یہی رُکے ہوئے تھے۔

”بھابی مبارک ہو آپ کی اور ہم سب کی دعائیں خدا نے قبول کر لیں۔“ وہ پھر مسکرائی۔

آج وہ دل سے مسکرا رہی تھی۔ سات ماہ چودہ دن اٹھارہ گھنٹے گیارہ منٹ اکیس سیکنڈ بعد ملک مصطفیٰ علی نے دوبارہ یہ دنیا دیکھی تھی۔ اُم فروا نے اُم زارا کو بھی میسج کر دیا تھا۔

”بھابی آئیں ناں ادھر تو آئیں مصطفیٰ کے پاس۔“ وہ کشاں کشاں چلتی اُن کے قریب آ گئی۔ مصطفیٰ علی نے مسکرا کر اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں اُن کی نگاہوں کی تپش سے جھکتی چلی گئیں۔

اُن کی آنکھیں اُم فروا کے چہرے سے ہٹ ہی نہیں رہی تھیں۔ وہ بمشکل ضبط کی طنائوں کو تھامے ہوئے تھی۔ آنکھیں چھلک پڑنے کو بے قرار تھیں۔

”بھالی اب رخصتی کی کہانی آپ سے سنائیں۔“

”رخصتی؟“ وہ چونکے۔ میجر عرفان بات بات پر مسکرا رہے تھے۔ کیئر ٹیکر اور نرس اندر آ گئے تھے۔ اُن

کے ہاتھ میں اسپیشل فریش جوس کا گلاس تھا۔ ساتھ ایک سلپ لپی بھی تھی جو ڈاکٹر عرفان کی طرف بڑھائی گئی یعنی مصطفیٰ علی کے میڈیسن ڈاکٹر نے اس جوش کو اُوکے کیا ہے۔ کیئر بوائے نے انہیں سہارا دے کر بیڈ پر

بٹھایا۔ اتنے عرصے بعد جسم کو حرکت دینا انہیں قدرے مشکل لگا تھا۔ ان کی ڈرپ اتار دی گئی تھی۔ تھوڑا تھوڑا جوس انہیں پلایا جا رہا تھا۔

”مصطفیٰ بھالی میں کون ہوں؟“ دیدنی خوشی سے چیخ نما آواز اُس کے گلے سے برآمد ہوئی۔

”ماہین، میری بھالی، لالہ کی بیوی۔“ وہ رُک رُک کر بولے۔

”ہاں..... بالکل۔“ ماہین کا لہجہ لڑکھڑایا۔ اور اب وہ بلند آواز سے ہنس رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

شام تک ملک مصطفیٰ علی گھر آ چکے تھے۔ ملک مصطفیٰ علی صوفے پر بیٹھے ہوئے تھے۔ لاہور میں رہنے والے تقریباً سارے رشتے دار یہاں موجود تھے۔ تمام نفوس خوش دکھائی دے رہے تھے۔ اُن کی نگاہیں بار

بار اُم فروا کو تلاش کر رہی تھیں۔ زندگی تو آج لال حویلی اور جہان آباد کے باسیوں کے اندر اتری تھی۔ دونوں جگہوں پر کھانا تقسیم کرایا گیا تھا۔ اہل بائے ایئر پہنچ چکی تھی۔ اور پھر ماں جی بھی آ گئیں۔

وہ منظر سب کی آنکھوں میں کمی لے آیا تھا جب ایک ماں اپنے بیٹے سے مل رہی تھی۔ دو دن کی ریپٹ کے بعد آج وہ سب لوگ جہان آباد جا رہے تھے۔ جہاں کل ملک مصطفیٰ علی اور اُم فروا کی دعوتِ ولیمہ تھی۔

ان دو دنوں میں ملک مصطفیٰ علی نے اُم فروا سے بے حساب بے انتہا لامحدود کبھی نہ ختم ہونے والی خوب خوب باتیں کی تھیں۔ اور اُم فروا نے فراق کے اُن دنوں کی اپنی بے تابیاں کرب ناکیاں اذیتیں،

تنہائیاں ہر ہر لمحہ اُن سے شیر کیا تھا۔ جو اُم فروا نے اُن کے بنا گزارے تھے۔ وہ مسکراتے ہوئے اُم فروا کو دیکھتے رہتے۔ ملک مصطفیٰ علی اُسے کاندھے سے لگا لیتے۔ نہایت سچائی اور لگن کے ساتھ خداوندِ قدوس سے اُم فروا کا

داغی ساتھ اپنے لیے اور اپنا ساتھ اُم فروا کے لیے مانگتے۔ تب مسکرا کر دونوں ایک دوسرے کو دیکھتے۔

(ختم شد)

Downloaded From Paksociety.com

READING
Section

رحمن، رحیم، سدا سائیں

”تمہیں گانا آتا ہے.....؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ خشک تھا قدر جیسے اس کی آواز پہ ہی چونک کر اس کی موجودگی سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس توجہ پہ اس سوال پہ وہ جتنی حیران ہوئی وہ اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ مگر اس کی نظروں کا انداز خفگی چھلکا تھا۔ یہ جاننے میں اسے ایک لمحہ.....

زندگی کے ساتھ سفر کرتے کرداروں کی فسوں گرمی، ایمان افروز ناول کا انیسواں حصہ

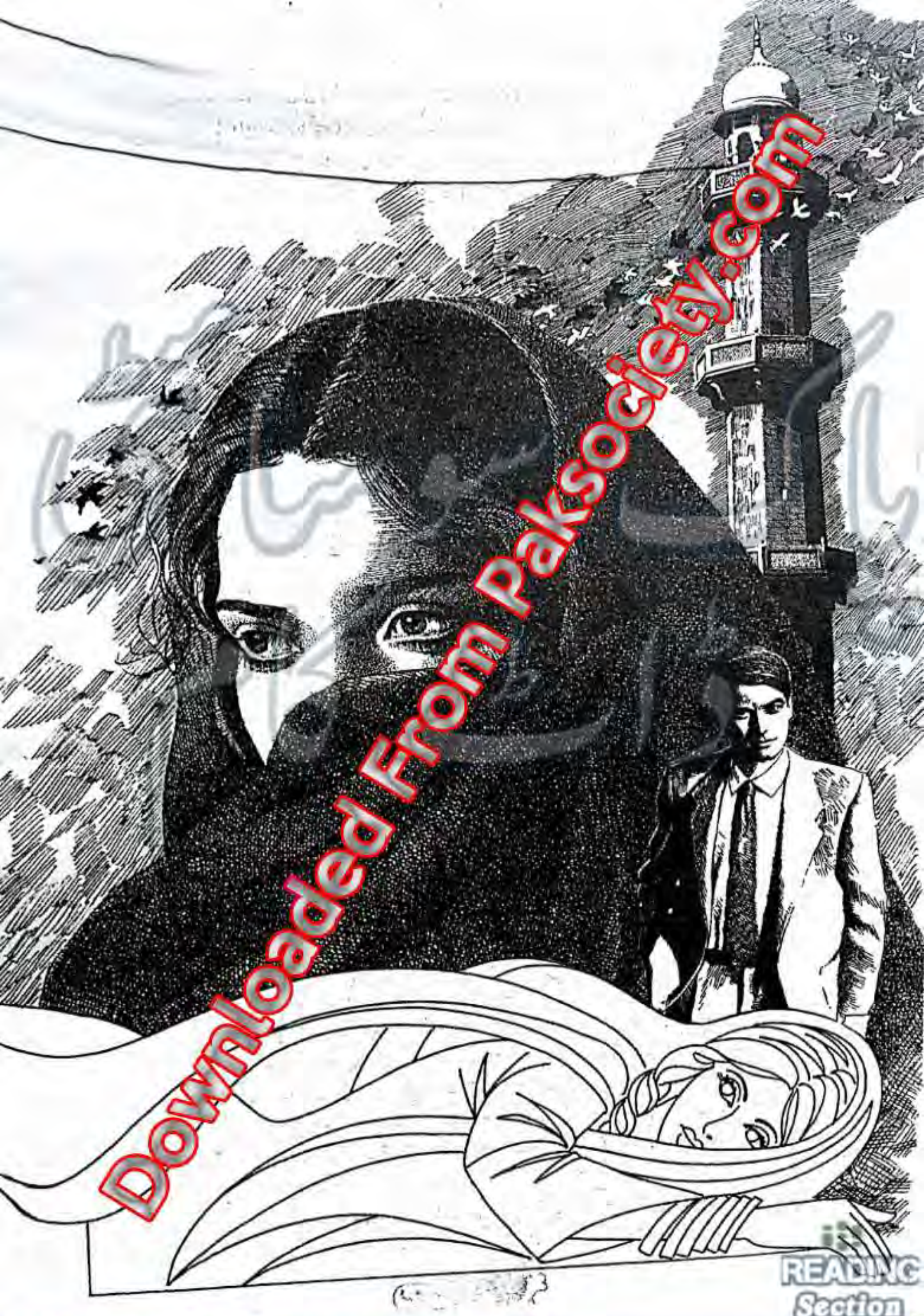
Downloaded From Paksociety.com

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بیک وقت حال و ماضی کے درپچوں سے جھانکنے والی یہ کہانی دیا سے شروع ہوتی ہے۔ جسے مرتد ہونے کا پچھتاوا، ملال، رنج، دکھ اور کرب کا احساس دل و دماغ کو شل کرتا محسوس ہوتا ہے۔ دیا جو درحقیقت علیزے ہے اور اسلام آباد چاچا کے ہاں میڈیکل کی تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے کلین ہے۔ یوسف کریم نوجوان جو اپنی خوب روئی کی بدولت بہت سی لڑکیوں کو استعمال کر چکا ہے۔ علیزے پر بھی جال پھینکتا ہے۔ علیزے جو دیا بن کر اس سے ملتی ہے اور پہلی ملاقات سے ہی یوسف سے متاثر ہو چکی ہے۔

یہ ملاقاتیں چونکہ غلط انداز میں ہو رہی ہیں۔ جیسی غلط نتائج مرتب کرتی ہیں۔ یوسف ہر ملاقات میں ہر حد پار کرتا ہے علیزے سے اسے روک نہیں پاتی مگر یہ انکشاف اس پر بجلی بن کر گرتا ہے کہ یوسف مسلمان نہیں ہے۔ دنیا میں آنے والے اپنے ناجائز بچے کو باپ کا نام اور شناخت دینے کو علیزے یوسف کے مجبور کرنے پر اپنا مذہب ناچاہتے ہوئے بھی چھوڑ کر عیسائیت اختیار کرتی ہے مگر ضمیر کی بے چینی اسے زیادہ دیر اس پر قائم نہیں رہنے دیتی۔ وہ عیسائیت اور یوسف دونوں کو چھوڑ کر رب کی ناراضگی کے احساس سمیت نیم دیوانی ہوتی سرگرداں ہے۔ سالہا سال گزرنے پر اس کا پھر سے بریرہ سے ٹکراؤ ہوتا ہے

علیزے اور بریرہ جن کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے۔ بریرہ علیزے کی بڑی بہن مذہب کے معاملے میں بہت شدت پسندانہ رویہ رکھتی تھی۔ اتنا شدت پسندانہ کہ اس کے اس رویے سے اکثر اس سے وابستہ رشتوں کو تکلیف سے دوچار ہونا پڑا۔ بریرہ سے بالکل متضاد صرف پرہیزگار نہیں عاجزی و انکساری جس کے ہر انداز سے جھلکتی ہے اور اسیر کرتی ہے۔ درپردہ بریرہ اپنے بھائی سے بھی خائف ہے۔ ہارون اسرار شوبز کی دنیا میں بے حد حسین اور معروف شخصیت کے طور پر جانا جاتا ہے۔ گھر کی دینی محفل میں وہ بریرہ کی پہلے آواز اور پھر حسن کا اسیر ہو کر اس سے شادی کا خواہاں ہے۔ مگر بریرہ ایک گمراہ انسان سے شادی پر ہرگز آمادہ نہیں۔ ہارون اسرار کی



READING
Section

بھی صورت عبدالغنی کو اس رشتہ پر رضامندی پر التجا کرتا ہے۔ عبدالغنی سے تعاون کا یقین پا کر وہ مطمئن ہے۔ اسے عبدالغنی کی باوقار اور شاندار شخصیت بہت بھائی ہے۔

اسامہ ہارون اسرار کا چھوٹا بھائی حادثے میں اپنی ٹانگیں گنوا چکا ہے۔ ہارون کی ممی اپنی قیمتی ہتھی سارہ سے زبردستی اس کا نکاح کراتی ہیں۔ جس کے لیے اسامہ ہرگز راضی نہیں اور نہ ہی سارہ کو اس کے حقوق دینے پر آمادہ ہے۔ لیکن دھیرے دھیرے سارہ کی اچھائی کی وجہ سے وہ اس کا اسپر ہونے لگتا ہے لاریب ہارون کی چھوٹی بہن جو بہت لاابالی نظر آتی ہے۔ ہارون کے ہمراہ کالج واپسی پر پہلی بار عبدالغنی کو دیکھ کر اس کی شخصیت کے سحر میں خود کو جکڑا محسوس کرنے لگتی ہے۔ علیزے لاریب کی ہم عمر ہے۔ دونوں میں دوستی بھی بہت ہو چکی ہے۔ وہ لاریب کی اپنے بھائی میں دلچسپی کی بھی گواہ ہے۔

شادی کے موقع پر بریرہ کا رویہ ہارون کے ساتھ بھی بہت لیا دیا اور سرد مہر ہی نہیں حاکمیت آمیز بھی ہے۔

ساتھی اداکارہ سوہا کی ہارون سے بے تکلفی اسے سخت گراں گزرتی ہے۔ ممی کو اپنی بیٹی کا عبدالغنی جیسے نوجوان میں دلچسپی لینا ایک آنکھ نہیں بھاتا جیسی ایک معمولی بات پر وہ لاریب کے سامنے عبدالغنی کی بے حد تحقیر کرتی ہیں۔

بریرہ لاریب کو ناپسند کرتی ہے۔ جیسی اسے یہ اقدام ہرگز پسند نہیں آتا مگر وہ شادی کو روکنے سے قاصر ہے۔ لاریب عبدالغنی جیسے منکسر المزاج بندے کی قربتوں میں جتنا سنورتی ہے۔ ہارون بریرہ کے حوالے سے اسی قدر اذیتوں کا شکار ہے۔ بریرہ کے دل شکن رویے کے باوجود ہارون اس کی توجہ کا منتظر بار بار اس کی طرف پیش رفت کرتا ہے۔ اس خواہش کے ساتھ کہ وہ بھی لاریب کی طرح سدھار کا متمنی ہے۔ مگر بریرہ جو علیزے کی بے راہ روی کا باعث خود کو گردانتی ہے اور احساس جرم میں مبتلا رہ کر منانے ہر صورت علیزے کی دلچسپی کی متمسک ہے۔

ہارون اس بے نیازی کو لا تعلقی اور بے گانگی سے تعبیر کرتے ہوئے مایوسی کی اٹھا۔ گہرائیوں میں اترتا نا صرف شوہر کی دنیا میں دوبارہ داخل ہوتا ہے بلکہ ضد میں آ کر بریرہ کو بھینوڑنے کی خاطر سوہا سے شادی بھی کر لیتا ہے۔ علیزے کے حوالے سے بالآخر بریرہ کی دعائیں مستجاب ہوتی ہیں۔ لیکن تب تک ہارون کے حوالے سے گہرا نقصان اس کی جھولی میں آن گرا ہوتا ہے۔

عبداللہادی اپنے روحانی استاد کے زیر تربیت ایک کامل مومن کی شکل میں ان کے سامنے ہے۔ وہ اسے نور کی روشنی پھیلانے کو ہجرت کا حکم دیتے ہیں۔

عمیر ایک بد فطرت عورت کے لطن سے جنم لینے والی با کردار اور با حیا لڑکی ہے۔ جسے اپنی ماں بہن کا طرز زندگی بالکل پسند نہیں۔ کامیاب علاج کے بعد اسامہ پھر سے اپنے پیروں پر چلنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔ اسامہ چونکہ فطرتاً کاملیت پسند ہے۔ کسی بھی چیز کا ادھورا پن اسے ہرگز گوارا نہیں مگر اس کے بیٹے میں بتدریج پیدا ہونے والی معذوری کا انکشاف اسے سارہ کے لیے ایک سخت گیر شوہر، متکبر انسان کے طور پر متعارف کراتا ہے۔ وہ ہرگز اس کی کے ساتھ بچے کو قبول کرنے پر آمادہ نہیں۔ عمیر کو حالات اس سچ پر پہنچا دیتے ہیں کہ وہ ایک مسجد میں پناہ لینے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ عبدالغنی سے مؤذن صاحب بہت متاثر تھے، وہ اُس سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کرتے ہیں اور اُسے قابل بھروسہ جان کر عمیر کو عقد میں لینے پر زور دیتے ہیں۔ عبدالغنی انتہائی مجبوری کی حالت میں اُن کا یہ فیصلہ قبول کر کے عمیر سے نکاح کر لیتا ہے۔

لاریب کے لیے یہ سب کچھ سہنا آسان نہیں ہوتا، وہ اُسی وقت گھر چھوڑ کر چلی جاتی ہے۔ چونکہ گھر میں کوئی بڑا نہیں ہوتا، اس لیے لاریب کو سمجھانا عبدالغنی کے بس سے باہر تھا۔ علیزے،

عبدالہادی کے ساتھ اُس کی مام سے ملنے اُن کے آبائی گھر چلی جاتی ہے۔ جب عبدالہادی علیزے کو اپنی ماں سے ملوانے کے لیے کہتا ہے تو وہ ایک غیر مسلم عورت سے ملنے کے لیے فوری طور پر انکار کر دیتی ہے۔ علیزے بدگمان تھی مختلف مواقع پر عبدالہادی کو پرکھنے کے بعد بالآخر اپنا دل صاف کرنے میں کامیاب ہو ہی گئی۔

ہارون اسرار کا رویہ بریرہ سے بہت برا ہو جاتا ہے اور وہ اسے اپنے ساتھ اسلام آباد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ چلنے کے لیے کہتا ہے۔ بریرہ اسے بھی اپنا امتحان مان کر راضی ہو جاتی ہے۔ ہارون اسرار کی دوسری بیوی، پہلی بیوی کو برداشت نہیں کر پاتی اور اُس سے اپنے نام لکھی گئی جائیداد اور روپے پیسے لے کر طلاق لے لیتی ہے۔ بریرہ اور ہارون پھر سے محبت کے بندھن کو جوڑے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔ عبدالغنی کا ایکسڈنٹ ہو جاتا ہے۔ لاریب اور غیر میں اس حادثے کے بعد دوستی ہو جاتی ہے۔

(اب آپ آگے پڑھیے)

لگایا تھا۔ عبدالعلی آہستگی سے مسکرا دیا۔ پھر بہت سادہ اور عام انداز میں گویا ہوا۔
بہت محسوم بنتے ہو
ستم بھی خوب ڈھاتے ہو
ستم چھوڑو یا نہ چھوڑو
مگر مجھے مت چھوڑو

سب سے زیادہ عبداللہ پھڑک اٹھا تھا۔ اسی قدر فراخ دلی سے داد سے بھی نوازا۔
”یہ تو مجھے کہنے کا حق بنتا ہے آپ کے بھائی نے خواہ مخواہ پوزیشن سنبھال لی۔“

اتباع کی طرف ترنجمی نگاہوں سے تکتا ہوا وہ ہرگز سرگوشی سے بلند آواز میں نہیں بولا تھا۔ اتباع بوکھلا سی گئی۔ جبکہ دوسری طرف قدر تھی۔ اپنی جگہ پہ شدید قسم کی بدگمانی کا شکار سخت ہرٹ ہوئی تھی۔ عبدالعلی کا امن کے لیے نرم لہجہ نرم نگاہیں اور سب سے بڑھ کر اس کی بات ماننا اہمیت دینا اسے عجیب سی رقابت بھری کیفیت سے دوچار کرتا جا رہا تھا۔ سب ایک بار پھر مرکز سے ہٹ گئے تھے۔ ہنسی مذاق شروع ہو چکا تھا۔ جب امن نے اتباع سے فرمائش کر دی تھی کچھ سنانے کی۔ اس کی گھبراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔

”مجھے کچھ نہیں آتا پلیز۔ جانتی ہونا تم..... اور بھائی جان کے سامنے..... شرم کر لو۔“

اب کے اس زبردست داد ملی تھی۔ بہت دیر تک اُسے سرایا جاتا رہا۔ قدر کو عبدالعلی کی پر تپش نگاہوں کا احساس بھی ہوا اتنے بہت سارے لوگوں میں وہ کس کی نگاہوں کو الگ سے بنا دیکھے بھی محسوس کرنے کی قدرتی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس نگاہ کی گرمی و سردی سے آشنا تھی۔ اس وقت بھی جان سکتی تھی۔ عبدالعلی کو اس کا یوں سب کے سامنے خود کو عیاں کرنا اچھا نہیں لگا ہے۔ جب ہی ہی اس نے لب بھینچ لیے تھے اور دانستہ اُسے دیکھنے سے گریز برتا۔ بعد میں گو کہ عبداللہ اصرار کرتا رہا۔ مگر وہ پھر سے مزید کچھ سنانے پہ قائل نہیں کر سکا تھا۔ عبداللہ تھک ہار کر عبدالعلی کے سر ہو گیا۔

”یار اتنی دلچسپی نہیں ہے شاعری میں۔ اتنی کچھ خاص بھی نہیں ہے جو یاد ہے۔“

وہ ہچکچاہٹ آمیز انداز میں کہہ رہا تھا۔ قدر نے سرد آہ بھری۔ اسے ایک اور ثبوت ملا تھا۔ اپنی ذات سے عدم دلچسپی کا اس کا خیال تھا۔ جو لوگ محبت کرتے ہیں ان کی لازمی طور پہ شاعری میں دلچسپی گہری ہوتی ہے۔ عجیب یقین تھا۔ بے ثبات قسم کا مگر تھا ضرور۔

”چلو آپ سناؤ تو یہ تو بعد میں فیصلہ ہو گا کہ پسند آتی بھی ہے یا نہیں۔“ امن نے مسکرا کر ٹکڑا

وہ امن کو گھرک رہی تھی۔ جب عبداللہ نے اُس کی گلو خلاصی کرائی تھی۔

”یہ ٹھیک کہہ رہی ہیں ان کی طرف سے بھی ہم گالیں گے۔ ان کی یہاں موجودگی ہی کافی ہے۔ سب سے بڑا انعام ہے سب سے زیادہ تقویت کا باعث.....“

اس کی آنکھیں معنی خیزیت سمٹ لائیں۔ چہرہ شرارت کا عکس لیے جگمگا رہا تھا۔ اتباع کا نوب کی لوؤں تک سرخ پڑنی چہرہ جھکا گئی تھی۔

”ٹھیک ہے تو پھر آپ سنائے۔“ امن نے بھی اتفاق کر لیا تھا۔ عبداللہ نے کارنش بجایا اور بڑے انداز میں گلا کھنکارا تھا۔ پھر اتباع کی جانب دیکھ کر مسکرایا۔ اپنی ڈیروائف کو ڈیڈ کیٹ کروں گا آف کورس۔“

زندگی میں تو سب ہی پیار کیا کرتے ہیں میں تو مر کر بھی میری جان تمہیں چاہوں گا تو ملا ہے تو یہ احساس ہوا ہے مجھ کو یہ میری عمر محبت کے لیے تھوڑی ہے

رات کا تیسرا پہر..... ستاروں کا دھیماسفر، پر کیف چلتی ہوئی ہوا اور سچے جذبوں سے معمور اس کی خوبصورت بھاری آواز کی دلکشی..... ماحول میں جیسے ایک طلسم چھانے لگا۔ قدر نے دیکھا۔ عبداللہ کی شوخ جذبوں سے لبریز نگاہوں کا مرکز اتباع کا شرمایا لجا یا دلکش روپ تھا۔ اس نے دل میں ایک کی ایک چھین محسوس کی تو بے اختیار عبدالعلی کی جانب دیکھا تھا۔ وہ سیل فون پہ بری طرح مصروف نظر آیا۔ اللہ جانے واقعی مصروف تھا یا یہ اس ماحول سے فرار تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اترنے لگی۔ عبدالعلی کا روڈ بی ہیوئیر اسے عجیب سی خود ترسی کا شکار کر رہا تھا۔ شاید ایسا نہ بھی ہوتا۔ اگر جو شعوری

یا لاشعوری طور پر وہ اپنا موازنہ اتباع سے نہ کر رہی ہوتی۔

اتباع جسے عبداللہ کا بس نہ چلتا تھا سر آنکھوں پہ بٹھالے۔ دل میں چھپالے جبکہ عبدالعلی کے بے نیازی لا تعلقی اس صورت میں تکلیف دہ محسوس ہوتی تھی۔ عبدالعلی کے سیل پر شاید کوئی کال آرہی تھی۔ اس نے معذرت خواہانہ نظروں سے ناظرین کو دیکھا اور اٹھ کر خاصے فاصلے پر چلا گیا۔ قدر نے ٹھنڈی سانس کھینچی اور عبداللہ کی سمت متوجہ ہوئی جو اس جذب سے گارہا تھا۔

تیری ہر چاپ پر جلتے ہیں خیالوں میں چراغ جب بھی تو آئے جگاتا ہوا جادو لائے تو پھر آئے..... جان تمنا آچھولوں تم کو دیر تک اپنے بدن سے تیری خوشبو آئے

وہ خاموش ہوا پھر دانستہ اتباع کی جانب جھکا تھا اور شوخ و شنگ نظروں کی گرفت میں اس کا حیا آمیز تاثر سے سجا چہرہ لیتا ہوا ہنسا تھا۔

”کچھ یقین آیا ہے جناب.....!“ اور اتباع بے اختیار چہرہ پھیر گئی تھی۔ یہ انداز گریز پائی کا ہی نہیں تھا۔ اس کی نگاہ کی شدت سے گھبراہٹ کا بھی تھا۔ عبداللہ کی ہنسی دو چند ہو گئی تھی۔

نکا لو اپنا چاند سا چہرہ آغوش آنچل سے آنکھیں ترس رہی ہیں تیرے دیدار کو اس پڑسوار شرارت اور بڑھنے لگی اور اتباع کی گھبراہٹ اور سراپہ سبکی بھی۔

ان ہاتھوں پہ مہندی کا کچھ فائدہ ہمیں بھی ہوا کہ رات بھر ان کے چہرے سے زلفیں ہٹاتے رہتے

عبداللہ نے آہ بھر کر کہا تھا اور اس کا حنائی ہاتھ ذرا سا چھوا تھا۔ اتباع تڑپ گئی تھی بدک گئی تھی۔ عبداللہ کی نگاہوں میں حیرت ابھرنے لگی۔

تاثر اتر رہا تھا۔ اتباع نے پھر بھی اسے نہیں دیکھا۔ اہمیت نہیں دی۔ اس کے دل کا بوجھ بڑھنے لگا۔

”اب بھی.....؟“ وہ کتنا شاکہ ہوا تھا۔ پھر متاسفانہ سرد آہ بھری اور اس کیفیت میں مزید گویا ہوا۔

مجھ کو بھی بے وفا سمجھتا ہے
جانے وہ خود کو کیا سمجھتا ہے

Downloaded
From
Paksociety.com

کوئی تہر کوئی سزا
کوئی روش کوئی راز
کوئی تو طریقہ بتا
کہ دل ٹوٹے بھی نا
ساتھ چھوٹے بھی نا
اور چین آ جائے

اس کی خاموشی اور بے نیازی پہ عبداللہ کو ہلکا سا غصہ آیا تھا۔ جب ہی آہ بھر کر گویا ہوا۔ اتباع کے ہونٹوں پہ مسکراہٹ مچلی مگر اس نے ہونٹ بھیج لیے تھے۔

اس کا انداز ایسا تھا۔ اتنا شاکہ اس قدر احتجاج آ میر کہ اتباع خاموش نہ رہ سکی۔
”محبت کر لینا بڑی اور اہم بات نہیں۔ بڑی اور اہم بات یہ ہے کہ محبت نبھائی جائے۔ اور محبت نبھانا ہر کسی کے بس کا کام نہیں۔ خیر برداشت اور ایثار کے بغیر محبت کبھی مکمل نہیں ہوتی۔“

”میرے دل نے مجھ پہ یہ حقیقت واضح کی ہے کہ محبت عاشق کا ہی مرتبہ نہیں بڑھاتی۔ محبوب کی قدر و منزلت میں بھی اضافہ کر دیتی ہے۔ آپ جب تک چاہو مجھے میری محبت کو آزما لو۔ اللہ نے چاہا تو جیت کر دکھاؤں گا۔“ ٹھیک ہے لیکن آپ کو وعدہ کرنا پڑے گا جب میری محبت آپ کے دل کو تسخیر کرے۔ آپ پوری دیانتداری کے ساتھ مجھے آگاہ کریں گی۔ میں سمجھتا ہوں یہ میرا حق ہے۔“

اس کا انداز ہلکی سی سرزش ہلکی سی تنبیہ لیے تھا۔ عبداللہ جتنا حیران ہوا تھا سو ہوا پھر گہرا طویل مضطربانہ سانس بھر کے متاسفانہ انداز میں اسے دیکھتا ہوا سیدھا ہو گیا تھا۔

اس محبت میں وہ صابر بھی ہوا تھا۔ اعلیٰ ظرف بھی۔ مگر یہ جو شرط رکھی تھی وہ اتباع کو کیسے قبول ہو سکتی تھی۔ اس جیسی شرم حیا سے معمول لڑکی بھلا یہ بے حجابی کرے کیونکہ کتنی۔ وہ اس سوال کا جواب نہ دے سکی تو عبداللہ ایک بار پھر ہرٹ ہونے لگا تھا۔

”ہاں..... آپ تو یہیں کہیں گی آپ تو یہی کہہ سکتی ہیں۔ ظالم لوگ بے حس لوگ کسی کی کیفیت کو کیا سمجھیں۔“ وہ جیسے اسے قائل کرنا چاہتا تھا مگر اتباع کا چہرہ ساٹ تھا۔ عبداللہ کو گہرے اضمحلال نے آن لیا۔ پتا نہیں کیوں وہ اس لڑکی کو یقین سوئپ دینا چاہتا تھا۔ وہ ہی اپنی بات پہ زور دیتے ہوئے مزید گویا ہوا۔

تیرے جواب کے وقفے طویل کر رہے ہیں
بہت

”کچھ الفاظ محض الفاظ نہیں ہوتے۔ وہ کیفیات ہوتی ہیں اتباع! جو تب آپ کو سمجھ آ سکتی ہیں جب آپ کے اوپر گزرتی ہیں۔ جب آپ نے محبت ہی نہیں کی تو پھر آپ میری کیفیات کو کیا سمجھیں گی۔ اس کے وجیہہ چہرے پر گھمبیر قسم کا

گزرتے جانے ہیں میرے سوال کے موسم
اس کا احتجاجی انداز کس قدر خفگی لیے تھا۔
اتباع نے گھبرا کر اُسے دیکھا وہ جیسے ہنوز منتظر تھا۔
مگر اتباع کے اپنے مسائل اپنی مجبوریاں تھیں۔
جنہیں وہ شاید سمجھنے سے قاصر تھا۔

کیا طبیعت تھی کس راہ پہ ڈالی نہ گئی

کٹ گئی عمر مگر خیالی نہ گئی

وہ آہ بھر کے رہ گیا۔ اتباع ہونٹ کاٹتی رہی۔
قدر نے گہرا سانس بھرا۔ اور جیسے اس اس راز و
نیاز سے روکنے کو گلا کھنکارا تھا۔

”عبداللہ صاحب اور کتنے شعر لڑھکائیں
گے۔ کچھ ہمیں بھی موقع دیں۔“

وہ مصنوعی انداز میں خفا ہوئی۔ عبداللہ چونکا
اور گہرا سانس بھرتا ہوا کاندھے اچکا کر رہ گیا۔

”ضرور عرض کریے۔ جو کبھی کرنا چاہتی
ہیں۔“

”مجھے ایک بہت خوبصورت گانا یاد آ رہا تھا۔

سو چا گا ہی لوں۔“ اس نے عبدالعلی کو اس جانب
واپس آتے دیکھ کر کہا تھا۔ ارادہ عبدالعلی کو پھر

سے زچ کرنے کا بن گیا تھا۔ اس پر عجیب متضاد
کفایت طاری ہو رہی تھیں۔

عبدالعلی کی محبت اسے اس دائرے میں رہنا
اس کی مرضی یہ چلنا سکھاتی تھی اور اس کی بے

اعتنائی وہ آگے تھی جب سب کچھ جلا کر بھسم کرٹی
ہوئی جواب میں اسے اسی آگ میں کھینچ لینے پر

تل جاتی۔ اس وقت وہ دوسری کیفیت کے زیر اثر
تھی۔ اس پر کچھ جتلانا بھی مقصود تھا۔ واضح کرنا

بھی اور اس کے مخالف چلنا بھی۔ جب ہی جب
تک عبدالعلی وہاں پہنچ کر کرسی سنبھال رہا تھا۔

وہ اپنی آواز کا جادو جگانے لگی۔
ہمیں تم سے پیار کتنا یہ ہم نہیں جانتے

مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا.....
یہ دل بے قرار کتنا ہم نہیں جانتے

مگر جی نہیں سکتے تمہارے بنا
عبدالعلی نے سیل فون جینز کی جب میں

ڈالتے ہوئے چونک کر حیرانی بلکہ غیر یقینی سے

اسے نغمہ سرا ہوتے دیکھا اور جانے کس احساس
کے تحت ہونٹ بھینچ لیے تھے۔ وہ اس کی طرف
متوجہ نہیں تھی۔ ورنہ اس کی نظروں کا انداز بتا دیتا
وہ اس پل کتنا خفا تھا اس سے۔

تمہیں کوئی دیکھے تو جلتا ہے دل
بڑی مشکلوں سے پھر سنبھلتا ہے دل

عبدالعلی نے یونہی بھینچے ہوئے ہونٹوں کے
ساتھ نگاہوں کا زاویہ بدل لیا۔ اتباع خود حیران

تھی۔ قدر کو آخر ہوا کیا ہے۔ قدر نے آنکھیں
میچے جیسے کسی اور جہاں میں گم تھی۔ گلے میں دکھ اتر

رہا تھا۔ نگاہ میں وہ منظر تھا۔ جب سب سے الگ
تھلگ امن اس کے پاس کھڑی تھی۔ اس سے کوئی

اہم بات کرتی۔ عبدالعلی کے ہر دم سنجیدہ رہنے
والے چہرے پر اس لمحے کتنی شرارت تھی۔ وہ کتنا

شوخی لگ رہا تھا ہر انداز سے..... ایسے کیا
راز و نیاز تھے جو وہ سب سے دور ہو کر کرنے میں

مصروف تھے۔ کتنا دل دکھا تھا قدر کا..... یہ کوئی
کیسے جانتا۔

سنا ہے غم جدائی کا اٹھاتے ہیں لوگ
جانے زندگی کیسے بتاتے ہیں لوگ

”میرا خیال ہے اب اس محفل کو برخاست ہو
جانا چاہیے..... تہجد کی اذان شروع ہو گئی ہے۔“

عبدالعلی اٹھ کھڑا ہوا۔ اس کا لہجہ بے حد خشک
ہو چکا تھا۔ اس کے بعد اٹھنے والی جیسے اس مرحلے

کی منتظر اتباع تھی وہ اگلے لمحے عبدالعلی کے پہلو
میں اکر کھڑی ہو گئی۔

”جی بھائی جان! پلیز گھر چلیے۔“
”ارے یہ کیا بات ہوئی آدمی رات کو گھر

سے بھاگنے کا کیا مقصد ہے۔ کمرے میں
چلو۔ آرام کرو۔ صبح ناشتے کے بعد تسلی سے۔“

عبداللہ نے خفگی سے اتباع کو دیکھتے ہوئے

البتہ ٹوکا عبدالعلی کو ہی تھا۔ عبدالعلی نے محض شانے جھٹک دیے تھے۔ اندرونی حصے کی طرف جاتے وہ سب آگے پیچھے تھے۔ اور سب سے پیچھے قدر..... عبدالعلی کے قدموں کی رفتار سے ہونے لگی یہاں تک کہ وہ بے خیال سی چلتی قدر کے برابر آ گیا تھا۔

”تمہیں گانا آتا ہے.....؟“ اس کا لہجہ تلخ تھا۔ خشک تھا قدر جیسے اس کی آواز پہ ہی چونک کر اس کی موجودگی سے آگاہ ہوئی تھی۔ اس توجہ پہ اس سوال پہ وہ جتنی حیران ہوئی وہ اس کے چہرے پر عیاں تھا۔ مگر اس کی نظروں کا انداز خفگی چھلکاتا تھا۔ یہ جاننے میں اسے ایک لمحہ درکار تھا۔ اور وہ ایک لمحہ اس کے گمان کو ادراک بخش چکا تھا۔

”جی آتا ہے اچھا گایانا میں نے.....؟“ بلکہ مجھے تو ڈانس بھی آتا ہے۔ اتباع کی شادی پر کروں گی۔“ اب کی مرتبہ قدر نے دانت اسے آگ لگائی تھی۔ غلط بیانی کرتے اور کامیاب بھی رہی وہ اس توقع سے بھی کہیں زیادہ بھڑکا تھا یوں جیسے آتش فشاں لاوا جب ہی خود پہ ضبط کیے بغیر دھاڑا تھا۔

”شٹ اپ.....“ اتنی بلند اس کی آواز کہ ان سے آگے چلتے ہوئے لوگ بھی حیرانگی میں مبتلا کر اچھنے میں گھرے پلٹ کر دیکھنے لگے تھے۔ تب عبدالعلی کو اپنے طیش کا احساس ہوا تھا۔ قدر بھی خائف نظر آنے لگی۔ صد شکر کہ کسی نے کوئی سوال نہیں کیا تھا۔

”اس قسم کی غلطی کر لینا۔ ورنہ اس میں شک نہیں رہے گا کہ میں تمہاری ٹانگیں توڑ ڈالوں گا۔ اس کا موڈ ہنوز قہر زدہ تھا۔ اپنی بات مکمل کر کے وہ لمبے ڈگ بھرتا آگے بڑھ گیا۔ قدر بھیگی

نظروں سے اسے دیکھتی زیر لب مسکراتی رہی تھی۔ اتباع نے تشویش میں گھر کر اسے دیکھا اور اس کے قریب آ گئی۔

”خیریت.....؟“ بھائی جان اتنے خفا کیوں تھے.....؟“ وہ سخت تشویش کا شکار تھی۔ قدر کچھ نہیں بولی۔

’ڈانٹ رے تھے نا تمہیں.....؟‘ اتباع کی فکر مندی کا انداز بھی ملاحظہ کرنے والا تھا۔ قدر نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”ہاں صرف ڈانٹ نہیں رہے تھے ٹانگیں توڑنے کی بھی پیش گوئی کر گئے ہیں۔ وہ عجیب انداز میں ہنسی اتباع نے اسے ایسے دیکھا۔ گویا اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو۔ پھر سر جھٹک دیا اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کرنی ہاتھ پکڑ کر کمرے میں آ گئی۔ اتباع کی فکر ختم تو نہیں ہوئی البتہ اس نے مزید سوال نہیں کیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اس کا ایڈمیشن میڈیکل کالج میں ہوا ایک مرحلہ نیٹ گیا۔ علیزے کو تو خاص کمرے سے ایک بوجھ اتر گیا تھا۔ اب وہ مستقل یہاں رہتی۔ اس کی خوشی کا اس سے بڑھ کر کیا راز ہو سکتا تھا جبکہ قدر کوئی اتنا خاص خوش نہیں تھی۔ پہلے تو اس نے ہاسٹل میں رہنے کی ضد لگائے رکھی جو بظاہر ہے نہیں مانی جاسکتی تھی۔

سمجھانے قائل کرنے والے لوگ ایسے تھے۔ عبدالغنی، عبدال ہادی اور لاریب کہ اس کو مانتے بن پڑی تھی۔ البتہ ایک اور شوشہ ضرور چھوڑ دیا۔ جسے سن کر سب ہی پریشان نہیں بھی ہوئے تو بھی الجھن کا شکار تھے۔

وہ اپنی ایک کلاس فیلو کے ایڈمیشن کی خواہش مند تھی جس کے گھر والے اسے مزید تعلیم دلوانا

اٹھی تھی۔ اپنی دوست کو فون پہ خوشخبری بھی سنا دی کہ وہ کچھ دنوں میں تشریف لائے گی۔

”مجھ سے کسی پوچھ رہی تھی مجھے کون کون سی ڈسزپنڈ ہیں۔ میں نے جھٹ گنوا دیں۔“

اس وقت وہ جھولے پر بیٹھی تھی۔ گود میں دھرے باؤل میں پاپ کارن بھرے ہوئے تھے۔ جنہیں وہ بڑی نزاکت سے ایک ایک اٹھا کر کھا رہی تھی۔

”تم چلو گی ساتھ.....؟“ اس نے اتباع کو بھی دعوت دی وہ بدک سی گئی۔

”جی نہیں۔ میں نہیں جا رہی اتنا لمبا سفر وہ بھی گاؤں کا۔ معاف رکھو مجھے۔“ قدر نے برا سامنہ بنا لیا۔

”دیکھو باؤل گہرے ہو رہے ہیں مجھے لگتا ہے بارش ہوگی۔“ اس نے جھولا جھلایا تھا۔

”گرچ چک کے ساتھ بارش ہو تو مزہ دو بالا ہو جائے۔“ اس نے حسرت سے کہا۔ اتباع اسے بلا دباغ گھورنے لگی۔

”اللہ نہ کرے جو طوفان آئے میری ساری رات کی نیند حرام ہو جائے گی۔ اتنا ڈر لگتا ہے مجھے۔“

اس کے جھر جھرا کے کہنے پر قدر نے قہقہہ کگاتے ہوئے اس کا مضحکہ اڑایا تھا۔

”فضول ہو تم بھی اتنے رومینک موسم کو طوفان سمجھتی ہو۔ اونہہ۔ عبد اللہ صاحب تمہارے اس خوف سے خوب فائدہ اٹھایا کریں گے۔ اس نے آخر میں معنی خیزی سے کہا تو اتباع بے تحاشا سرخ پڑ گئی۔

”بہت بد تمیز ہو تم.....“ وہ خجالت متانے کو یہی کہہ سکتی تھی۔

”اس میں بد تمیزی کی کیا بات ہے تم دونوں

نہیں چاہتے تھے جبکہ وہ بضد تھی کہ اس کے گھر والوں کو قائل کیا جائے کیونکہ وہ سمعیہ (وہ دوست) تعلیم حاصل کرنا چاہتی ہے۔ عبدل ہادی سے اس نے فرمائش کی تھی کہ وہ اس کی تعلیم کا خرچ برداشت کریں تاکہ سمعیہ اپنی خواہش کے مطابق ڈاکٹر بن کر مسیحا کر سکے۔

”تو ٹھیک ہے بیٹے! یہ تو ویسے بھی نیکی کا کام ہے۔ آپ بچی کے والد سے میری فون پر بات کروادو۔ میں انہیں قائل کر لوں گا۔“

عبدل ہادی اس کے چہرے کی مسکان کی خاطر کچھ بھی کر سکتے تھے۔ یہ تو بہت معمولی بات تھی ان کے نزدیک۔

”نہیں ناں پاپا جانی! وہ لوگ خاصے بیک واڈ ہیں۔ فون پہ کبھی راضی نہیں ہوں گے۔ سمعیہ کہہ رہی تھی میں اگر اس کی والدہ سے گھر آ کر بات کروں انہیں متالوں تو شاید ممکن ہو سکے۔“

اس جواب پر عبدل ہادی کے ساتھ علیزے بھی سوچ میں پڑ گئی اور قدرے متامل بھی تھیں۔

”اللہ جانے کیسے لوگ ہیں فون پہ مانتے ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں تمہیں نہیں بھیجوں گی۔“ اور وہ سمجھنے کے بجائے الٹا ایشہ گئی تھی۔

”ٹھیک ہے تو پھر میں بھی نہیں پڑھوں گی کرے جو کوئی مرضی۔“ اس نے اکھڑپن سے کہا تھا اور وہاں سے اٹھ گئی تھی علیزے نے یہ مسئلہ سب کے سامنے رکھا تھا۔ عبد العلی کو جتنا طیش آیا تھا اس فضول اور بچکانہ ضد پر عبد العلی ہمیشہ کی طرح یہاں بھی کول ہی رہے۔

”کوئی مسئلہ نہیں ہم مل لیں گے اس بچی کے گھر والوں سے۔ قائل بھی کر لیں گے میں چلوں گا تمہارے ساتھ۔“ جب فیصلہ ہو گیا تھا تو پھر عبد العلی بھی اختلاف نہیں کر سکا۔ قدر سنتے ہی کھل

بہن بھائی ہو ہی بور، روئینس نام کو نہیں تم دونوں میں..... سڑی ہوئی اکتائی ہوئی بوڑھی سوچیں ہیں۔“ وہ تاسف سے سر جھٹک رہی تھی۔ اتباع نے اسے گہرا سانس بھر کے دیکھا۔

”مجھ سے خود اپنے اوپر اور عبداللہ بھائی پر بس ترس آ سکتا ہے۔ کیسے بد ذوق لوگوں سے ٹکرا گئے ہم۔“

اب کی مرتبہ وہ سراسر شرارت سے کہہ رہی تھی۔ مگر وہاں سے گزرتے عبدالعلی کو اس کی اس بے حجابانہ گفتگو نے ضرورتاً سب و ملال میں مبتلا کر دیا تھا۔ جبکہ وہ اس کی آمد سے بے خبر اس تبسم خیز شرارتی انداز میں کہہ رہی تھی۔

”مجھے تو بارش بہت پسند ہے۔ میرا دل کرتا ہے میں ہوں تمہارا بھائی ہو اور لانگ ڈرائیو ہو بارش ہو طوفان ہو۔ بادلوں کی گرج چمک..... بارش کی سرتال..... زندگی میں اور کیا چاہیے۔“ وہ کھلکھلا رہی تھی جب اتباع نے اسے جھڑکا۔

چپ کرو بد تمیز.....! بھائی نے سن لیا ہوگا۔“ اتباع کے چہرے پہ خفت کی لالی تھی۔ قدر نے گردن موڑ کر برآمدے کے سرے پہ غائب ہوتے عبدالعلی کے لمبے چوڑے مضبوط سراپے کو دیکھا اور کاندھے جھٹک دیے۔

”تو سن لیس ڈرتی ہوگی تم ان سے میں نہیں۔ اونہہ۔“ وہ ننھی سی ناک سکوڑ کر نخوت سے کہہ گئی تھی۔ اتباع نے گہرا متاسفانہ سانس بھرا۔ جبکہ قدر کی آنکھوں میں نمی سی پھیلنے لگی تھی کہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔

آس اس در سے ٹوٹی ہی نہیں

جا کے دیکھانہ جا کے دیکھ لیا

وہ میرے ہو کر بھی میرے نہ ہوتے

ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا کتنا حوصلہ کر کے اس نے عبدالعلی کے روبرو کہہ دیا دیئے تھے۔ یہ شعروہ بھی کم گائیاں نہیں تھا لمحوں میں مقدر اور شکوہ سمجھ گیا اور ہمیشہ کی طرح نظر انداز کرنے کے بجائے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر جواباً گویا ہوا تھا۔

کوئی تو بات ہو جو تم کو نمایاں کر دے میں کسی عام سی لڑکی کا نہیں ہو سکتا تو طے ہوا تھا وہ عام لڑکی تھی کم از کم عبدالعلی کے نزدیک۔ پھر وہ کیوں خود کو مزید گرانی کیوں خود کو خوار کرتی۔ وہ خود کو جتنا سمجھاتی تھی مگر دل تھا کہ ہر بار آڑے آ جایا کرتا تھا وہ اس دل کے ہاتھوں بے بس تھی۔ تمہارا فون ہے اتباع۔“

غیر ہاتھ میں اس کا موبائل لیے وہیں چلی آئی تھیں۔ اتباع ایک دم شرمندہ نظر آنے لگی۔

”امی جان کیوں زحمت کی میں خود آ جاتی یا آپ مجھے بلا لیتیں۔“

”کال عبداللہ بیٹے کی تھی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ مس ہو۔ بچہ فیل کرے گا مگر میں پھر بھی ہو گئی۔“

ان کا لہجہ بند ہو جانے والے فون کو تکتے متاسفانہ ہوا البتہ اتباع پر سکون ہوئی تھی۔ اسے سخت شرم آ رہی تھی کہ وہ ماں کے سامنے عبداللہ سے بات کرے۔ اس کی نظریں جھکی تھیں۔ ورنہ قدر کی شوخ نظریں مزید اسے شرمندہ کرتیں۔ غیر واپس پلٹیں تھیں کہ فون پھر سے بجنا شروع ہوا۔ قدر نے مسکراہٹ دہرائی۔

”چلو جاؤ تم اب اپنے کمرے میں اور ان سے بات کرو۔ میرے سامنے کہاں کرو گی۔“

”میں ویسے بھی نہیں کر سکتی۔ انہیں تو اور کوئی کام نہیں ہے۔“ وہ حیا آمیز کوفت سے بڑبڑائی۔

قدر نے افسردہ قسم کی آہ بھری تھی۔

نہیں آرہا ہے محتر سے زوجہ! کیا کریں بتائیے کہ.....

دل مرحوم کو خدا بخشے

اک ہی نمکسار تھا نہ رہا.....

مزید آہیں بھری گئیں۔ اتباع اس قدر عاجز ہوئی تھی۔

”پلیز!! اس انداز میں بات نہ کیا

کریں۔ میں ایری ٹیٹ ہوتی ہوں۔ وہ جھنجھلا نے لگی۔ جو ابادہ جیسے کراہ اٹھا۔

”آپ بھی حد کرتی ہیں۔ آپ تعریف بھی کر سکتی ہیں مثلاً کہ یہ کہتیں یعنی مجھے ڈیڈ کیٹ کر دتیں۔

کون جیتے گا ان سے باتوں میں

ان کی آنکھیں کلام کرتی ہیں

ان کی آنکھیں سوال کرتی ہیں

میری ہمت جواب دیتی ہے

اتباع کا حال یہ تھا بس نہ گویا چلتا تھا سر پیٹ لے اپنا۔

”کیوں کال کی.....؟ میں تو کچن میں جا رہی

تھی۔“ اس نے گویا جان چھڑانا چاہی۔

”طبیعت خراب ہے بستر پہ ہوں دل اداس ہے۔“ وہ بچوں کی طرح بسورا۔

”آپ ڈاکٹر کو دکھا لیتے۔ دوا لیتے۔“ اتباع

نے صحیح راستہ بتایا۔ اس نے منہ بگاڑ لیا تھا۔

”حق ہا..... کوئی فائدہ نہیں ہوا آپ کو بتانے کا کہ.....

سب سمجھتے ہیں بات مطلب کی

کس نے سمجھا ہے بات کا مطلب

اور اتباع واقعی چکرا گئی تھی۔ اور اس کے

جھانے میں بھی آگنی لفظوں کے اس پہر پھیر

سے۔

”خدا جب قسمت دیتا ہے تو بے نیازی آہی جاتی ہے مگر ورتو ہو گے تم لوگ۔ وہ اپنے انداز میں اس کی عزت افزائی میں مصروف ہوئی جس پہ اتباع نے کان نہیں دھرا۔

”کچن میں جا رہی ہو چائے پینی ہو تو بتا دو۔“

عبداللہ صاحب کو دیتی ہوں یہ آفر.....! سر

کے بل تشریف لائیں گے۔ اتباع کوئی تاثر دیے بغیر چلی گئی۔ مگر کمرے میں فون رکھنے تک عبداللہ

کی مسلسل کالز آتی رہی تھیں۔ اسے نا چاہتے ہوئے بھی ریسو کرنی پڑی۔

خن میزان میں تو لونہ تو لو

مگر نزدیک آ کر بھید کھولو

کہیں خوشبو سے نہ سن لے بات کوئی

میری جان اور بھی آہستہ بولو

جذبات سے بو جھل گھمبیر تر لہجہ اتباع کی پیشانی سلگنے لگی۔

”کیوں زحمت کی.....؟“ اس کا لہجہ بے

مروت اور خشک ہوا۔

حسرت دید میں گزراں ہیں زمانے کب

دشت امید میں گرداں ہیں دیوانے کب

یہ جواب تھا جو آہ بھر کے دیا گیا تھا۔ اتباع

اس قدر بھنائی مگر پھر نصیحت کا ارادہ باندھ لیا کہ اس کی تربیت ہی ان کی خطوط پر ہوئی تھی۔

”لا محدود آرزوئیں زندگی کو مشکل بنا دیا کرتی ہیں۔ عبداللہ صاحب! سب کچھ عشق و

عاشقی نہیں ہے۔“ جو اب عبداللہ نے آہ بھری تھی

بلکہ آہیں بھری تھیں۔

”ہمیں تو آپ کے سوا دنیا میں اور کچھ نظر ہی

”آئی ایم ساری میں قطعی نہیں کبھی۔ وہ گھبرائی وہ مسکرایا پھر گھمبیر تر لہجے میں بولا تھا۔ وہی وحشت وی حسرت وہی تنہائی رقصاں ہے

میرا کمرہ خوابوں سے کتنا ملتا جلتا ہے انداز پھر در دیلا اور آہ بھرنے والا ہوا تھا۔ اتباع کی گھبراہٹ بڑھی۔ معنی خیزیت نے لہجے کی واضح کیا تھا مطلب ورنہ وہ اتنی سمجھدار نہیں تھی کہ یوں پلے بات پڑتی۔ جب ہی دھک دھک کرتے دل کے ساتھ خاموش لب بستہ کھڑی کی کھڑی رہ گئی۔

”کیا اب بھی نہیں ہو میری معصوم پری!“ وہ قدرے توقف سے بولا تھا۔ اس سے قبل وہ کچھ کہہ کر جان چھڑوائی یا فون بند کرتی وہ پھر بول پڑا۔ اس بار لہجہ کس حد تک آنچ دیتا ہوا کسی حد تک ذومعنی اور گستاخی کی جانب بھی مائل تھا۔

تو بتا کیا یہ ظلم نہیں میرے ساتھ.....؟ تیرے ہوتے ہوئے میری بانہوں میں تکیے وہ گنگنایا تھا اور اتباع صحیح معنوں میں جیسے جلتے لاؤ میں جا پڑی۔

اگلے لمحے اس نے سیل فون کان سے ہٹا کر ایسے دور پھینکا جیسے وہ دکھتا انگارہ ہو۔ سانپ بچھو ہو۔ یہ دوسرا موقع تھا جب وہ اس حد تک بے حجاب ہوا تھا اس حد تک گستاخ..... اتباع کے لیے خود کو سنبھالنا مشکل ہونے لگا۔ آنکھوں میں نے بسی کے مارے نمی پھیل رہی تھی۔ کچھ دیر ہونٹ کچلتی رہی پھر اس اضطراب کا شکار پلٹ کر باہر نکل گئی تھی۔ کمرے میں اس کے بستر پہ پڑا فون بار بار واہیرٹ کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

انسان کی خواہشات سے اللہ کو دلچسپی نہیں

ہے۔ وہ اس کی تقدیر اپنی مرضی سے بناتا ہے۔ اسے کیا ملنا چاہیے کیا نہیں ملنا چاہیے اس کا فیصلہ وہ خود کرتا ہے۔ جو چیز آپ کو ملنی ہے آپ اس کی خواہش کریں یا نہ کریں وہ کسی اور کے پاس نہیں جائے گی مگر جو چیز آپ کو نہیں ملنی..... وہ کسی کے پاس بھی چلی جائے آپ کو نہیں ملے گی انسان کا المیہ یہ ہے کہ وہ جانے والی چیز کے ملال میں مبتلا رہتا ہے آنے والی چیز کی خوشی اسے سرور نہیں کرتی۔“

امن نے گہرا سانس بھرا اور دروازہ یونہی بھڑا چھوڑ کر واپس پلٹ آئی۔ وہ ارسل سے بات کرنے آئی تھی۔ مگر عبدالغنی کو پہلے سے اس کے موجود پا کر وہ قدرے مطمئن ہوئی تھی۔ سارا کی خواہش پہ عبدالغنی کو پہلے سے اس کے موجود پا کر وہ قدرے مطمئن ہوئی تھی۔ سارا کی خواہش پہ عبدالغنی بالخصوص اسے سمجھانے آئے تھے۔ شادی پہ رضامندی دینے کے واسطے۔ یقیناً موضوع گفتگو ہی تھا۔

”ماموں کب آئے ماما!“ وہ کچن میں آئی تو بریرہ کو مصروف عمل پا کر سوال کیا تھا۔ جو کھانے پہ انتظام میں مصروف تھی۔ بھائی کو کھانا کھلائے بغیر جانے نہیں دینا چاہتی تھیں کہ کبھی کبھار تو آتے تھے وہ۔

”ابھی کچھ دیر قبل ارسل کے ساتھ اس وقت۔“ سارا کی طرح بریرہ بھی خالی پر جوش تھیں اور پر یقین بھی کہ عبدالغنی ارسل احمد کو قائل کریں گے۔

”تم سلام کر آئیں.....؟“ بریرہ نے چاول ڈالتے ہوئے استفار کیا تھا۔

وہ نفی میں سر ہلا کر وضاحتی انداز میں گویا ہوئی تھی۔

”گئی تھی۔ ایکچولی بہت اہم گفتگو چل رہی تھی۔ میں نے سوچا بعد میں کر لوں گی۔ بریرہ نے محض ہنکارا ابھرا جبکہ وہ کسی شوخ میں گم ہونے لگی تھی۔ اس سوچ میں ڈوبے ڈوبے بولی۔

”بالغرض ماما! اگر وہ شادی کے لیے مان جاتیں تو لڑکی کون سی چاہیے بھلا ان کے لیے.....؟“

نحلاب ہونٹوں تلے دبا کر سوال کر رہی تھی۔ بریرہ مسکرا دیں۔

”لڑکیوں کی کمی تھوڑی ہے بیٹے! مل جائے گی جو اللہ نے اس کے نصیب میں لکھی ہوگی۔ ذرا مجھے فریج سے دہی پکڑانا مجھے چاولوں کے مسالے میں دالنا تو بھول گیا مگر راتے میں تو ڈالوں۔

امن نے چپ چاپ فریج کھول کر دہی کا باؤل نکال کر انہیں دے دیا۔

”ارسل ان کی طرح ہونی چاہیے..... ڈینٹ بہت خوبصورت اور سوبر سی..... ہے نا.....؟“

اس نے مسکرا کر تائید کرنا چاہی تھی بریرہ نے اس کے بچگانہ انداز پہ دھیرے سے ہنس پڑی تھیں۔

”خوب سیرت ہونیک ہو۔ شکل و صورت میں ثانوی حیثیت رکھے۔ بس دعا یہ ہے کہ اللہ بچے کا نصیب اچھا کھولے۔ آمین۔“ ان کے انداز میں محبت تھی۔ امن دھیرے سے مسکرا دی۔

”نکرناٹ ماما جانی! اب تک حوصلہ! نصیب اچھا ہی ہوگا۔ اس کے لہجے میں یقین تھا۔ ایک اوتھی سرخوشی تھی جو اس وقت بھی قائم رہ سکتی تھی جب وہ فروٹ کی باسکٹ ٹرے میں رکھے عبدالغنی کے پاس آئی تھی مگر دروازہ کھول کر اندر قدم نہیں رکھ سکی۔ ارسل احمد کی دو ٹوک گھمبیر اور قطعی آواز

نے اس کے قدم جکڑ لیے تھے۔

”ٹھیک ہے انکل! میں آپ کی بہت عزت کرتا ہوں یہی وجہ ہے کہ آپ کو انکار نہیں کر سکا۔ جیسے ماما کو کر دیا یا جیسے ماما جان (بریرہ) کو کر چکا ہوں لیکن شادی کے لیے میری ایک شرط ہے۔ اگر اسے پورا کر دیا جائے تو مجھے ہرگز ہرگز اعتراض نہیں۔“

امن کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ خون کی گردش یکدم تیز تر ہوئی تھی۔ ساعتیں مہ تن گوش۔ کیسی شرط بیٹے.....!“ عبدالغنی کا لہجہ مستقرانہ ہوا پھر نرمی سے گویا ہوئے تھے۔

”شادیاں شرائط کی بنا پر نہیں ہوا کرتیں۔ جوڑے تو آسمان پر بنتے ہیں۔ آپ کو پتا ہے نا.....؟“

”وہ سب ٹھیک ہے انکل! مگر میں کسی لڑکی کی زندگی برباد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ ہاں اگر کوئی معذور خاتون ہوں تو میں راضی ہوں سمجھ لیں۔ اس طرح میں کسی کی مدد کروں گا۔ ویسے تو شاید نا ممکن ہو۔“

امن نے بے ساختہ دل پہ ہاتھ رکھا۔ یوں جیسے خود کو سنبھالا دینا والہا ہو مگر سنبھال ہی نہیں ملا تھا۔ اس کا دماغ ماؤف ہوتا جا رہا تھا۔ جیسے انوکھی فرمائش تھی۔ جس نے اس کی ہر اش نراش بدل دی تھی۔ آنکھوں میں نمی بھر دی تھی۔ وہ وہاں سے پلٹی تو عبدالغنی کو سلام پھر نہیں کر سکی۔ وہ خود کو اس وقت کسی کے بھی سامنے کے قابل نہیں پائی تھی۔

☆.....☆.....☆

وہ کالج سے لوٹی تو گرمی و پسینے سے بے حال تھی۔ جب ہی بیگ اور چادر اتار کر فریش ہونے لگی۔ قدر بستر پہ اوندھی لیٹی۔ ”وس وے مولا تو اکھیاں دے کول کول“ سن رہی تھی اس میں

مگن رہی۔ اٹھنا اس وقت پڑا جب ملازمہ نے آکر مہمان کی آمد کی اطلاع دی۔

”ہائیں.....! اس وقت کون مہمان آ گیا۔“
وہ حیرانی سے اٹھی تھی اور تیز سے باہر لپکی مگر پھر حسب سابق دروازے سے نکلتے دوپٹے کا بھی خیال آ گیا۔ وہاں سے پلٹی اور دوپٹہ گھسیٹتے ہوئے ڈرائنگ روم کی جانب آ گئی۔

ڈرائنگ روم میں عبداللہ خواتین کے درمیان گھرا بیٹھا تھا وہ یکدم ڈھیلی پڑ گئی۔

”آپ کو چین نہیں ہے.....؟ پھر آ گئے۔“
اس نے مسکراہٹ دبائی۔ علیزے نے اسے گھورا تھا۔

”یہ کون سا طریقہ ہے قدر بات کرنے کا؟“
علیزے کے گھر کئے پر وہ مسکراہٹ دبائی۔

”ہمارا تو یہی ہے۔“
”کم آن خالہ جانی! مذاق کر رہی ہے باگڑ

بلی!“ عبداللہ ہنس رہا تھا۔
”اتنی بڑی ہو گئی ہے مگر عقل نہیں آئی ابھی

تک۔“ علیزے کلس کر بڑ بڑائی تھی اس کی تیز سماعتوں نے فقرہ کیچ کر لیا۔ جب ہی موڈ سوا

نیزے پہ جا پہنچا تھا۔
”جی درست فرمایا۔ ساری عقل تو آپ کے

لاڈلے داماد کو جو مل گئی تھی۔ میں نے کرنی جھی کیا تھی۔“

اس نے تڑخ کر کہا اور ایک جھٹکے سے اٹھ گئی۔

”قدر کیا ہو گیا ہے مائی ڈول۔“ بیٹھ جاؤ آرام سے خالہ جانی کی باتوں کا بھی برامانتی ہو تم

..... چیچ چیچ! پتا ہے تمہیں ماما جب تک دن میں میری ایک بار کھچائی نہ کریں۔ مجھے کوئی کمی فیل

ہوتی رہتی ہے۔“ عبداللہ نے ایسے انداز میں کہا

تھا کہ وہ منہ پھلائے سہی مگر بیٹھ گئی تھی۔ مگر ہماری والدہ ماجدہ کو کوئی کام نہیں ہے ان سے تو اچھی

ممائی ہیں کم از کم کچھ کہتی تو نہیں ہیں.....“
اس نے نخوت سے کہتے آخر میں شکر گزار

ممنون نظروں سے لاریب کو دیکھا تھا۔ جو مسکراہٹ دبا رہی تھیں۔ ”مگر واضح رہے کہ یہ بھی

ماں تو تمہارے ماما کے لاڈلے داماد کی ہیں یعنی مخالف پارٹی ہی ہے۔“

اب کے عبداللہ نے شرارت ہی کی تھی مگر اس کا موڈ خوشگوار ہو گیا تھا۔ جیہی بے ساختہ کھلکھلائی

تھی۔
”انہیں مجبوراً سہی مگر مجھ سے بنا کر رکھنی

پڑے گی۔ ان کے بیٹے کو اپنی مٹھی میں جو کر لوں گی میں۔“ لاریب کے گلے میں بازو جمائل کیے اس

کی شرارت نقطہ عروج پر جا پہنچی تھی۔ لاریب نے بے ساختہ ہوتے ہوئے اسے لپٹا کر گال چوم لیا۔

”ہمیں اتنا ہی اطمینان اور خوشی حاصل ہوگی جتنا تم اسے اپنی مٹھی میں مضبوطی سے سنبھال کر رکھو گی۔“

اس جواب پہ عبداللہ نے بے اختیار قہقہہ لگایا۔ جبکہ علیزے گہرا سانس بھر کے رہ گئیں۔

”آج کل کے بچوں میں حیا نام کو بھی نہیں رہ گئی۔ یہی سوچ رہی ہیں نا خالہ جانی۔“

عبداللہ کا اندزے طرح شوخ و شریر تھا۔ علیزے جو با محبت آمیز لہجے میں مسکرائی تھی۔

”آپ جتنی بے شرم تو نہیں ہوں بہر حال!“
قدر نے ناک سکوڑی۔ عبداللہ اسے باقاعدہ

گھورنے لگا۔
”ایسے کون سے ستم یا غضب ڈھا دیے ہیں

میں نے جو تم یہ بات کہہ رہی ہو۔“
”اب میرا منہ نہ کھلے تو اچھا ہے۔“ وہ

”کون آیا ہوا ہے جو سب ڈرائنگ روم کے ہو گئے.....؟ امی جان بھی چائے بنا کر لے گئیں ہیں۔“

اتباع کے سوال پر قدر نے شانے جھٹک دیے تھے۔ انداز قطعی لاعلمی کا تھا۔ جب ہی اتباع کی حیرت فطری تھی۔

”کیا مطلب.....؟ تم وہیں سے تو نکلی ہو پھر بھی نہیں پتا.....؟“ استعجاب کا یہ تاثر اس کی کشادہ سحر آفریں آنکھوں کو کچھ اور بھی دلنشین بنا کر دکھانے لگا۔

”بھئی میں تو دیکھ بھی چکی اور مل بھی۔ اب تم جا کے خود مل لو۔ قدر پہ شرارت سوار تھی۔ جب ہی اسے ایک دم سے دروازے کی جان دھکا دے ڈالا۔ وہ اس حملے کے لیے قطعی تیار نہیں تھی۔ جب ہی لڑکھڑا کر دروازے سے نکلتے عبداللہ نے اس طرح ٹکراتی کہ باقاعدہ اس کے سینے سے جا لگی۔ حواس بحال کیا ہوتے الثانیہ خطا ہو گئے۔ اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی وہ جیسے کرنٹ کھانے کے انداز میں سرعت سے پیچھے ہٹی تھی۔ ابھی سنبھلی بھی نہیں تھی کہ عبداللہ کا شوخ فقرہ اسے بھک سے اڑا کر رکھ گیا۔“

”بھینکس اے لاٹ مائی سویٹ ڈیر سٹ وائف! استقبال کا یہ انداز مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔“

اتباع جو اسے رو برو پا کر ہی شرم سے کٹ مری تھی۔ اس معنی خیز فقرے سے تو چہرے پی ایسی متمتاہٹ بھری کہ پورا وجود بھاپ چھوڑنے لگا۔ خجالت سب کی توہین کا شدید احساس اس کی آنکھوں میں نمی سی بھرنے لگا۔

کچھ کہے بغیر وہ ایک جھٹکے سے پلٹ جانا چاہتی تھی کہ عبداللہ نے سرعت سے بڑھ کر اس کا

آنکھیں نچا کر چڑانے کو بولی۔ اس سے قبل عبداللہ کچھ بولتا عبیر چائے لے آئی تھیں۔“ عبداللہ احتراماً اٹھ کھڑا ہوا۔

”ممائی جان.....!“ اس نے اپنا سر ان کے سامنے جھکایا تھا۔ عبیر کا اسے دعا دینے پیار کرنے کا انداز والہانہ تھا۔

بے حد شفقت آمیز۔

”اکلوتا لا ڈلا دامادا!“ اس نے نچلا ہونٹ دبا کر گویا عبداللہ کو ہی چھیڑا۔ وہ بھی کون سا کم تھا۔ گردن مزید اگڑا کر بیٹھ گیا۔

”جس خوش فہمی یا آس میں مبتلا ہو کر یہاں تک تشریف لائے ہیں نا..... وہ نہیں پورا ہونے والا۔“

اس نے ہری جھنڈی دکھانی ضروری خیال کی۔ عبداللہ نے شانے اچکا دیے تھے۔

”آپ کو خبر نہیں ہے شاید..... ہم نے ہارنا نہیں سیکھا۔ وہ سپاہی نہیں ہیں۔ جو میدان جنگ میں ناکامی سے دوچار ہوتے ہیں۔“

افوہ..... بڑی خوش فہمیاں لاحق ہیں لوگوں کو۔“ قدر خود چڑگئی تھی اسے چڑانے کی کوشش میں۔

”اللہ کا ہی احسان ہے ہم نے کبھی غرور نہیں کیا۔“ اس کی بے نیازی اور لا تعلقی دیکھنے والی تھی۔

”بیٹے کہاں جا رہی ہو.....؟ چائے تو لو۔“

عبیر نے اسے اٹھتے پا کر ٹوکا۔ قدر جاتے جاتے مڑی اور نرمی سے مسکرا دی۔

”طلب نہیں ہے ممائی جان کچھ دیر قبل ہی پی تھی میں نے۔“ عبیر نے آمادگی سے سر ہلا دیا تو وہ عبداللہ پہ مسکراہٹ اچھالتی خود باہر آگئی۔ پہلے ہی مرحلے میں اتباع سے سامنا ہو گیا۔

روک نہیں سکیں گی۔ لیکن یہ آپ کو اچھا تو ہرگز نہیں لگے گا بہتر ہے آپ میری بات سن لیں۔“
مدھم باری آواز مگر کسی حد تک نجی آمیز انداز میں کہتا وہ اس کے پیچھے آ رہا تھا۔ اتباع کو جیسے جھٹکا لگا۔

اس نے جیسے صدمے میں گھرے پلٹ کر دھند آلود نظروں سے اسے دیکھا تھا۔

”آپ مجھے دھمکی دے رہے ہیں.....؟“ وہ ششدر تھی یا صدمہ سے چور عبداللہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ البتہ اس کے بدگمان انداز سے ضرور دل برداشتہ ہوا تھا۔

”آپ خفا تھیں میں صرف آپ کو منانا چاہتا تھا ایک سیو ز کرنے آیا تھا۔“ وہ ہرٹ ہوتا ہوا بولا۔ مگر اتباع کے تاثرات میں ہرگز کوئی تبدیلی کوئی نرمی نہیں اتری۔

”مجھے آپ سے زیادہ کچھ نہیں کہنا عبداللہ صاحب! سوائے اس کے کہ..... دل میں اترنے اور دل سے اترنے میں بظاہر ایک الفاظ کا ہیر پھیر ہے لیکن اس کا اثر..... اس کا دائرہ عمل اس کا تسلط کتنا وعیش کتنا گھمبیر ہے۔“

کوئی سمجھ نہیں سکتا۔ سو بی کیئر فل۔“ وہ جتنی سنجیدہ تھی عبداللہ نے اس قدر شرارت سے اسے دیکھا تھا پھر مسکراہٹ دبا کر بولا۔

کتنے سلجھے ہوئے طریقے سے مجھ کو الجھن میں ڈال دیتے ہو ”کبھی یہ سوچا ہے تم نے..... میری جان! دھان پان!“

اپنی بات کا اثر دیکھ کر اتباع کا دل شدت سے چاہا تھا اس کا نہیں تو اپنا ضرور سر پیٹ لے۔ حد تقی یعنی لے حسی یا پھر لا پرواہی کی بھی۔ اس کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھرنے لگی

راستہ روک دیا۔

”اتباع! کیوں پریشان ہو گئی ہیں اتنا! یار ہرگز کوئی گناہ سرزد نہیں ہوا آپ سے۔ بلکہ آپ کو ہی یہ شرعی حق حاصل ہے صرف۔“

بظاہر سنجیدگی سے کہتا وہ مسکراہٹ ہونٹوں میں دبا رہا تھا اس پر قدر کی کھی کھی۔ اتباع کے چہرے کے ساتھ آنکھیں بھی جلنے لگیں۔

”قدر نے دھکا دیا تھا تو میں۔“ وہ سخت روہانسی ہو چکی تھی وضاحت کیے بغیر رہ نہ سکی۔ اپنا وقار، اپنی عزت نفس اور پندار اتنا ہی عزیز تھا اسے۔ سامنے بھلے اس کا شرعی و قانونی حقدار تھا مگر وہ پھر بھی اپنا دامن داغدار ہوتا برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ عبداللہ کا مستعم لہجہ..... شوخ بہکا بہکا انداز اسے جزبز کر رہا تھا۔

”بروقت دیا تھا۔ درست دیا تھا۔ میں تو قدر کا شکر گزار ہوں۔“

عبداللہ ہلکے سے ہنستا برجستہ کہہ گیا۔ انداز ہنوز شریر قسم کا تھا۔ اتباع نے بے بس خفا نظروں سے اُسے دیکھا اور ایک جھٹکے سے پلٹ گئی۔

اسے کبھی لگتا تھا عبداللہ کو اس کی نہیں بس اپنی پرواہ ہے۔ وہ صرف وہ کرے گا جو وہ خود چاہتا ہے۔ اس وقت بھی اسے بے مائیگی کے احساس نے چھوا تھا۔ جبکہ عبداللہ اس کے احساسات سے بے خبر تھا اس خفگی کو مٹانے میں کوشاں جو اس فون کال کے بعد سے چل رہی تھی کہ وہ اس سے بات کرنے پر آمادہ نہیں تھی۔ مجبوراً عبداللہ کو یہاں آنا پڑا تھا۔ روبرو معاملہ کلیئر کرنے کو۔ لیکن اس کے انداز ہنوز تھے۔ عبداللہ کو خفیف سی سہی مگر جھنجھلاہٹ نے گھیر لیا تھا۔

”اتباع.....! اتباع!! بات سنیں میری ورنہ میں آپ کے کمرے تک آ جاؤں گا اور آپ مجھے

تھیں۔ اس غفلت و خود پسندی پہ..... جب ہی مجھے نہ چاہتے ہوئے بھی پھر نصیحت کا دامن پکڑا۔
 ”اپنی نگاہوں کو سنبھال کر رکھنا، زبان کو بے مقصد فضول باتوں سے بچانا، پیشانی کو سجدوں سے آراستہ کرنا، نفس کی شرارتوں سے دل کو بچا کر رکھنا اور ذکر الہی میں زبان مشغول رکھنا ہر طالب صادق مومن کی پونجھی ہے میں آپ میں یہی خوبیاں دیکھنے کی متنی ہوں عبداللہ!“

اس کے لہجے و انداز میں جیسے کوئی التجا تھی۔ منت تھی۔ عبداللہ نے گہرا طویل سانس بھرا تھا۔ پھر جواباً سے سنجیدگی سے دیکھنے لگا۔

”مجھے بھی آپ سے ایک بات کہنی ہے غور کیجئے گا پلیز۔“ اس نے عاجزی سے کہتے ڈرا سا توقف کیا۔ پھر گلا کھنکار کر بے حد سنجیدگی سے گویا ہوا۔

”جب تک طالب و مطلوب، عاشق و معشوق، محبت و محبوب الونست کے رنگ میں رنگے نہ جائیں اور کسی ایک کو دوسرے کی گود نصیب نہ ہو تب تک زندگی مکمل نہیں ہوتی۔ گود نصیب ہونا کاملیت کی شرط اول ہے گود میں سونے کی خواہش ہر خواہش پہ شدت غلبہ رکھتی ہے۔ سنا ہے ماں محبوب اور مرقد کی گود بڑی گداز ہوتی ہے سونے کا سواد آ جاتا ہے۔ حشر تک پڑے رہنے کو جی چاہتا ہے۔ ماں کی گود کا ذائقہ ابھی تک یاد ہے۔ مرقد کا تجربہ ابھی کرنا نہیں چاہتا رہ گئیں آپ..... ارشاد فرمائیے کب تک یہ عنایت ہوگی۔“

اپنی کہہ کر وہ پوری شدتوں سے جواب کا منتظر ہوا تھا جبکہ اتباع کا تو وہ حال کہ زمین بھی اندر نہیں سماتی تھی۔

بے حجابی اور گستاخی کا ایسا مظاہرہ اس شخص

سے کیا جس سکتا تھا کوئی اچھی امید رکھنا ہی شاید عبث تھا۔ وہ وہ جھلستی ہوئی وہاں سے گئی تھی۔ عبداللہ نے گہرا سانس بھرا اور کپٹی کھجائی۔
 کیا طبیعت تھی کسی راہ پر ڈالی نہ گئی
 کٹ گئی عمر مگر خام خیالی نہ گئی

انداز آہ بھرنے والا تھا۔ جس میں حصہ قدر نے بھی سرد آہیں بھر کے ڈالا اور دانت نکالنے لگی۔

”ہو گئی تسلی.....؟ یا پھر یہ کہنا چاہیے کراہی عزت میں برکت۔“ اس کی مسکراہٹ انہی کی جان مائل تھی۔

”جاسوس.....! باتیں سن رہی تھی تم چھپ کے۔ وہ ذرا سا خفیف ہوا۔

”میں نے سوچا آپ کو تمنغے پہناتے جا رہے ہوں گے میں بھی یہ نظارہ دیکھ لوں اس نے پھر دانت نکالے۔ عبداللہ نے کاندے اچکا دیے تھے۔ اس کے قدم اب بیرونی حصے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ قدر ہمراہ تھی۔

ادا تھری تے میں منہ زور

میں اپنی مرضی دامالک

تے اوانے توڑنی نہیں اپنی ٹور

”یعنی طے ہوا کہ زندگی ہونہی تمام ہونی ہے۔“ عبداللہ کی گنگناہٹ سے جو نتیجہ قدر نے اخذ کیا اس کے مطابق یہ سوال کیا تھا مگر خاصی شرارت سے۔

”شیر اور بلی کی لڑائی میں فتح کس کو حاصل ہوتی ہے.....؟ ڈیفینیشنلی شیر کو..... سو ڈونٹ یو وری مائی سس! ہم تمہاری نند صاحبہ کو فتح کر لیں گے۔ بس تھوڑا ٹائم دے رہے ہیں صورتحال یہی رہی تو پھر یہ ڈیل ختم.....“

اس نے چٹکی بجائی تھی۔ قدر نے آنکھیں گھما

کرا سے دیکھا۔

”میں یہ سارے ارادے بتا دوں گی اتباع کو..... غلط نہیں ہے کہ آپ کے ساتھ ہوں میں۔“

”فکر ناٹ۔ شیر سازشوں سے نہیں اپنی طاقت سے جیتتا ہے تم کرو جو کرنا چاہتی ہو۔ اپنی تند اور میری ڈیر سٹ وائف کو میرا سلام کہہ دینا۔ گڈ بائے۔“

گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ ہاتھ ہلاتا چلا گیا۔ قدر کے چہرے پر موجود مسکان اس گاڑی کو گیٹ سے نکلتے پا کر سکڑتے سکڑتے بالکل ختم ہو گئی تھی۔ وہ ایک بار پھر اتباع کی خوش بختی اور اپنی بے مائیگ پہ سوچ رہی تھی کڑھ رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

عبدل ہادی اور علیزے کو اچانک واپس جانا پڑ گیا تھا۔ وہ یہیں تھی اور موڈ خاصا خراب تھا۔ علیزے کو اس نے دھمکیاں بھی اچھی خاصی دی تھیں کہ اگر اس کا پڑھائی میں دل نہ لگا یا سمعیہ کے گھر والے نہ مانے تو لازمی وہ سب کچھ چھوڑ کر خود بھی آجائے گی ان کے پیچھے۔ وغیرہ۔

”عجیب بات ہے لوگ میدان چھوڑ کر بھاگ رہے ہیں۔ حالانکہ یاد ہو تو تمہارا ہی اپنا زریں قول تھا کہ تم نے دل اس گھر میں اور سب سے بڑھ کر میرے بھائی سے لگانا ہے۔“

اتباع نے محض اس وقت اس کا موڈ بحال کرنے کو اسے چھیڑا تھا۔ خلاف عادت، خلاف معمول مگر یہ کوشش کوئی اتنی زیادہ کامیابی سے ہمکنار نہیں ہو سکی تھی۔ کہ وہ بجائے بہلنے کے مزید افسردہ ہونے لگی۔

”میں جتنی بھی کوشش کر لوں ناکام ہی رہوں گی۔ وجہ محترم کو مجھ میں دلچسپی نہیں ہے۔“

اس کا لہجہ و انداز بجا ہوا پا کر علیزے نے

تڑپ کر اسے ساتھ لگا لیا تھا۔

”ایسا نہیں کہتے بیٹے! عبدالعلی ذرا الگ مزاج کا ہے۔ لیکن حقوق کی پاسداری سے آگاہ ہے۔“

”تو اور کیا..... ابھی صرف نکاح ہوا ہے ناں..... شادی تو ہونے دو تمہارے سارے گلے شکوے دھو ڈالیں گے میرے بھائی.....! اتنا پیار دیں گے تمہیں۔“

اتباع نے بھی علیزے کی ہاں میں ہاں ملائی تھی مگر اس کا ملال تھا کہ پھر بھی نہیں ڈھل رہا تھا۔

”رشتہ تو جائز ہے نا یہ بھی۔ شادی اور نکاح میں ویسے بھی اتنا فرق نہیں ہوتا۔ جنہوں نے اہمیت یا محبت دینی ہو..... وہ منگنی کے بعد بھی دے دیتے ہیں۔ مجھے تو سچی بات ہے اپنا مستقبل بہت تاریک نظر آتا ہے۔“ وہ روہاکی ہو رہی تھی۔ علیزے نے بے اختیار اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”.....) کرے میری بیٹی! اللہ تمہیں دنیا کی ساری خوشیاں عطا فرمائے۔ اگر کبھی تمہاری آنکھ میں نمی دیکھوں کسی دکھ کی اس سے پہلے موت آجائے مجھے۔“

علیزے کا لہجہ بھیگ رہا تھا۔ آواز رقت آمیز تھی ماحول بہت زیادہ جذباتی ہو چکا تھا۔

جب عبدالعلی نے کھنکار کر اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔

”بو جانی! کس کی باتوں میں آرہی ہیں آپ بھی۔ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں آجائیے۔ انکل باہر منتظر ہیں آپ کے۔ بابا جان بھی وہیں ہیں۔“

قدر پہ سرد نگاہ ڈالتا ہوا وہ بے حد خشک انداز میں بات کر رہا تھا۔ قدر کس حد تک خفیف ہو چکی

تھی یہ سوچ کر اللہ جانے وہ کیا کچھ چن چکا ہے۔
عجیب سی بے چینی نے اس کا گھیراؤ کر لیا۔

(لو..... محترم اب خود کو کلف زدہ محسوس کرنے لگیں گے کہ لڑکی تو مری جاتی ہے خود ہی) اسے اپنے اوپر بھی غصہ آیا تھا۔

”ادا اس ہو.....؟“ اتباع نے چائے کا گم اس کے سامنے کرتے ہوئے اسے مخاطب کیا۔ قدر طویل سانس کھینچتی سیدھی ہو بیٹھی۔

ہم زخم کی آغوش میں ہے درد تمہارا
ہر درد کی تسکین کا احساس بھی تم ہو

اس کے اندر میں کیا کچھ نہ تھا۔ شکایت، رنج غصہ الم، اتباع کو اس پر ترس آیا۔

”کیوں سوچتی ہو اتنا.....؟ اور اگر سمجھتی ہو کہ مسئلہ حل بنا کر ڈسکس کر کے ہو سکتا ہے تو ضرور کر لو۔“

اتباع نے مخلصانہ مشورہ دیا تھا۔

”ایسا نہیں کر سکتی مر کے بھی کہ.....“

میں لڑکی مشرق ٹھہری

اصولوں میں کڑی ٹھہری

مجھے جس سے محبت ہے

مجھے اس سے چھپانا ہے

”تو پھر صبر کر لو، وقت کا انتظار کرو۔ اللہ بہتر

پھل دے گا صبر کا۔“ اتباع نے حسب عادت نصیحت کی تھی۔

”تمہیں کیا پتا..... حالات ایسے ہیں کہ صبر

نہیں ہو رہا۔ ویسے بھی اک شک دن رات ڈستا ہے مجھے۔“

اس کا اضطراب اس کی آنکھوں میں اتر آیا

تھا۔ اتباع نے چونک کر اسے بغور دیکھا۔

”کیسا شک.....؟“ وہ حیران تھی۔

”علی کسی اور سے محبت کر سکتے ہیں بلکہ مجھے

یقین ہے۔“ وہ خلا میں گھور رہی تھی۔ اتباع نے تاسف سے سر جھٹکا اور خود کو اس تناؤ سے آزاد کرتے ڈھیلا چھوڑ دیا۔

”بے وقوف ہو تم ایسا کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ

بس ریزرو ہیں۔ تم جیسی منکوحہ کو انور کرتے ہیں تو

کسی اور کو کیسے پسند کر سکتے ہیں.....؟“ اتباع نے

گو کہ بھائی کی حمایت نہیں کی تھی۔ اس کے باوجود

اس وضاحت پہ قدر کو ناگواریت نے آن کیا تھا۔

”اس بات کو تو مانو گی نا تم کہ اگر سامنے

بہترین چوائس ہو تو محبت و پسند پہ بھی اختیار نہیں

رہتا۔“

اس کا لہجہ سلگتا ہوا تھا۔ رقابت کی آنچ میں

جھلسا ہوا۔ اب کی بار یقین ایسا تھا کہ اتباع بھی

ٹھٹھک گئی۔

”کسی پہ شک ہے تمہیں.....؟“ اس کا انداز

بے چینی سموتے ہوئے تھا۔ قدر نے ہونٹ بھینچ

لیے۔

”امن..... امن کو پسند کرتے ہیں وہ۔“ اس

کا لہجہ دکھ کی شدتوں سے بھینچا ہوا تھا۔ اتباع سرد

ٹھنڈا سانس بھر کے متاسفانہ انداز میں سر جھٹکنے

لگی۔

”مجھے حیرت ہے اتنی بے ضرر اور معصوم لڑکی

کو تم ایسے شک کا نشانہ بنا رہی ہو۔“ اتباع کو

بہر حال اچھا نہیں لگا تھا امن کے حوالے سے یہ

سننا۔ قدر کو اس قدر آگ لگی۔

”ہاں ہاں تم میرا کیوں یقین کرو گی۔ ایک

تمہاری بہترین دوست ہے دوسرا تمہارا بھائی۔

میں کون ہوتی ہوں جو تمہیں میرا اعتبار ہو۔ ویسے

بھی اطلاعاً عرض ہے کہ میں قصور وار امن کو نہیں

تمہارے بھائی کو ٹھہرا رہی ہوں سمجھیں.....؟“

آگ بگولا ہوتی کہہ کر وہ گم پنچ کر وہاں

سے تن فن کرتی چلی گئی۔ اتباع سر تھام کر بیٹھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اتباع کالج جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی۔ اسے ہنوز سوتے پا کر کئی بار آواز دی مگر وہ جاگتے ہوئے بھی سونے کا تاثر دیتی۔ ساکت و سامن پڑی رہی۔ اتباع نے اسے سوتا جان کر لائیں اور دروازہ بند کر دیا تھا اور خود چلی گئی تھی۔ کمرے میں تنہا رہ جانے کا خیال آزادی کا تھا۔ اس کے اکے ہوتے آنسو پھر سے بہہ نکلے۔ آنکھیں جل رہ تھیں۔ وہ ہر تکلیف دہ یاد کو جھٹک دینا چاہتی تھی مگر یہی بے بسی تھی۔ کامیابی نہیں تھی۔ کتنا سمجھایا تھا اتباع نے امن کے حوالے سے یقین بھی دلایا تھا اور عبدالعلی کے متعلق بھی یقین دہانی کرائی تھی مگر اس کا غصہ اور تلخی تھی کہ ختم نہ ہو رہی تھی۔ ہوتا ہے نا ملکیت کا استحقاق کا احساس جو ایسا مان اندر پیدا کرتا ہے جس کا شاید خود بھی ادراک نہیں ہوتا۔

یہی مان اسے کل عبدالعلی کے کمرے تک لے گیا تھا۔ اب یہ اس کی قسمت تھی کہ وہ پہلے ہی کسی معالے پہ برہم تھا یا پھر اسے روبرو پا کے یہ طیش اٹھ آیا تھا۔ وہ سمجھ نہیں سکی تھی۔ آہٹ پر گردن موڑنے پہ اسے روبرو پا کے وہ یکدم کتنا مشکل ہو گیا تھا۔

”کیوں آئی ہو تم.....؟“ اس کا انداز جھڑکنے والا تھا۔ مگر قد خائف نہیں ہوئی تھی وہ فیصلہ کر چکی تھی بات کرنے کا تو اسے کرنی تھی۔

آپ ممانی جان کو بلا رہے تھے۔ میں یہاں سے گزر رہی تھی تو.....“

”ہاں مگر انہیں تمہیں نہیں۔ تم جاؤ۔ وہ پتا نہیں کیوں اتنا بے لحاظ ہو رہا تھا۔

قدر کو برا تو لگا مگر برداشت کر گئی۔

”کپڑے استری کرانے ہیں؟ لائیں ہیں.....؟“

عبدالعلی نے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے اپنے کپڑے جھپٹ لیے ساتھ ہی اسے خفیف سا جھٹکا بھی دیا تھا۔

”تمہیں سمجھ نہیں آرہی ہے..... میں کیا کہہ رہا ہوں.....؟ جاؤ یہاں سے۔“ وہ دبے ہوئے الفاظ میں چیخا۔ قدر نے جواب اس کی آنکھوں میں اپنی سر د نظریں گاڑھ دیں۔

”نہیں آرہی ہے سمجھ۔ اور نہ میں یہاں سے جاؤ گی۔ آپ بھی تجھیے.....؟“ عبدالعلی ایک لمحے کو اس کی جرات اس کی ڈھٹائی پہ حیران رہ گیا۔ پھر ہونٹ سکڑ کر بے حد حقارت سے واضح کرتا ہوا بولا تھا۔

”میں جانتا ہو یہ سب تم کس زعم میں کر رہی ہو۔ مگر میں تمہیں بتا چکا ہوں۔ مجھے بے باک لڑکیاں پسند نہیں ہیں۔“ وہ اس کے سامنے کھڑا کہہ رہا تھا۔ قدر کا رنگ ایکدم پھیکا پڑ گیا۔ آنکھوں میں کتنے طوفان آنسوؤں کے مچلے وہ سکتے میں آگئی تھی۔

کچھ دیر اس سکتے میں اس دیکھتی رہی۔ پھر یہ سکتہ ٹوٹا اور اس پر غم کا پہاڑ ٹوٹ گیا تھا گویا۔” میں جانتی ہوں میں یہ بھی جانتی ہوں آپ کو کیسی لڑکی پسند ہے۔ اور وہ کون ہے..... میں یہ بھی جانتی ہوں میں کسی بہت غلط فہمی کا شکار تھی کہ میں اپنی محبتوں سے جیت لوں گی آپ کو مگر.....“

اس نے بات ادھوری چھوڑ دی اور منہ پر ہاتھ رکھے سسکیاں دباتی پلٹ کر بھاگی تو آنکھوں سے ٹوٹتے آنسو انتہائی بے مانگی کا شکار ہوتے اس کی قدموں میں بکھرتے رہے تھے۔ کمرے میں آ کر اس کے آنسوؤں میں شدت آنے لگی

تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا مار ڈالے خود کو تاکہ پھر کبھی ایسا عظیم دکھ نہ سہنے کو ملے۔

کتنا بڑا المیہ تھا۔ زندگی میں جن لوگوں سے ہم محبت کرتے ہیں دکھ بھی انہی سے ملتے ہیں کیوں کہ غیروں کی بات جتنا بھی دل کو لگے مگر اپنوں کی بات تو دل پہ لگتی ہے شگاف ڈال جاتی ہے۔ وہ مسلسل سکے جاتی تھی۔ ذہن میں اسی نظم کی بازگشت ہونے لگی جو آج کل اسے بالخصوص یاد ہو گئی تھی۔

ہم ہیں سوکھے ہوتے تالاب یہ بیٹھے ہوتے ہیں جو تعلق کو نبھاتے ہوئے مرجاتے ہیں گھر پہنچتا ہے کوئی اور ہمارے جیسا ہم تیرے شہر سے جاتے ہوئے مرجاتے ہیں یہ محبت کی کہانی نہیں مرتی لیکن لوگ کروار نبھاتے ہوئے مرجاتے ہیں اس نے کروٹ بدل کر آستین سے بھگا چہرا رگڑا۔ اور آہ بھری۔ (پتا نہیں میں کیوں پتھر سے سر پھوڑ رہی ہوں اس شخص کو حالانکہ فرق نہیں پڑنے والا)

اس کی مایوسی دلگیری اور اداس کا کوئی انسٹ نہیں رہا تھا۔ ذہن مکمل طور پر ماؤف تھا۔ دوسری جانب عبدالعلی تھا۔ عجیب سے اضطراب الجھن اور جھنجھلاہٹ کا شکار..... جتنا غصہ تھا اس پر وہ تو اتار لیا تھا مگر اب سکون بھی نہیں تھا۔

وہ پتا نہیں عجلت پسند تھا یا وہ واقعی اتنی غلط تھی۔ حالانکہ عبدالغنی نے اسے سمجھایا بھی تھا۔

”بیٹے تحمل کو اپنے مزاج کا حصہ بناؤ ورنہ یاد رکھو..... جو جلد بازی کرے گا وہ ضرور پھسلے گا۔“ یہ نصیحت انہوں نے اس وقت کی تھی اس نے جب قدر کی اس حرکت پہ اسے برہم ہوتے پایا تھا۔ تو معمول کی بات تھی۔

قدر کا انداز اس کا طریقہ ہی یہی تھا۔ پھر بھی پتا نہیں اس پہ اتنا غصہ کیوں آ گیا تھا۔ کل اسد (اسامہ کا چھوٹا بیٹا) ان کے گھر آیا تھا۔ عبدالعلی اسے لاریب کے پاس ہال کمرے میں ہی لے آیا۔ اس کے گمان تک بھی یہ بات نہیں تھی۔ قدر وہیں ہوگی۔ ہاتھ میں ریموٹ کنٹرول..... ہال کھلے ہوئے دوپٹے حسب معمول ندارد..... عبدالعلی نے اندر ناگواری دہاتے ہوئے کھنکار کر گویا اسے الرٹ کرنا چاہتا تھا مگر وہ پوری طرح ٹی وی کی سمت متوجہ تھی۔ عبدالعلی کے جزبہ ہونے کی ایک وجہ اسد کا لاریب سے گفتگو کے دوران دلچسپی سے ایک ٹک قدر کو دکھنا چاہا۔ اور اس کی نظریں بہر حال ایک مرد کی ہی نظر ہی تھیں۔ عبدالعلی کو اسد پہ جو غصہ آیا سو آیا۔ قدر پہ اسے شدید طیش آ رہا تھا ایک غیر مرد کمرے میں آچکا تھا۔ اسے مجال ہے کوئی فرق پڑا ہو۔ ایک لڑکی کو یہ لاتعلقی بے نیازی اور ماحول و خود سے یہ بے پرواہی سوٹ نہیں کرتی تھی۔

”قدر.....! تمہیں آپ چائے بنا کر لائیں۔“ عبدالعلی کے ضبط کا پیمانہ چھلکا تو اس بہانے سے وہاں سے ٹر خانے پہ تل گیا۔ وہ بھی کسی دھیٹ مٹی سے بنی تھی یا پھر واقعی اس حد تک محو تھی ٹی وی میں کہ اثر نہیں کیا۔

”میں کب سے چائے بنانے لگی۔ مجھے تو ڈھنگ سے آٹی بھی نہیں۔ اتباع یا چھوٹی ممانی جان کو کہیں۔“

ریموٹ سے ٹی وی کی آواز بڑھاتے ہوئے اس نے جتنی سادگی و معصومیت سے کہا تھا وہ ہرگز ہرگز بھی عبدالعلی کو اتنی سادہ لگی تھی نہ معصوم اور عبدالعلی اس پر لعنت بھیج کر خود وہاں سے چلا گیا تھا۔ مگر یہ خفگی اسد کے جانے کے بعد لاریب کے

چل رہا ہے۔ عبدل احد کے ساتھ کل کرکٹ کھیل رہی تھی۔ پورے گھر میں اچھلتی پھرتی رہتی ہے۔ آپ بتائیں کیا کیا برداشت کروں اور کس حد تک.....؟“

سامنے پوری طرح کھل گئی تھی۔
”اے فی الفور اس کے گھر بھیجیں اماں! میں نے بتا دیا ہے ورنہ کسی دن جو اس کی حرکتیں ہیں ضائع ہو جائے گی میرے ہاتھوں سے۔“
اور لاریب اس کے طیش کے سامنے گھبرانے پوکھلانے لگی تھیں مگر اس کے باوجود سرزش ضروری سمجھی۔

”عبدالعلی بیٹے اتنا غصہ.....“
”آپ کو بھی یہی ایک ملی تھی میرا نصیب پھوڑنے کے لیے۔ انداز ملاحظہ کرتی ہیں آپ اس کے.....“

وہ دکھ اور صدمے کے ساتھ ساتھ غیض و غضب سے بھی شل ہوا جاتا تھا۔

”عبدالعلی چپ ہو جائیں، آپ حد سے بڑھ رہے ہیں۔ لاریب نے زور سے جھڑکا تو جو ابنا وہ سرخ آنکھوں کو جھکا کر گہرے گہرے سانس بھرنے لگا تھا۔

”ابھی بچی ہے وہ۔ وقت کے ساتھ عقل آجائے گی۔ ڈنڈا کبھی کسی کو نہیں سدھارتا۔ پیار سے ڈیل کرنا پڑتا ہے۔“

”یہ خوب کہی کہ آپ نے کہ بچی ہے ابھی..... اتباع اور امن سے کوئی سالوں کے حساب سے تو چھوٹی نہیں وہ..... ہے وہ ان جیسی.....؟“

عبدالعلی سخت برا فروختہ تھا۔ لاریب ایک لمحے کو لا جواب ہوئیں۔

”بیٹے ہر کسی کا مزاج الگ ہوتا ہے۔“
انہوں نے عاجزی سے سمجھانا چاہا۔

”آپ کے سامنے کئی مرتبہ سمجھا چکا ہوں اے کہ مجھے اس کا مردوں سے فری ہونا پسند نہیں۔ عبداللہ ہے تو اس سے ہر قسم کا ہنسی مذاق

”آپ نے اُسے سمجھایا ہوتا.....“ لاریب نے بات کاٹی تو عبدالعلی اس قدر شاکی نظر آنے لگا اور جیسے اس نتیجے پہ پہنچا کہ یہ بحث لا حاصل ہے۔ جب ہی ہونٹ بیچھے وہاں سے چلا جانا چاہتا تھا کہ لاریب نے بے اختیار محبت سے اس کا بازو پکڑ کر اپنے قریب بٹھالیا۔ کچھ دیر اُسے محبت سے دیکھتی رہیں پھر نرمی سے مسکرا دیں۔

”زیادہ عرصہ نہیں بیٹا مجھے تو لگتا ہی نہیں ہے کل کی بات ہو جیسے..... گول مٹول پیارا سا بچہ اپنے ذہانت سے بھرپور سوالوں سے اپنی ماں کی ذہنی صلاحیتیں پر کھتا رہتا تھا۔ میں تو شاید ہی اُسے مطمئن کر پاتی۔ ہاں البتہ اس کے ذہن و قطنین بابا جان ضرور چٹکیوں میں مسئلہ حل کر دیا کرتے تھے۔

وہ ان جیسا ہی بننا چاہتا تھا۔ ویسا نا بھی ہے ماشاء اللہ! وہی قد قامت وہی خوب روئی و وجاہت مگر بیٹے تمہارے بابا جان کی سب سے بڑی خوبی جو اللہ نے انہیں وافر مقدار میں عطا فرمائی ہے پتا ہے کیا ہے.....؟ ان کا تحمل، ان کی بردباری اور ہر قسم کے حالات میں کیا گیا ضبط..... جو ہر کسی کو ان کا گرویدہ بنا جاتا ہے۔ میں چاہتی ہوں میرا بیٹا بھی ویسا بنے۔ آمین یہاں بس ایک بات کہوں گی۔ چاہتی ہوں تم اسے ساتھ رکھو عمر بھر اور وہ یہ ہے کہ..... رویے دائمی ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کے لیے اپنا اثر چھوڑ جاتے ہیں، رویہ ایسا رکھو کہ لوگ اچھے لفظوں میں یاد رکھیں۔ برے میں نہیں۔“

انہوں نے اس کا کاندھا تھپکا تھا۔ وہ محض ان کی تسلی کی خاطر مسکرایا مگر دل اس وقت ہی ٹھنڈا

چاہیے تھا مگر وہ تو اس سے کہیں زیادہ غصے میں تھا۔ جذبات میں بھڑک رہا تھا جب ہی معاملہ بجائے سنبھلنے کے بگاڑ کی طرف جانے لگا۔

”مرنے کا اتنا شوق ہے تو کوئی اور طریقہ تلاش کرو جس سے فوری نتیجہ ظاہر ہو یہ اتنا بیدف بہر حال نہیں ہے۔“

وہ بھی جو ابالفاظ کے بغیر چیخا تھا۔ قدر ایسے تمہرا کر سکتے ہیں آگنی تھی گویا اس کی بات کا یقین نہ آ رہا ہو۔ اس کی سحر انگیز آنکھیں جن کا منوں سر چڑھ کر بولنے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ اس وقت طغیانی کی زد میں آئے سمندر کا نقشہ پیش کر رہی تھیں۔ وہ اس سناٹے کی زد سے باہر آئی۔ اور پھر پھری ہوئی موج کی طرح اسے سامنے سے دھکیل کر جس طرح دروازے سے نکلی تھی۔

اس کا یہ انداز عبد العلی کو چونکانے کا باعث بنا تھا۔ مگر جب تک وہ صورتحال سمجھ کر اس کے پیچھے لپکا وہ اسی ہیجانی کیفیت میں مبتلا اور پری منزل کا زینا طے کر کے چھت پر پہنچ چکی تھی جو اس کا ارادہ تھا۔ وہ صاف ظاہر تھا۔ اس لیے عبد العلی کے حواس اس وقت ضرورت سے زیادہ الرٹ ہوئے تھے۔ اس نے اگر بروقت قدر کو پیچھے سے دبوچ نہ لیا ہوتا تو اب تک وہ کئی فٹ نیچے کود چکی ہوتی۔ ہڈی پسلیاں برابر ہونے میں ذرا دیر نہ لگتی۔

”چھوڑو..... چھوڑو مجھے..... چھوڑ دو۔“ اس کی گرفت میں مچلتی روتی تڑپتی وہ لڑکی اس وقت واقعی قابل رحم تھی یا عبد العلی کو لگی وہ اسے یونہی گھسیٹتا ہوا چھت کے ہی کونے میں بنے کمرے میں لے آیا جو اسٹور کی حیثیت رکھتا تھا۔ اور کاٹھ کباڑ سے بھرا رہتا تھا۔

(لفظ لفظ مہکتے اس خوبصورت ناول کی اگلی قسط ماہ نومبر میں ملاحظہ فرمائیے)

ہوا تھا جب سارا قہر قدر پر اتار دیا مگر اب اس کی کیفیت اور رنج کی شدت کا احساس مضطرب بھی کر رہا تھا۔ اس پہ غصہ یا خفگی ایک الگ بات تھی۔ مگر اپنی زیادتی کا خیال ہی بے چینی کی اصل وجہ تھی۔ وہ ناشتے کے لیے بھی نہیں آئی تھی۔ حالانکہ وہ لاشعوری طور پر منتظر بھی رہا۔ کسی سے پوچھنے میں انا آڑے آئی تھی۔ خود سے اس کے کمرے میں جانا آ کر ڈلگتا تھا۔ اسی شش و پنج میں مبتلا گھر سے چلا گیا اپنے کام میں مگن ہو کر یہ اہم بات فراموش ہوتے کیا دیر لگتی تھی۔

واپسی اس کی شام کو ہو سکی تھی۔ وہ اپنے دھیان میں کچن کے سامنے سے گزرتا ٹھٹھک گیا۔ قدر ہی تھی وہ..... بے خیالی سی چولہے کے آگے کھڑی عبد العلی کی توجہ اس کے دوپٹے کے پلو کو نکلتے آگ کے شعلوں نے حاصل کی تھی۔ وہ لپک کر اندر آیا تھا اور اگلے لمحے اس کا دوپٹہ تیزی سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے دور پھینک دیا۔ قدر بھی جیسے اس وقت حواسوں میں لونی تھی پہلے نگاہ اس پر پھر جلتے ہوئے دوپٹے پہ گئی تو خوف سے اس کی آنکھوں میں اتر آیا۔ وہ کتنی حیران بھی تھی۔ متوحش بھی۔

”دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا.....؟ یعنی حواسوں میں تو ہو تم.....؟“ وہ اتنا بھڑکا تھا کہ سرخ آنکھوں میں قہر بھرے اسے گھورنے لگا۔ قدر جو اس صورتحال کو سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ البتہ اس کے رویے سے ضرور پہلے سے ٹوٹا ہوا دل مزید چکنا چور ہو گیا۔

”آپ نے کیوں زحمت کی.....؟ زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا.....؟ جل جاتی..... مر جاتی تو آپ کی جان ہی چھوٹی۔“ وہ جس کیفیت کے زیر اثر تھی ایسی ہی بات کہہ سکتی تھی عبد العلی کو خیال کرنا

For Next Episodes Visit
Paksociety.com

دوسرے شمارہ 101

READING
Section

لححوں نے خطا کی تھی

فاخرہ پہلے دن امن کو خود کالج چھوڑ کر آئی تھی پھر فاخرہ کو لگا کہ امن کا ہر وقت لہنی کے سامنے رہنا لہنی کے لیے ٹھیک نہیں ہے اسی لیے فاخرہ نے فرقان سے اجازت لے لی تھی۔ امن کو اپنے گھر لے کر جانے کی۔ کسے فرقان کو مطمئن کیا وہ کیسے راضی ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے کیونکہ.....

Downloaded From Paksociety.com

اُس دو شیزہ کی کتھا، جس کی ایک لمحے کی خطا نے اُس کی ساری زندگی کو مجسم خطا بنا ڈالا تھا

ہو رہی تھی۔ رحمان فطرتاً کینہ پرور انسان تھا۔ اُس کی محرومیاں بچپن سے اُس کے ساتھ پروان چڑھی تھیں وہ اندر ہی اندر سعد مرتضیٰ کی شان و شوکت اُس کے رکھ رکھاؤ اُس کے معیار زندگی اُس کے اعلیٰ عہدے و مرتبے کو دیکھ کر وہ دل ہی دل میں جلتا تھا اور اندر ہی اندر تیج و تاب کھاتا رہتا تھا مگر جلنے کڑھنے کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا۔

سب اُجالا کو مبارکباد دے رہے تھے وہ سب کو ایک پیش کر رہی تھی رحمان نے سر جھٹکا جیسے سب خیالات کو درہم برہم کر کے اپنے اوپر خوش اخلاقی کا لبادہ اوڑھا۔

”بہت بہت مبارک ہو اُجالا۔“ رحمان نے سعد کے انداز میں ہی اُجالا کا سراپے ساتھ لگایا وہ بھی تو بھائی تھا اُجالا ٹھیکس کہہ کر رحمان کے لیے پلیٹ میں کیک نکالنے لگی۔

کھانا ہوٹل سے منگوا یا گیا کھانے کے بعد چائے کا دور چلا گپ شپ چلتی رہی رحمان کی بے

”اُجالا آج سولہ سال کی ہو گئی ہے، اُجالا آؤ کیک کا ٹو بیٹا۔“ سعد کا بازو اُجالا کے گرد حصار کی مانند تھا۔ سعد اُسے ساتھ لیے ٹیبل کے پاس آیا۔ اُجالا نے چھری کیک پر رکھی، سعد کا ہاتھ اُجالا کے ہاتھ پر تھا۔

پپی برتھ ڈے کی صدا تالیوں کی آواز، اُجالا مسرور تھی وہ اتنی دلبر باتی ماورا لگ رہی تھی کہ رحمان کی نظریں بار بار اُس کے دل آویز چہرے پر بھٹک رہی تھیں اور دل کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔

سعد اُجالا کو کیک کھلا رہا تھا اور اُجالا سعد کے منہ میں کیک کا ٹکڑا ڈال رہی تھی وہ دونوں بہن بھائی ایک دوسرے میں مگن تھے۔ جیسے وہاں باقی لوگ تو موجود ہی نہ ہوں۔ یہ رحمان کو لگا تھا ایسا تھا نہیں، وہ دکھاوا نہیں کرتے تھے حقیقتاً ایک دوسرے سے بہت محبت کرتے تھے۔ مگر نجانے کیوں رحمان کے دل میں حسد پیدا ہو رہا تھا اُس کے اندر کھٹن سی

Downloaded From Paksociety.com



READING
Section



باک نگاہیں بار بار اجالا کے نوخیز سراپے میں اُلجھ رہی تھیں۔ اجالا اپنی ہی دھن میں بول رہی تھی ہنس رہی تھی۔ یہ تقریب رات گئے تک جاری رہی تھی سب لوگ بہت تعریفیں کر رہے تھے خوش لوٹے تھے مگر ایک شخص بہت ناخوش گھر واپس آ گیا تھا۔
رحمان احمد۔

☆.....☆.....☆

نیہات ضمیر کو ہاسپٹل سے ڈسچارج کر دیا گیا تھا وہ کافی بہتر تھا اور گھر پر آرام کر رہا تھا۔ فاخرہ نے اُسے سختی سے تاکید کی تھی کہ وہ بس کچھ ہفتے آرام کرے زندگی کے کام چلتے رہتے ہیں۔ کبھی رکتے نہیں ہیں اور جو اُس کی اسٹڈی کا حرج ہوا ہو گا وہ فاخرہ جانتی تھی کہ نیہات کے لیے کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

فاخرہ پہلے دن امن کو خود کالج چھوڑ کر آئی تھی پھر فاخرہ کو لگا کہ امن کا ہر وقت لبتی کے سامنے رہنا لبتی کے لیے ٹھیک نہیں ہے اسی لیے فاخرہ نے فرقان سے اجازت لے لی تھی۔ امن کو اپنے گھر لے کر جانے کی۔ کیسے فرقان کو مطمئن کیا وہ کیسے راضی ہوا یہ ایک الگ کہانی ہے، کیونکہ فرقان چاہتا تھا کہ امن گھر میں رہے تاکہ وہ لبتی کا خیال رکھ سکے اور فاخرہ کتنی مجبور تھی کہ وہ اُسے بتا نہیں سکتی تھی کہ امن سے لبتی کو کتنا بڑا صدمہ ملا ہے اور امن کا ہر وقت لبتی کے سامنے رہنا اُسے کیسے دوہری اذیت میں مبتلا رکھتا ہے۔ زخم تازہ ہو اور اُسے ہر وقت چھیڑا جائے تو زخم کبھی مندیل نہیں ہوتا، تازہ رہتا ہے۔ فاخرہ ہر راز کی امین تھی وہ امن کا راز فرقان کو نہیں بتا سکتی تھی وہ ایک بیٹی کو باپ کی نظروں سے نہیں گرا سکتی تھی اس لیے۔ اسی لیے فاخرہ نے نجانے کیا کہہ کر فرقان کو سمجھایا کہ وہ مان گیا۔ فاخرہ نے لبتی سے بھی پوچھا تھا وہ کچھ نہیں

بولی بس سر ہلانے پر ہی اکتفا کیا تھا۔
فاخرہ امن کو اپنے گھر لے آئی تھی اور بشیراں کو اُس نے لبتی کے گھر بھیج دیا تھا۔ امن چند دنوں میں ہی فاخرہ کے بچوں سے اٹیچ ہو گئی تھی۔ اس میں صبا فضا کا کمال تھا اسوہ اور اسد بھی امن کی بہت عزت و محبت کرتے تھے فاخرہ تو تھی ہی سراپا محبت۔

امن صبا کے ساتھ سوئی ہوئی تھی۔ صبا نجانے کب اٹھ گئی تھی۔ امن نے کروٹ بدلی تو دیکھا صبا نہیں تھی۔ امن کچھ دیر غائب دماغی سے لیٹی رہی پھر اُسے دھیان آیا وہ اپنے نہیں فاخرہ آنٹی کے گھر میں ہے۔

امن بھی اٹھی وضو کیا اور صحن میں نکل آئی ملگجا سا اندھیرا پھیلا ہوا تھا اور صحن میں ایک چٹائی پر فاخرہ، صبا، فضا اور اسوہ نماز پڑھ رہی تھیں۔ امن بھی اُن کے ساتھ جا کھڑی ہوئی۔

فاخرہ کچن میں چلی گئی صبا اٹھ کر اپنی اور بہن بھائی کے یونیفارم استری کرنے لگی جب تک امن اٹھ کر اندر گئی فضا سب کے جوتے پالش کر چکی تھی اور صبا کپڑے۔

”امن آپ آپی آپ تیار ہو جاؤ کالج کے لیے، اور فضا تم اسد کو جگاؤ میں بابا کو ایک کپ چائے بنا دوں۔“ صبا مصروف سے انداز میں کہہ کر چلی گئی اور امن نے دیکھا فضا کی ہلکی سی ایک آواز پر اسد اٹھ بیٹھا کوئی شور شرابا نہیں کوئی بد تمیزی نہیں، اللہ تعالیٰ نے فاخرہ کے بچوں کو ہدایت بخش رکھی تھی اور جسے اللہ ہدایت دے دیتا ہے پھر اُسے دنیا کی کوئی طاقت گمراہ نہیں کر سکتی۔

سب تیار ہوئے ناشتا کیا امن کو ایک بار پھر حیران ہونا پڑا صبا اور فضا بہت محبت سے زمان کو اُس کے کمرے سے لے کر آئی تھیں دونوں بیٹیوں

نے اپنے نایاب باپ کو تھاما ہوا تھا۔ صبا نے خود زمان کو ناشتا کروایا چائے بھی دوبارہ تازہ بنا دی پھر امن نے دیکھا کہ صبا نے ٹی وی لگا کر بیڈ کے اوپر ریموٹ رکھا پھر زمان کو اُس کے کمرے میں چھوڑا۔ باری باری سارے بچے زمان سے ملے اور کیسے محبت سے گلے لگے۔ جیسے وہ اسکول نہیں کہیں لمبے سفر پر جا رہے ہوں امن کے لیے حیرت کا دن تھا۔

اور فاخرہ نے بھی زمان کو خدا حافظ کہا تو چارو ناچار امن کو بھی زمان تایا سے ملنا پڑا مگر وہ باوجود کوشش کے بھی صبا اور قضا کے انداز میں نہیں مل سکی۔

بچے رکشے میں چلے گئے فاخرہ اور امن پیدل چل رہی تھیں۔ فاخرہ نے امن کو کالج چھوڑا اور خود اسکول چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

اریز کو گئے ہوئے بہت دن ہو گئے تھے۔ فردا مسلسل اُس کے ساتھ رابطہ کر رہی تھی مگر اُس کا نمبر آن ہوتا تو تب ہی رابطہ ممکن تھا۔ گھر والوں سے اُس کی کم کم ہی بات ہوتی تھی۔ عائشہ اُسے بارہا کہہ چکی تھی کہ گھر کا چکر لگا آؤ مگر وہ ٹال مٹول سے کام لے رہی تھی۔ مصروفیت کا بہانہ بنا کر کال کاٹ دیتی۔ رحمان تو ویسے بھی فردہ سے دل سے ناراض تھا۔ شاید وہ خوش فہمی میں مبتلا تھا کہ فردہ اُسے منائے گی شاید فردہ کو احساس ہو جائے کہ اُس کا فیصلہ کتنا غلط تھا۔ مگر یہ رحمان کی خام خیالی تھی فردہ کے ہاں دور دور تک ایسے کوئی آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

فردہ فیروزی ٹراؤزر پر ریڈ لوئگ شرٹ پہنے اپنے پارلر میں ایک کسٹمر لڑکی کا فیشنل کر رہی تھی۔ فردہ کا چہرہ میک اپ کرنے کے باوجود بجا بجا سا

تھا۔ اُس کا ذہن مسلسل اریز کی طرف ہی لگا ہوا تھا۔ وہ اپنی تمام تر توجہ اپنے کام پر مرکوز رکھنا چاہ رہی تھی۔ مگر سوچیں تھیں کہ آوارہ بگولوں کی طرح اُسے اڑائے پھر رہی تھیں۔ اُس کا کام تقریباً مکمل ہو چکا تھا۔ تبھی فردہ کے سیل فون پر قیل ہوئی فردہ تڑپ کر لپکی شاید اریز ہو جلدی سے ہاتھ دھو کر سیل فون اٹھایا مگر مس کال دیکھ کر اُس کا چہرہ اُتر گیا۔

عائشہ کی کال بھی فردہ سیل فون ہاتھ میں پکڑے تاسف سے اپنے ہونٹ کچلنے لگی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں اُس کے اندر جیسے کوئی ماتم کرنے لگا آوازوں کا ہجوم جمع ہو کر اُس کے تن پین میں شور مچا کرنے لگا وہ تذبذب کی حالت میں تھی کہ بیک کال کرے یا نہیں۔ وہ یونہی غائب دماغی کی کیفیت میں باہر نکل آئی باہر موسم بدل رہا تھا۔ سرسراہی ہوا کا شور، ہوا اپنے ساتھ نمی سمیٹ کر لارہی تھی۔ بارش کے آثار تھے۔ سرما کی سرد ہوا شور مچاتی پھر رہی تھی دورانق پر مغرب کی طرف آسمان کالی گھٹاؤں سے چھپتا جا رہا تھا اور درختوں کی شاخیں اپنا سرخ کر خود کو زخمی کر رہی تھیں۔

فردہ نے کوثر کو چائے کے لیے کہا اور وہ خود وہیں بالکونی میں کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گئی اُس کے سامنے بھاپ اڑاتی چائے کا گگ کوثر کب رکھ گئی تھی فردہ کو چنداں خبر نہیں ہوئی وہ اپنے دھیان میں تھی ہی کہاں۔ وہ اپنی ہی سوچوں میں غلطاں تھی۔ عجیب عجیب سوچیں اُس کے من میں پنپ رہی تھیں اور فردہ کے جسم و جان کی بے قراری بڑھا رہی تھیں۔ بارش کے قطرے اُس کے اوپر گرے وہ چونکی سلکتی سوچیں بھلا ان چند قطروں سے کیسے ٹھنڈی ہو سکتی تھیں۔

بارش کی بوندیں اُس کے اعصاب کو جلانے لگی۔ پیش سے جسم انگارے کی مانند دہکنے لگا اُس

کی آنکھوں کے گوشے آنسوؤں سے نم ہونے لگے
بارش تیز ہو گئی درختوں کی شاخیں چنچنے لگیں اس
سے فروہ کو اپنا وجود بھی اُن شاخوں سے مشابہ ہی
لگ رہا تھا۔ اس نے عجلت میں اریز کا نمبر ملا یا ایک
بار دو بار پھر بار بار مگر نمبر آن ہوتا تب ہی بات بنتی
تا۔

اُسے بارش بہت اثریکٹ کرتی تھی برستی بارش
اپنے اندر ایک الگ ہی حسن رکھتی ہے مگر آج فروہ
کے اندر وہی بارش آگ لگا رہی تھی۔ دور کہیں کسی
درخت سے کوئی ڈال کوئی ٹہنی ٹوٹ کر زمین بوس
ہوئی تھی۔ شاخ ٹوٹ جائے تو سوکھ کر زمین کا
اینڈھمن بن جاتی ہے۔ فروہ کے نیم والوں سے
بے ساختہ گراہ نکلی بارش کی ٹپ ٹپ مگر اندر گہری
خاموشی سناٹا اور اندھیرا تھا وہ تنہائی کا زہر قطرہ قطرہ
اپنے اندر اٹیل رہی تھی۔ اُس نے محبت میں کیا
کچھ کھویا تھا یا وہ آنے والے دنوں میں کیا کچھ
کھونے والی تھی۔

وقت اپنے اوپر سے پرتیں سفاکی اور بے رحمی
سے اُتارنا جا رہا تھا اور وہ بے خبر تھی۔ وہ تو فکر مند
تھی اریز کے لیے اُس کا نمبر آف کیوں ہے وہ
ٹھیک ہو، اسی غم میں وہ ہلکان تھی۔ اتنے دن گزر
جانے کے بعد بھی فروہ کا یقین ایک لمحے کے لیے
بھی متزلزل نہیں ہوا تھا۔ وہ تو گمان کے آخری
سرے پر بھی جا کر یہ نہیں سوچ سکتی تھی کہ اریز جان
بوجھ کر اُسے چھوڑ گیا ہے اُسے دھوکا دے گیا ہے
اریز ایک سراب تھا ایک فریب تھا۔ جو خوشنما عکس
بن کر فروہ کی آنکھ میں اُترا تھا۔

وہ کہاں ایسی بات سوچ سکتی تھی کبھی بھی نہیں
اریز تو فروہ کے لیے دیوتا تھا اُس کے دل کی زمین
پر اگلنے والا پہلا احساس، محبت کا سنہرا رو پہلا

—

فروہ نے ٹوٹ کر محبت کی اتنی کہ باقی سب
پس منظر میں چلا گیا صرف اریز ہی اریز۔ اُس کی
محبت جنون خیز تھی اور جنون تباہیاں لاتا ہے۔

”میں انتظار کروں گی اریز، چاہے وہ انتظار
صدیوں پر ہی محیط کیوں نہ ہو، میری محبت میں کوئی
کھوٹ نہیں ہے میں وفا نہیں چھوڑوں گی اریز
میرے اریز میں محبت کو زندہ رکھوں گی چاہے میں
خود مر ہی کیوں نہ جاؤں۔“ فروہ نے گہرے
گہرے سانس لے کر اپنا سر کرسی کی پشت سے ٹکا
دیا اور اپنی آنکھیں موند لیں چپکے سے دو آنسو
آنکھوں میں انگڑائی لے کر بولے۔

”اے نادان لڑکی جیسے برستی ہوئی موسلا دھار
بارش اپنے ساتھ سب کچھ بہا کر لے جاتی ہے اسی
طرح لڑکیوں کے من مانی کے لیے اٹھائے ہوئے
قدم بھی پیچھے کچھ باقی نہیں چھوڑتے، صرف آپ ہیں،
آنسو، پچھتاوے اور بدنامیاں رہ جاتی ہیں۔ محبت
ہوک بھرتی بس آپ رہ جاتی ہے کون ہے اتنا اعلیٰ
ظرف جو لڑکیوں کے بدن پر لگے داغ دھے دھوتا
پھرے، مرد کو تو معطر معطری پاکیزہ ان چھوٹی کلی
جیسی نازک مہین لڑکی پسند ہوتی ہے جس کے من
ہی نہیں تن بھی اُجلا ہوا اپنے ہاتھوں میلا کر کے لڑکی
کو بے یارو مددگار چھوڑ کر خود نیا نویلا صاف
ستھرا پا کباز، معاشرے کا معزز فرد بن جاتا ہے۔“

☆.....☆.....☆

امن اور ضویا لالہ بریری میں بیٹھ کر نوٹس بنا رہی
تھیں وقت تیزی سے گزر گیا انہیں احساس تک
نہیں ہوا مگر جب امن نے گھڑی پر نظر ڈالی تو اُس
کے چوہہ طبق روشن ہو گئے ڈھائی بج رہے تھے اس
وقت تو وہ گھر بھی پہنچ جاتی تھیں۔

”اوہ مائی گاڈ اتنا وقت ہو گیا۔ آنٹی بھی نہیں
آئیں۔“ امن نے جلدی جلدی سارے کاغذات

فائل میں لگائے اور کتابیں سنبھالتی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”امن ہم نے تمہیں بہت مس کیا بیوی۔“
ضویا نے اُس کے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔

”میں نے بھی۔“ عروہ نے بھی اُن کے برابر چلتے ہوئے کہا۔ سبھی امن نے دیکھا فاخرہ گیٹ کے پاس کھڑی ہے امن اُن دونوں کو ہاتھ ہلاتی تیز قدموں سے فاخرہ کی طرف بڑھ گئی وہ دونوں تب تک امن کو جاتا دیکھتی رہیں جب تک کہ وہ فاخرہ کے ساتھ جاتے ہوئے نظروں سے اوجھل نہیں ہو گئی۔

”کمال ہے لبتی چاچی بیمار ہیں اور بجائے امن اپنے گھر میں رہ کر اپنی ماما کی تیمارداری کرنے کے، اُن کے ہاں رہنے کے لیے چلی گئی۔ عروہ یوں صدمے اور تاسف میں گھر کر کہہ رہی تھی۔ جیسے وہ خود بہت احساس بھرا دل رکھنے والی سعادت مند بیٹی ہو۔

”نہیں ایسی بات نہیں ہے لبتی آئی نے خود ہی بھیجا ہوگا۔“ ضویا نے امن کا دفاع کیا۔

”وہ بیمار ہیں، امن کو خیال ہونا چاہیے تھا۔“
”چھوڑو یار اُن کا ذاتی معاملہ ہے، تمہارا فون۔“ ضویا نے بیگ کے اندر تڑپتے سیل فون کی طرف اشارہ کیا عروہ نے اپنے بے بی ٹوائز دل کی شپ والے بیگ کی اوپری زپ کھول کر فون نکالا۔

”ہیلو.....“
”جی، جی میں عروہ رحمان، آپ کون؟“
عروہ نے پوچھا ضویا نے اچنبھے سے عروہ کو دیکھا۔
”کون تھا.....؟“
”پتا نہیں کوئی لڑکا تھا کہہ رہا تھا کہ آپ عروہ رحمان ہیں۔“

”تمہیں کیسے جانتا ہے وہ، جبکہ تم اُسے جانتی ہی نہیں ہو۔“

”پتا نہیں کون تھا، مگر جو کوئی بھی تھا بہت خوبصورت آواز کا مالک تھا۔“

”اتنی جلدی تمہیں اندازہ ہو گیا کیا.....“ ضویا نے اُسے گھورا۔

”ہاں نا بہت مسحور کن آواز تھی لب دلچہ بھی متاثر کن تھا۔“

”عروہ انسان بنو.....“ ضویا نے اپنی فائل زور سے اُس کے سر پر ماری دونوں کھلکھلا کر ہنس پڑیں ضویا کی پیشانی پر غصے بھری شکنیں تھیں مگر مصنوعی غصے والی۔

”چلیں ضویا.....“ تبھی نیہات کہیں سے آن نکلا۔

”او کے عروہ۔“ ضویا نے عروہ کو پیچھے چھوڑ دیا عروہ آج کل رحمان کے ساتھ کالج آتی جاتی تھی۔

☆.....☆.....☆

صبا اور فضا اپنے سامنے اخبار پھیلانے بیٹھی تھیں صبا اخبار پڑھ کر زمان کو سنا رہی تھی اور فضا زمان کے پیروں کے ناخن کاٹ رہی تھی وہ ہر جمعے والے دن اپنے بابا کے ہاتھوں پیروں کے ناخن کاٹا کرتی تھی۔

رات کا وقت تھا اسوہ اور اسد بھی زمان کے ساتھ چپک کر لیٹے ہوئے تھے کھانا تیار تھا فاخرہ نے آج بھنڈی گوشت بنایا تھا اور یہ زمان کی پسندیدہ ڈش تھی۔

”بس کرو بیٹا کوئی بھی خبر ڈھنگ کی نہیں ہے، الٹا ٹینشن ہوتی ہے۔“ زمان نے صبا سے کہا تو صبا نے اخبار ایک طرف ڈال دیا اور زمان کے ساتھ لگ کر بیٹھ گئی اپنے اسکول کی باتیں بتانے لگ گئی

فضا نے کٹے ہوئے ناخن اپنی ہتھیلی پر رکھے ہوئے تھے وہ اٹھ کر باہر چلی گئی تاکہ وہ ناخن ڈسٹ بن میں پھینک سکے۔ سب نے مل کر کھانا کھایا سارے بچے زمان کا بہت خیال رکھ رہے تھے۔ لاڈ کر رہے تھے۔ زمان مسکراتے ہوئے اپنے بچوں میں مگن تھا۔ بچوں کے پاس ہزار قصبے تھے وہ سب باری باری سنا رہے تھے اور زمان اپنی اولاد میں بیٹھے خود کو بہت معتبر محسوس کر رہے تھے۔ اپنا پن، محبت، اتفاق کیا کچھ نہیں تھا اس گھر میں۔

”چھوٹوں کے لہجوں میں بڑوں کے لیے ادب تھا اہمیت تھی نرمی تھی مٹھاس تھی سب ایثار کرتے تھے کیونکہ انہیں ایثار کرنا سیکھایا گیا تھا محبت صلہ رحمی کا دوسرا نام ہے۔ محبت ایثار ہے قربانی ہے صبر ہے۔“

امن چھوٹے چھوٹے لقمے لیتی سب دیکھ رہی تھی اس کے گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا ٹک گیا تھا۔ آنکھیں تھیں کہ چھلکنے کو بے تاب ہو رہی تھیں امن نے نظر بچا کر اپنے آنسو صاف کیے مگر اس سے کھانا کھایا نہیں جا رہا تھا کاٹ دینے والی سوچیں اسے مضطرب کر رہی تھیں۔ اسے اپنے بابا یاد آ رہے تھے اور ماما تو بہت شدت سے یاد آ رہی تھیں۔ آنسو بہت تیزی سے آنکھوں کی سطح پر پھیلے اور سامنے کا منظر دھندلا گئے امن کا خود پر ضبط ختم ہونے لگا اور پھر وہ بے اختیار رو دی۔

”کیا ہوا بیٹا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا۔“ فاخرہ اپنی جگہ سے اٹھی اور امن کے پاس آ کر اس کے آنسو صاف کر کے امن کو گلے لگا لیا امن بلک بلک کر رو دی۔ فاخرہ تو اس کی درد آشنا تھی۔ جانتی تھی کہ امن کس کرب سے گزر رہی ہے صبا اور فضا بھی اپنی جگہ سے اٹھ کر امن کے پاس آ گئی تھیں۔

”امن آپ آپی آپ ٹھیک ہیں نا، یہ لیں پانی پی

لیں۔“ فضا بھاگ کر پانی لے آئی امن اور بھی پھوٹ پھوٹ کر رو دی سب اسے چپ کر دیا ہے تھے خیال رکھ رہے تھے اور اسے اتنا کی شرمندگی ہو رہی تھی۔ اسے کوئی بہانہ نہیں سوچ رہا تھا۔

”مجھے ماما یاد آ رہی ہیں۔“ بے چارگی امن کے لفظوں سے چھلک رہی تھی۔

”میں صبح تمہیں لے چلوں گی بیٹا یوں رو رو کر خود کو ہلکان مت کرو۔“ فاخرہ نے اس کی پشت سہلائی۔

”آئی میرے سر میں درد ہے۔“

”آؤ بیٹا تم دوسرے کمرے میں آرام کر لو، میں تمہارے لیے چائے بناتی ہوں اور صبا تم لوگ یہیں رہو ٹی وی لگا لو اپنے بابا سے گپ شپ لگاؤ۔“ فاخرہ نے یہ بات خاص طور پر کہی تھی کہ مبادا وہ بھی امن کے پاس آ جائیں اور امن کن کیفیات سے گزر رہی تھی صبا اور فضا نہیں جانتی تھیں۔

فاخرہ نے چائے کے ساتھ امن کو پینا ڈول دی تھی اور خود امن کے پاس بیٹھ گئی۔

”آئی میں کتنی بری بیٹی ہوں نا۔“ امن سسکی۔

”نہیں بیٹے، ایسے نہیں کہتے۔“ فاخرہ نے امن کے گالوں پر پھسلتے آنسو صاف کیے۔

”آئی میں جب جب آپ کی بیٹیوں کو زمان تایا کی خدمت و محبت کرتے دیکھتی ہوں تو میرا دل احساس ندامت میں ڈوب جاتا ہے۔“

”کسی بھی غلطی کے بعد اس کا احساس دل میں جاگ جانا اس بات کی علامت ہوتا ہے کہ خدا انسان کو ہدایت دینا چاہتا ہے ایسے لوگ برے لوگ نہیں ہوتے تم بھی لمحاتی کیفیت کے زیر اثر گمراہ ہوئی ضرور مگر وہ لمحوں کی بات تھی تم بہت

مگر بظاہر وہ سعد پر اپنا اعتماد دن بدن بڑھاتا جا رہا تھا۔

ایاز خالوان دنوں شدید علیل تھے۔ اُن کے پیٹ میں شدید درد اٹھتا تھا جان لیوا ناقابل برداشت درد، اور بخار نے تو جیسے جان ہی پکڑ رکھی تھی۔

رحمان اور فرقان تھوڑا بہت پڑھے لکھے تھے کوئی ڈھنگ کی ڈگری اُن کے پاس نہیں تھی کہ اُن کو کوئی نوکری مل سکتی۔ سعد ایاز خالو کی عیادت کے لیے اُن کے گھر گیا تھا۔ خالا کا بس نہیں چلتا رہا تھا کہ سعد کو کہاں بٹھائے کیا کر ڈالے۔ پھر رحمان اور خالا نے وہ تنگ دستی کے رونے رونے شروع کر دیے علاج معالجے کے لیے اُن کے پاس پیسے نہیں تھے اور وہ لوگ بہت پریشان تھے سعد نے اُن کو بیس ہزار روپے دیے تو خالا اور رحمان خالو کو لے کر لاہور چلے گئے تاکہ اُن کا باقاعدہ علاج کروایا جاسکے۔

اُن کے جانے کے تیسرے دن ہی رحمان نے سعد کو فون کر کے بتایا کہ پیسے ختم ہو گئے ہیں سعد نے بیس ہزار اور بھیج دیے اور پھر تو یہ مانگنے اور دینے کا سلسلہ ہی چل نکلا۔

رحمان اپنے ابو کے ساتھ بائیس دن لاہور میں رہا اور اُس دوران سعد نے دو تین لاکھ کے قریب رقم رحمان کو خالو کے علاج کے لیے بھیجی۔

ڈاکٹرز کا کہنا تھا کہ اُن کو کینسر ہے اور وہ بھی آخری اسٹیج پر، اُن کے بچپنے کی کوئی امید نہیں تھی پھر بھی سعد نے رحمان کو مایوس نہیں ہونے دیا تھا مگر ہوتا تو وہی ہے جو کاتب تقدیر نے لکھ دیا ہوتا ہے رحمان سٹائیسوس دن خالو کی ڈیڈ باڈی لے کر گھر واپس آ گیا تھا۔

اب بھی اُن کا مسئلہ پیسہ تھا مگر یہاں بھی سعد

اچھی ہو تم غافل نہیں ہو، تمہیں واپس اپنے اصل میں پلٹنا ہے بیٹا، خود کو سنبھالو، اللہ کو تمہاری بے گناہی کا علم ہے اللہ دلوں کے حال جانتا ہے اللہ سے رورو کر اُس کا قرب مانگا کرو ایمان کی مضبوطی مانگا کرو ماں باپ کے لیے دعا کیا کرو اپنے حوصلے کو مت ہارو اللہ سے لو لگا لو اپنے رب سے سکون کی عافیت کی دعا مانگنا سیکھو اپنے رب سے اپنے لیے استقامت کی دعا مانگا کرو۔ امیدوں کے چراغوں کو جلانے رکھو رب کا کرم ہو جائے گا۔ سکون مل جائے گا۔“ قاخرہ کے لہجے میں جذب تھا۔

”آئی زمان تیا نے کبھی اپنے بچوں کو کما کر نہیں کھلایا ایک باپ ہونے کے ناطے کبھی اُن کی تمام ذمہ داریاں پوری نہیں کیں رحمان تیا ہمیشہ زمان تیا کو فالتو اور ناکارہ پرزہ کہتے تھے مگر آئی دیکھیں اُن کی اولاد کیسی تابع فرماں اور ایک میں ہوں سیاہ بخت جس کے باپ نے ہر خواہش پوری کی اور میں نے کیا کیا؟“ امن کر ہانے لگی اب قاخرہ کیا کہتی۔

”چلو بیٹا آرام کرو، رونا نہیں ہے۔“ قاخرہ کا دل درد کی اتھاہ میں ڈوبتا جا رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اجالا اور لبنی نے اکٹھے ہی میٹرک کا امتحان دیا تھا اور اجالا نے بورڈ میں پہلی پوزیشن لی تھی سعد نے خوشیاں منانے کی انتہا کر دی تھی پورے محلے پورے خاندان میں مٹھائی بانٹی گئی تھی۔ سعد کے انداز میں احساسِ تفاخر تھا شکر گزاری کے ساتھ عاجزی و انکساری تھی۔

لبنی پی ٹی سی کرنے لگی تو اجالا نے بھی اُس کے ساتھ داخلہ لے لیا۔ سعد راضی نہیں تھا مگر وہ اجالا کی کوئی بات نالتا نہیں تھا اس لیے وہ مان گیا رحمان اندر ہی اندر سعد اور اجالا سے خار کھاتا تھا۔

نے تدفین سے لے کر چہلم تک سب اخراجات کا بوجھ اٹھایا تھا رحمان بہت ممنون تھا اور خالا تو سعد پر شکر ہی ہوتی جا رہی تھی۔ سعد اُن دونوں ماں بیٹے کی چاپلوسی و خوشامد کو محبت سمجھ رہا تھا وہ اتنی محبت پر پھولے نہیں سماتا تھا اُس کی اپنی ماں تو تھی نہیں، خالا کو ہی اپنی ماں سمجھتا تھا اور رحمان لوگوں کو اپنے بھائی۔

سعد کا تعلق خوشحال خاندان سے تھا روپیہ پیسہ کبھی اُس کا مسئلہ نہیں رہا تھا اور ویسے بھی وہ نیک فطرت، خدا ترس نوجوان ہونے کی بناء پر مستحق لوگوں کی مالی امداد کرتا اور یہ لوگ تو اُس کے اپنے تھے خون کے رشتے تھے۔

☆.....☆.....☆

عروہ کا رپٹ پر ٹانگیں پسارے بیٹھی تھی ٹی وی پر سرفنگ کا سلسلہ چل رہا تھا اُسے کوئی بھی چیز پسند نہیں آ رہی تھی اُس کے پاس موگ پھلیوں کے چھلکوں کا ڈھیر جمع ہوتا جا رہا تھا وہ ٹی وی کے ساتھ کافی دیر سے سرکھپا رہی تھی ساتھ موگ پھلیاں کھانے کا شغل بھی جاری تھا۔

اُس نے ٹی وی بند کر کے، ہینڈ فری کانوں میں گھسالی اب وہ آئی فون پر اپنی پسند کا گانا سن رہی تھی۔ جب اُس کے اطراف میں ہر طرف چھلکے ہی چھلکے ہو گئے تو وہ آرام سے اٹھی اور جا کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ عروہ بیڈ پر اوندے منہ لیٹی تھی وہ اپنی ٹانگوں کو اوپر اٹھائے مسلسل جھلا رہی تھی اُس کے دونوں پیر ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے عروہ نے کہنیوں پر بوجھ ڈال کر اپنا چہرہ ہاتھوں کے پیالے میں تھام رکھا تھا۔

تبھی اُس کے سیل پر کوئی کال آنے لگی عروہ نے جلدی سے ہینڈ فری کھینچی اور فون کان سے لگا کر ہیلو کہا ادھر سے پھر پوچھا گیا کہ ”آپ عروہ

رحمان ہو۔“

”جی بالکل میں عروہ رحمان ہوں مگر آپ کون

ہیں اتنے دن ہو گئے مس کالز کرتے آپ کو۔“

”عروہ میں کالز ہی کرتا ہوں مس کالز نہیں۔“

اُس نے عروہ کا نام انتہائی محبت سے لیا تھا۔

”جی، کس لیے کرتے ہیں کال، اور مجھے کیسے

جانتے ہیں۔“ آپ جناب کر کے بات کرنا عروہ

کی عادت نہیں تھی مگر وہ اب مارے باندھے

تکلفات نبھا رہی تھی۔

”عروہ میں تو نجانے کب سے تمہاری ایک

جھلک دیکھنے کے لیے کٹ کٹ رہا ہوں تمہاری

گلی کے کتنے سالوں سے چکر لگا رہا ہوں تمہیں

دیکھتا ہوں تو اپنے آپ میں نہیں رہتا دیوانگی اور

بڑھ جاتی ہے مگر میں کتنا بد قسمت ہوں کہ محبت کی

راہ کا تنہا مسافر ہوں تم میرے ساتھ نہیں ہو میں

بہت پریشان ہوں۔“

”میں تو آپ کو جانتی بھی نہیں۔“ عروہ

ٹپٹائی۔

”اچھا ٹھہرو میں تمہیں اپنی تصویریں بھیجتا

ہوں شاید تمہیں کچھ یاد آ جائے۔“ اُس نے فون

بند کر دیا۔ عروہ ساکت و صامت سی اٹھ بیٹھی ٹھیک

تین منٹ بعد میسج آیا تھا عروہ نے اوپن کیا۔

سیدھی کھڑی ناک کے نیچے بھرے بھرے

سے خوبصورت لب..... روشن آنکھیں، لمبی گھنیری

پلکیں، پیشانی پر بکھرے گھنے سیاہ بال، وہ مردانہ

وجاہت کا شاہکار تھا۔

”اُف اتنا شاندار بھر پور مرد، میرے خوابوں

کے شہزادے جیسا، اُس کی آنکھیں کتنی بولتی ہوئی

سی ہیں۔“

عروہ اُسے یک ٹک دیکھے جا رہی تھی اور اُس

کے لبوں کی گویائی اُس مرد کی آنکھوں میں کہیں

مال کر ڈالا ہے مجھے، میں بہت خوش ہوں خود کو
ہواؤں میں اڑتا محسوس کر رہا ہوں۔“

”عروہ تم میری ہونا جان، ایک بار کہہ دو تم
میری ہو، میرے بے قرار دل کو قرار آ جائے گا۔“
”جی.....“ عروہ جھپٹی ہوئی سی بوکھلا کر رہ گئی
تھی اُسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی۔

”بہت شکریہ عروہ، تم نے مجھے نہال کر دیا۔
آئی لو یوجان لو یوسوچ۔“

”عروہ اب ہمیشہ میری ہی رہنا کبھی مجھے دھوکا
مت دینا وفا نبھانا دعا بازی مت کرنا ورنہ تمہارا
سجاد مر جائے گا۔“

سجاد رو دیا اُس کی گھٹی گھٹی سسکیاں عروہ کی
سماعتوں نے وصول کیں تو بے اختیار اُس کے لبوں
سے لفظ نکلے اُن لفظوں میں بے ساختگی ہی نہیں
ٹڑپ بھی تھی۔

”خدا نہ کرے سجاد، تمہیں میری زندگی بھی لگ
جائے۔“ آپ سے تم تک آگئی تھی کہانی۔

”او کے عروہ اب مجھے ڈاکٹر کے پاس جانا
ہے۔“ یکا یک سجاد کی آواز میں آرزوگی گھل گئی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“
”پھر بتاؤں گا او کے اپنا بہت خیال رکھنا
عروہ۔“

”جی تم بھی۔“ سجاد نے کال کاٹی تو عروہ ایک
بار پھر سجاد کی تصویریں نکال کر دیکھنے لگی۔ سیل فون
کی اسکرین پر عروہ کی انگلی تیزی سے تصویریں سیو
کرتی جا رہی تھی۔

”حیرت ہے مجھ میں ایسا کیا ہے جس پر سجاد
مر مٹانہ لب کٹاؤ دار..... نہ گلاب کی پگھڑی سے۔

پھر وہ مجھ پر فریفتہ کیسے ہو گیا میرے لیے وہ میری
گلی میں آتا رہا۔ کمال ہے نہ آنکھیں شرتی نہ جھیل
جیسی، ایسا کیا ہے مجھ میں، جو سجاد کو بھا گیا نہ

کھو کر رہ گئی تھی۔ وہ ذہن پر زور دے رہی تھی کہ
اُسے کہاں دیکھا ہے پھر کچھ کلک ہوا اور اُسے یاد
آ گیا عروہ نے اُسے حاجی صاحب کے گھر کے
سامنے کھڑا دیکھا تھا اور چند ایک بار کالج میں بھی
دیکھا تھا۔

”تو کیا وہ میرے لیے آتا تھا۔“ عروہ کا دل
خوش گواریت کے احساس سے دھڑکا۔ تبھی اُس کا
فون پھر آنے لگا۔

”ہیلو عروہ، کیسا لگا تمہیں سجاد بلوچ۔“ وہ کچھ
نہیں بولی۔

”میں کب سے تمہارے پیچھے خوار ہو رہا ہوں
عروہ اور تم نے ایک نظر مجھ پر ڈالنا کبھی گوارا نہیں
کیا، مجھے اس قابل نہیں سمجھا کہ ایک نگاہ صرف
ایک نگاہ مجھ پر اچھتی سی، سرسری سی ہی سہی، کیا میں
اتنا گیا گزرا ہوں عروہ بتاؤ۔“ سجاد کی آواز میں
ایک محسوس کی جانے والی ٹڑپ تھی عروہ کا دل
دھک سے رہ گیا۔

”نہیں ایسا تو نہیں، آپ تو بہت گڈ لکنگ
ہیں۔“ یہ پہلی غلطی تھی جو عروہ نے کی تھی ثابت ہو گیا
کہ رحمان کی بیٹیاں بہت ہلکی نکلی تھیں آسان
ٹارگٹ کوئی بھی وجیہ نہ جو ان کو پٹانے میں
کامیاب ہو سکتا تھا اتنی بودی اور عام سی لڑکیاں چند
رومانوی جملوں کی مار۔

”عروہ مجھ سے دوستی کرو گی، دیکھو انکار مت
کرنا ورنہ.....“ سجاد کا لہجہ رونے والا ہو رہا تھا۔
”او کے.....“

”ریٹلی عروہ، فرینڈز۔“ اب خوشی سجاد کی
آواز سے چھلکنے لگی تھی۔

”جی بالکل۔“ عروہ ہولے سے بولی۔
”اوہ مائی گاڈ عروہ، تم سوچ بھی نہیں سکتیں کہ
تم نے مجھے کتنی بڑی خوشی سے ہمکنار کیا ہے، مالا

رخساروں میں دلکشی بڑھاتے گہرے بھور نہ گدگانے دل لبھانے والی مسکان، اور وہ خود بالکل ویسا۔ میرے خوابوں جیسا، وہی ناک نقشہ ویسی ہی آنکھیں چوڑے چکلے شانے، وجاہت، مردانگی کیا کچھ نہیں تھا اُس میں، میں نے خوابوں میں ایسا ہی بت تو تراشا تھا بہت محبت سے، اب وہ سراپا وجود جیتا جاگتا سانس لیتا باتیں کرتا سامنے تھا سجاد کی دلکش آواز نے کیسے مجھے اسیر کر لیا۔“

عروہ کا دل درد سے آشنا ہو رہا تھا اُس کی سانسوں سے خوشبو پھوٹ رہی تھی۔

”سجاد بلوچ۔“ عروہ کے لبوں نے ہولے سے اُس کا نام چھوا عروہ کے دل میں مٹھاس سی بھرتی چلی گئی۔

”کتنا ڈینگ ہے نا۔“ اُس نے دل سے اعتراف کیا۔

”اور میرے لیے دیوانہ ہے۔“ عروہ کے اندر باہر سشاری ناخن لگی۔

”مگر وہ ڈاکٹر کے پاس کیوں گیا ہے۔“ اس سوال کا جواب اس کے پاس نہ تھا مگر کچھ دیر قبل ہونے والی بات چیت سو کر اُس کے لبوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

☆.....☆.....☆

اجالا نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا اور لبتی کو جاب مل گئی فرقان نے ادھر ادھر سے کچھ پیسے ادھار پکڑ کر چھوٹی سی کریانے کی دکان بنالی۔ رحمان کو ہر وقت پیسوں کی ضرورت رہتی تھی سعد نے اُسے ایک جیولر کے ساتھ بٹھا دیا کہ کچھ ماہ کام کی بنیادی ٹیکنیکس سمجھ جائے پھر اُسے وہ سونے کی دکان بنا دے گا۔

رحمان کا آنا جان سعد کے گھر بڑھ گیا رحمان سلگتی ہوس بھری نظروں سے اجالا کو تار تار ہتا مگر وہ

اُس کے ساتھ بدتمیزی اور دست درازی کر کے معاملہ بگاڑنا نہیں چاہتا تھا کیونکہ سعد اُس پر اندھا اعتماد کرتا تھا وہ دونوں بہن بھائی ریا کاری و مکاری سے نابلد انسان تھے۔ اُن کا ظاہر بھی اور باطن بھی صاف شفاف تھا اور جن کا اپنا من اُجلا ہوتا ہے وہ اتنی شفاف آنکھیں رکھتے ہیں کہ دوسروں کی آنکھوں میں پڑی لالچ و طمع، حرص و ہوس کو پہچان ہی نہیں پاتے۔ اور جب دل اور آنکھیں پہچان کے مرحلے طے کرتے ہیں تب تک وقت گزر چکا ہوتا ہے۔

اجالا کتابوں کے مطالعے میں گم رہتی کالج کی مصروفیات کے بعد اُس کی پسندیدہ جگہ اُن کا گارڈن تھا وہ سعد کی لاڈلی بہن تھی سعد اُسے ہر وہ کتاب لا کر دیتا تھا جو وہ مانگتی تھی اور پھر اجالا کو خود بھی پتا نہیں چلا کہ وہ کب شعر کہنے لگی بڑی سے بڑی بات کو منفرد اور اچھوتے انداز میں دو لائنوں میں بیان کر دینا اجالا کو بہت اچھا چارمنگ لگنے لگا۔ سعد نے اجالا کے شوق کو دیکھتے ہوئے گھر کی بالائی منزل پر ایک لائبریری بنادی تھی۔ اجالا اتراتی پھر رہی تھی۔

سعد اجالا کو اپنے ساتھ لاہور لے کر گیا بہت ساری کتابیں اُردو بازار سے خریدیں پھر تو سعد نے اسے اپنا ایک فرض ہی سمجھ لیا جہاں بھی جاتا اجالا کے لیے ڈھیروں شاپنگ کے ساتھ کتابیں لینا بھی ضروری خیال کرتا۔ وہ بہت باذوق تھی یہ انہی کتابوں کے مطالعے کا اعجاز تھا کہ اجالا اُردو ادب میں ماسٹر کا ارادہ رکھتی تھی جبکہ سعد اُسے ڈاکٹر بنانا چاہتا تھا مگر وہ اُسے ٹوکتا نہیں تھا وہ اپنی مرضی اس پر ٹھونسنا نہیں چاہتا تھا سعد اجالا کی خوشی کو ترجیح دیتا تھا۔

اجالا نے اپنے ارادے کی تکمیل کے لیے

”اچھا آ کر کر لینا۔“ لبتی نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا۔

”اچھا بابا اچھا۔“ اجالا پاؤں میں چپلیں اُس کر اُس کے ساتھ بولی۔

☆.....☆.....☆

رحمان کو بھی سعد نے چھوٹی سی جیولر شاپ بنا دی تو خالا کے دل میں رحمان کی شادی کا ارمان جاگ اٹھا لڑکی ڈھونڈی گئی اور جہاں خالا اور رحمان نے یہ طریقہ اپنایا کہ جب شاپنگ کرنے جاتے تب سعد کو وہ دونوں ساتھ لے کر جاتے بظاہر یوں لگتا جیسے وہ اُسے عزت دے رہے ہوں یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ وہ ایسے شو کرتے جیسے وہ سعد کے مشورے کے بغیر ایک قدم بھی اٹھانا پسند نہیں کرتے سعد اُن کو اپنی گاڑی میں لے کر جاتا وہ جی بھر کر من پسند شاپنگ کر کے نکل پڑتے اور لے منٹ سعد کرتا پھر وہ گھر لوٹ آتے۔

لبتی اور اجالا بھی شادی کی تیاریوں میں گرم تھیں اجالا اور لبتی نے ایک جیسے سوٹ بنوائے تھے۔ مہندی بارات اور ویسے کے لیے، اجالا نے لبتی کو بھی شاپنگ اپنے پیسوں سے کروائی تھی وہ روز شام میں بازار کو نکل جاتی تھیں میچنگ جوتے، میچنگ پرس، جیولری، بہت کچھ لینا تھا اُن کو۔

رحمان کا گھر چھوٹا ہونے کی وجہ سے مہندی کے فنکشن کا انتظام سعد کے گھر میں کیا گیا تھا لبتی اور اجالا مونگیا رنگ کے سوٹوں پر پیلے چنیری کے دوپٹے اوڑھے تیلیوں کی مانند اڑنی پھر رہی تھیں۔ دونوں نے ہی آج میک اپ کیا ہوا تھا بالوں کی چھیا بنا کر نیچے سے کچھ بال آزاد چھوڑ کر سوٹ کے ہم رنگ کچر لگائے تھے۔ بالوں میں بیلے کی کلیاں پر رکھی تھیں اُن کی سج دھج ہی نرالی تھی۔

لبتی نے اجالا کے دونوں ہاتھوں پر مہندی

انٹرمیڈیٹ میں آرٹس گروپ کا انتخاب کیا۔ وہ نرم خو تھی اپنے اساتذہ کی ہر دلعزیز طالبات میں شمار ہونے لگی۔ اُس کی ذہانت و خوبصورتی ہر کسی کو اپنا گرویدہ کر لیتی تھی وہ کالج میں ہر نصابی و غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی اس وقت بھی وہ اپنی لائبریری میں کسی کتاب کے پڑھنے میں مشغول تھی۔ کاسنی پلین کاشن کا سوٹ زیب تب کیسے وہ لاپرواہی سے پیر موڑے بیٹھی تھی اُس کے نوخیز چہرے پر حسین مسکان تھی۔ انداز بے فکر ہی و لاپرواہی کا مظہر تھا وہ کتاب سے نظریں ہٹا کر اپنی تخیلاتی جہان کی سیر میں محو ہو گئی۔ دوپٹے سے بے نیاز وہ اپنی ہی چھوٹی سی مصعوم دنیا میں گھومتی ہوئی تھی تبھی اُسے سیڑھیوں پر قدموں چاپ سنائی دی تھی اجالا چونکی چاپ بالکل قریب آ رہی تھی۔

”ہیلو کیسی ہو۔“ تبھی لبتی کا چہرہ سامنے آ گیا ہنستا مسکراتا، اجالا اٹھ کر اُس کے گلے لگ گئی دونوں کی نہ ختم ہونے والی باتیں شروع ہو گئیں۔ اکٹھے کھانا کھایا گیا انہی مذاق ہلاکلا ہوتا رہا، اجالا اُسے اپنے اشعار سناتی رہی لبتی واہ واہ کر کے داد دیتی رہی۔

”اجالا ذرا میرے ساتھ چلو مجھے دولان کے سوٹ لینے ہیں اور امی کی دوائی بھی لینی ہے اُن کی کھانسی ہے کہ رُکنے کا نام نہیں لے رہی۔“ لبتی نے اپنے آنے کا مدعا بیان کیا۔

”اچھا میں چلتی ہوں، دراصل کالج میں سکیئنڈ ایئر کی طالبات کا طالبات مشاعرہ سیشن کی ذمہ داری مجھے سونپی گئی ہے میرے کالج والے میری تخلیقی صلاحیتوں کے دل سے متعرف اور قدردان ہیں تم لوگ تو مارے باندھے ہی میری شاعری سنتے ہو، چلو چلتے ہیں دراصل مجھے تیاری کرنی تھی کل کے پروگرام کی۔“

”رحمان بھائی کو میں نے لابی میں جاتے دیکھا شاید جنریٹر آن کرنے آئے تھے کہیں وہ تو.....“ لبتی نے نچلے ہونٹ کا کونا دانتوں تلے دبا کر اپنی بات ادھوری چھوڑ دی۔

”پتا نہیں کون تھا..... میرے ہی گھر میں..... میرے ہی کمرے میں۔“ وہ روئے جا رہی تھی وہ سکتے کی کیفیت میں تھی ساری صورت حال غیر متوقع تھی وہ اڑی اڑی رنگت کے ساتھ بدحواس سی تاسف سے سر نفی میں ہلاتے ہوئے مسلسل اشک بہا رہی تھی۔

”اچھا ریلیکس ہو جاؤ، دیکھتے ہیں کہ وہ کون ہو سکتا ہے۔“

”اٹھو اپنی حالت ٹھیک کرو۔“

”نہیں مجھے نہیں جانا۔“ وہ ہچکیاں لیتے ہوئے بولی۔

”اجالا یہاں کیوں آگئی ہو باہر آؤ بیٹا۔“ سعد کی آواز پر اجالا نے جلدی سے خود کو سنبھالا تھا۔

”آپ جائیں ہم آتے ہیں، وہ بس اجالا مہندی خشک کر رہی تھی۔“ لبتی نے فوراً بات بنائی۔

”او کے آ جاؤ باہر۔“ وہ کہہ کر باہر نکل گیا شکر ہوا اُس نے اجالا کا رنجیدہ روپ اور بھگی آ نکھیں نہیں دیکھی تھیں ورنہ وہ سو سو سال کرتا پریشان ہوتا۔ لبتی اسے منت و سماجت سے باہر لے آئی تھی مگر اجالا محفل میں شریک ہوتے ہوئے بھی جیسے ذہنی طور پر غائب تھی۔

سب خواتین و حضرات رحمان کو مہندی لگا رہے تھے میوزک کے شور میں کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی تبھی اجالا کی نظر رحمان کے سفید کاشن کی میض کے دامن پر پڑی اور پھر کچھ لمحے وہ ساکت سی کھڑی کسی گہری سوچ میں گم ہو گئی۔

لگا دی تھی۔ اجالا پکھے کے نیچے اپنے ہاتھ پھیلائے گیلی مہندی سکھا رہی تھی گنگناتے ہوئے وہ اپنے آپ میں ہی کھوئی ہوئی تھی لبتی کچن میں چائے بنانے چلی گئی تھی۔ تبھی ایک دم پورا گھر اندھیرے میں ڈوب گیا اجالا ورطہ حیرت میں تھی کہ یہ کیا ہوا اوپر سے یہ احساس اُسے سہا گیا کہ وہ کمرے میں اس وقت اکیلی ہے۔

”لنسی کہاں ہو تم.....“ اُس نے پکارا اُس کی ہتھیلیاں سامنے کی طرف پھیلی ہوئی تھیں ورہ اپنے کپڑوں کو مہندی کے نقش و نگار سے بجا رہی تھی تبھی دروازے پر ہلکا سا کھٹکا ہوا اور کسی نے اجالا کو آ کر پیچھے سے اپنے حصار میں جکڑ لیا اجالا پہلے ہی سہی ہوئی تھی اس حصار میں کسماتے ہوئے بلند آواز میں لبتی کو آوازیں دینے لگی اُس کا نازک سا وجود مضبوط مردانہ شکنجے میں تھا۔ اجالا کا سانس مارے خوف کے رکنے لگا مردانہ گرفت میں جارحیت تھی جبر تھا۔

”کک..... کون.....؟“ اُس کے خشک حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نما آواز برآمد ہوئی۔ یہ لمحوں کی بات تھی وہ اُسے چھوڑ کر چلا گیا شاید اس کے لیے باہر بھاگتے قدموں کی آواز آئی تھی گھر روشنی میں نہا گیا اجالا یدہم سانسوں فق چہرے کے ساتھ روئے جا رہی تھی۔

”کیا ہوا.....“ لبتی نے اُس کی بکھری حالت دیکھ کر تشویش سے پوچھا۔

”کوئی تھا.....“ اجالا نے لے لے سانس لیے اس کے ہونٹ سکڑ گئے تھے۔

”کیا کہہ رہی ہو، کون تھا کیا ہوا ہے.....“ اور اجالا روتے ہوئے اٹک اٹک کر اُسے بتانے لگی لبتی نے لبوں پر ہاتھ رکھ لیا وہ حقیقتاً تھرا کر رہ گئی تھی۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

رحمان کی قمیض پر مہندی اس طرح لگی ہوئی تھی جیسے کسی نے دونوں ہاتھوں میں مہندی پکڑ کر قمیض پر مسلی ہو۔

کتنی سلجھ چکی تھی پہلے اُسے شک تھا اب جیسے شک یقین کا ہاتھ پکڑنے لگا وہ اکثر رحمان کی ٹٹولتی نظروں سے گھبرا جاتی تھی مگر وہ اُسے اتنی گندی نظروں سے دیکھتا تھا یہ اب اجالا کو احساس ہوا تھا اور اتنے مذموم ارادے کہ اجالا کی روح تک لرز کر رہ گئی۔ وہ جتنی بھی معصوم سہی، تھی تو ایک عورت نا، جو اپنے اوپر پڑنے والی ہر نظر کا مفہوم جان جاتی تھی رحمان کی میلی حرص زدہ نظریں ابھی بھی اجالا کے سر اُپے میں اُبھری ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ اجالا غصے سے تین تاتی ہوئی وہاں سے بھاگ کر اپنے کمرے میں جا گئی۔

لبنی نے اُسے جاتے ہوئے دیکھ لیا تھا وہ بھی اُس کے پیچھے ہی آگئی تھی اُس نے دیکھا اجالا بیڈ پر اوندھے منہ لیٹی رو رہی تھی۔

”کیا ہوا ایسے سب چھوڑ کر کیوں آگئی۔“ لبنی نے اُس کے پاس بیٹھتے ہوئے پیار سے کندھا چھوا۔

”وہ کون تھا مجھے پتا چل گیا ہے۔“ وہ روتے ہوئے اٹھ بیٹھی۔

”کون.....؟“

”رحمان..... بھیا.....“ اُسے بھیا کہنے میں بہت دقت ہوئی تھی۔

”مگر تم یہ اتنے وثوق سے کیسے کہہ سکتی ہو۔“

”جب اُس نے مجھے دبوچا تھا تب بالکل غیر اختیاری طور پر میں نے اپنے دفاع میں اُن کے بازو اپنے ہاتھوں سے ہٹانے چاہے تھے مگر اس کا فولادی دباؤ اتنا تھا کہ میں نے جھنجلا کر اس کی قمیض کا دامن مسل ڈالا کھینچا بھی، اور ابھی ابھی میں نے

دیکھا اُس کا دامن داغ دار بھی تھا اور مسلا ہوا شکن آلود بھی۔“ وہ اپنے تئیں کڑی سے کڑی ملا رہی تھی۔

”اوہو یار یہ تمہارا وہم بھی ہو سکتا ہے رحمان بھائی کے پیچھے ہی پڑ گئی ہو اب وہ اتنے بھی برے نہیں کہ اپنے ہی خاندان کی لڑکیوں کی عزت پر ہاتھ ڈالنے لگیں اور تم تو اُن کے بارے میں اس قدر نروس ہو رہی ہو کہ کبھی اُن کہہ رہی ہو کبھی اُس۔“

”بس لبنی جب دل میں کسی عزت نہ رہے تو پھر اگلے بندے کو آپ جناب کر کے مخاطب بھی کرنے کو دل نہیں کرتا اور..... اور مجھے تو رحمان سے گھن آ رہی ہے، کراہیت محسوس ہو رہی ہے، میں تو سعد بھائی کی طرح اُسے سمجھتی تھی اور اب..... اب لبنی میں اپنے ہی گھر میں اتنی بے اماں ہو گئی کیا مجھے کچھ اچھا نہیں لگ رہا کچھ بھی، میں سعد کو بتاؤں گی۔“

وہ بے دردی سے اپنی آنکھیں رگڑتی جیسے کسی فیصلے پر پہنچی تھی اور بڑی عجلت میں بیڈ سے اتری لبنی شپاگئی اور اُس کی کلائی پکڑ لی۔

”اجالا پاگل ہو گئی ہو کیا، شادی کا موقع ہے خواہ مخواہ بد مزگی ہوگی۔“

”ہوتی ہے تو ہوتی رہے، میں سعد بھیا کو ضرور بتاؤں گی۔“ اُس نے اپنی کلائی لبنی کی گرفت سے چھڑانا چاہی۔

”اچھا اچھا ایک منٹ۔“ لبنی نے اجالا کو پکڑ کر دوبارہ بیڈ پر بٹھایا اور خود اس کے سامنے بیٹھ گئی۔

”اجالا پلیز غصہ تھوک دو، مثال کے طور پر تم سعد بھائی کو کیا بتاؤ گی تمہیں بہت دقت اور خفت کا سامنا کرنا پڑے گا وہ تمہارے بڑے بھائی ہیں تم

مارے شرم کے اپنے محسوسات بتا نہیں سکوگی اور اگر بتا بھی دو تو کیا ثبوت ہے تمہارے پاس کہ وہ رحمان بھائی ہی تھے۔“ لبتی کی بات پر اجالا چپ کی چپ رہ گئی اور مارے جھنجلاہٹ کے پھر رونے لگی۔ لبتی نے اُسے رونے دیا اجالا کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ خود کو مار ڈالے یا اُس وحشی کو، جس نے اُسے ڈرا کر رکھ دیا تھا اپنے ہی گھر میں لرزا دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلا دن بارات کا تھا سعد مرتضیٰ حسب روٹین پُر جوش تھے جبکہ اجالا بجھی بجھی سی تھی تمام رات جاگنے کی وجہ سے سردرد بھی تھا اور بدن بھی جیسے ٹوٹ رہا تھا۔ وہ برأت کے ساتھ نہیں گئی تھی سعد بہت اپ سیٹ ہو گیا تھا مگر اجالا نے اُسے اطمینان دلا یا تھا کہ وہ ٹھیک ہے لبتی بھی اجالا کی وجہ سے نہیں گئی تھی۔ سارا دن اجالا کے ساتھ ہی رہی تھی سارا دن اجالا کا رونا وقفے وقفے سے چلتا رہتا تھا۔ لبتی اُسے سمجھا سمجھا کر عاجز آ رہی تھی مگر وہ تھی کہ سنبھل ہی نہیں پار ہی تھی۔

ویسے کی تقریب میں بس خاندان کے لوگ ہی تھے سعد اور لبتی کے بہت محبت بھرے اصرار پر اجالا نے شرکت کی تھی مگر اُس کی چمکتی آنکھوں کی جوت جیسے بجھ کر رہ گئی تھی۔ اُس کے انداز و برخاست میں بھی اکتاہٹ عیاں تھی۔ جوش و خروش مفقود تھے سعد نے یہ تبدیلی شدت سے نوٹ کی تھی لبتی اس کی غم زاد اُس کے ساتھ ساتھ تھی رحمان کی نگاہیں آج صرف عائشہ پر رُکی ہوئی تھیں۔ عائشہ بہت خوبصورت تھی اور آج تو شہر کے سب سے اچھے پارلر سے تیار بھی ہوئی تھی۔

شادی کے ہنگامے سرد پڑ گئے تھے زندگی پھر روٹین پر آ چکی تھی مگر اجالا اُسی کیفیت کے زیر اثر تھی وہ مشاعرے کی ذمہ داری لے چکی تھی اُسے

تیاری کرنی تھی بہت سارے دن بے کار کے شادی ہنگامے کی نظر ہو گئے تھے۔ اجالا بہت ساری کتابیں اپنے اطراف میں بکھرائے کاغذ پر کچھ لکھ رہی تھی۔ لکھتی پھر پڑھتی پھر اُس کاغذ کو مٹھی میں دبوج کر گولا سا بنا کر پھینک دیتی سعد کافی دیر سے اُس کی یہ بے چینی نوٹ کر رہا تھا۔ وہ اس کے پاس چلا آیا۔

”سلام عظیم شاعرہ صاحبہ۔“ اجالا نے نظر اٹھا کر سعد کو دیکھا پھر اپنے گزشتہ شغل میں لگ گئی۔ سعد گٹھنوں کے بل اس کے سامنے بیٹھ گیا۔

”کیا مسئلہ ہے مجھے نہیں بتاؤ گی۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ اجالا نے پہلے سے جھکاسر مزید جھکا لیا۔

”پھر یہ اتنے کاغذوں کی شامت کیوں آئی ہوئی ہے۔“ سعد نے لاڈ سے اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اجالا کا چہرہ اوپر اٹھایا اُس کی آنکھیں پانیوں سے لبالب بھر آئیں سعد کا دل جیسے کسی نے مٹھی میں لے کر مسل ڈالا۔

”کیا ہوا بہت دنوں سے چپ چپ ہو، مجھے بتاؤ۔“ سعد پریشان تھا۔

”میں نے سکیئنڈ ایئر کی طالبات کے ماہانہ مشاعرہ سیشن کی ذمہ داری لی تھی مگر مجھے لگتا ہے کہ میں کر نہیں پاؤں گی، مجھ سے شاعری کے متعلق کوئی بھی کچھ بھی نہیں لکھا جا رہا ہے۔“ وہ بچوں کی طرح سسکیاں بھرنے لگی۔

”اجالا تمہیں ذہنی یکسوئی کی ضرورت ہے بیٹا مجھے نہیں پتا کہ بات کیا ہے مگر کچھ ایسا ضرور تمہارے دل میں ہے جو تمہیں اندر ہی اندر کاٹ رہا ہے مضطرب و متوحش رکھتا ہے رلاتا ہے۔“

”نن..... نہیں تو.....“ اجالا کی رنگت اُڑ گئی۔

”کچھ تو ہے اجالا، بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے بیٹا۔“

سعد نے اجالا کا مومی ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھام کر پوچھا۔

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“ اُس کے ضبط کی حدیں یہیں تک تھیں وہ کرب انگیزی سے رو دی۔
”ڈر.....“ سعد متحیر رہ گیا۔

”کس بات کا ڈر۔“ سعد نے ایک بار پھر اجالا کا چہرہ اوپر اٹھایا۔ مگر وہ روئے گئی کچھ نہیں بولی۔ بہت سارے لمحے سوگ بھری خاموشی کی نظر ہو گئے اُس کے رونے میں ایسی اُن دیکھی تڑپ تھی کہ سعد حقیقی معنوں میں ڈر لیس ہو گیا۔

”کیا ہوا ہے اجالا پلیز بتاؤ، میرے دل میں بہت سارے دوسو سے جگہ بنا رہے ہیں، سب خیریت ہے یا اجالا بتاؤ تم سعد مرتضیٰ کا واحد رشتہ ہو میں تمہیں غمگین اور ایسے روتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا، بتاؤ مجھے۔“ وہ کچھ نہیں بولی بس سعد کے ساتھ لگ گئی سعد نے اُسے پیچھے کیا اور خفگی بھری نظر اجالا پر ڈالی۔

”امی یاد آ رہی ہیں۔“ اُس سے کچھ اور نہ بن بڑا تو یہ کہہ دیا کسی حد تک یہ بات سچ بھی تھی کہ آج کل اُسے امی کے وجود کی کمی بہت شدت سے محسوس ہو رہی تھی بہت ساری باتیں ایسی ہوتی ہیں جو لڑکیاں صرف اپنی ماؤں سے ہی کر سکتی ہیں۔
”یہ کیوں کہا پھر کہ ڈر لگ رہا ہے۔“ سعد مطمئن نہیں ہو رہا تھا۔

”مجھے بہت ڈراؤ نے خواب آتے ہیں اس لیے ڈر لگتا ہے۔“ وہ معصومیت سے بولی۔

”تم نے تو میری جان ہی نکال دی تھی پگلی خوابوں سے بھی کوئی ڈرتا ہے۔“

”بھیا آج رات کا کھانا باہر کھائیں۔“ اجالا نے سعد کی پریشانی دیکھ کر گفتگو کا رخ بالکل ہی دوسری طرف موڑ دیا وہ گلٹی فیل کر رہی تھی کہ اُس

نے سعد کو اتنا پریشان کر دیا۔

”اجالا مجھ سے ایک وعدہ کرو تم کبھی نہیں روگی، تمہاری بھگی پلکیں تمہارے بھائی کی جان نکال لیتی ہیں مجھے شرمندگی محسوس ہو رہی ہے کہ میں شاید تمہارا اُس طرح سے خیال نہیں رکھ پاتا جیسے مجھے رکھنا چاہیے۔“ سعد مرتضیٰ کی اُداسی نے اجالا کو جھنجھوڑ دیا۔

”نہیں نہیں بھیا ایسی کوئی بات نہیں پلیز آپ ایسا مت سوچیں۔“

”اچھا مجھے ذرا کام سے جانا ہے رونا نہیں، اپنا خیال رکھنا میں اور میرا بچہ ڈر باہر کریں گے۔“ سعد نے حسبِ عادت دونوں ہاتھوں میں اجالا کا چہرہ تھام کر اُس کی روشن پیشانی پر اپنے لب رکھ دیے۔ اور وہ کچھ دیر کے لیے ہی سہی مگر مطمئن سی ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

رحمان اپنی بیگم کے ساتھ ہر دوسرے دن آن دھمکتا تھا سعد عائشہ بھابی کی خوب آؤ بھگت کرتا اور اجالا بے چاری بولائی بولائی پھرا کرتی عائشہ بھابی کے پاس بیٹھتی تو رحمان کی نظریں گویا اجالا کا ہی طواف کرتی رہتیں بات بھلے وہ جس سے بھی کر رہا ہوتا مگر دیکھتا وہ صرف اجالا کو تھا۔

اجالا اُن لمحوں میں خود کو اتنا بے بس پاتی کہ کوئی حد نہیں رحمان کی اپنے وجود میں گڑی نظریں اُسے وحشت میں مبتلا کر دیتی تھیں مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اُسے میزبانی کے فرائض نبھانے پڑتے۔

اس وقت ماں کی یا بڑی بہن کی کمی اجالا کو بہت زیادہ محسوس ہوتی تھی ان دنوں وہ خود کو بہت اکیلا محسوس کر رہی تھی یوں لگتا تھا بے سروسامانی کا عالم ہے اور وہ کھلے آسمان تلے بالکل اکیلی کھڑی

ہے، تنہا، اداس، بے یار و مددگار، جیسے کہ اُس کا کوئی پرسان حال نہیں۔

اجالا کی ایسی خزاں آلود ڈری سہمی زندگی میں تبدیلی آئی تھی خوشگوار تبدیلی، رائمہ بھابی اور فاروق ترمذی دو لوگ اُس کی زندگی میں کیا آئے کہ وہ پہلے جیسی اجالا بن گئی۔ ہنستی کھلکھلاتی، زندہ دل، رائمہ بھابی غریب لڑکی تھیں، سعد مرتضیٰ نے سادگی کے ساتھ اُس سے نکاح کر لیا تھا رائمہ بھابی کے آنے سے اجالا کو دوسرا ہٹ ملتی تو وہ سارے ملال بھول گئی، رائمہ بہت خوبصورت ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اعلیٰ و ارفع خیالات رکھی تھیں بہت جلد وہ دونوں یوں گھل مل گئیں جیسے برسوں سے ایک دوسرے کو جانتی ہوں سعد بھی بہت خوش تھا رائمہ اُس کی محبت تھی۔

دوسری تبدیلی فاروق تھا۔ ہوا یوں کہ اجالا کو ریڈیو پر کام کرنے کی آفر ہوئی تھی فاروق ترمذی نے اُسے ریڈیو پر پروگرام کرنے کی پیشکش کی تھی وہ بہت خوبصورت دن تھا۔

”ہائے تم اتنی سادگی میں بھی غضب ڈھا رہی ہو۔“ پنک کلرو ایسے بھی اجالا کو بہت سوٹ کرتا تھا۔ اس کا نازک سراپا بالکل گلاب کے پھول کی مانند لگ رہا تھا۔

”تمہیں پتا ہے مہمان خصوصی کون ہیں مشاعرہ سیشن کے۔“ نائلہ نے پوچھا اُس کی کلاس فیلو تھی۔ اور ریڈیو پر کام کرتی تھی۔

”نہیں مجھے کیا پتا۔“ اجالا نے بے نیازی سے کندھے اُچکائے تب نائلہ اُس کا ہاتھ پکڑ کر اُسے نوٹس بورڈ کے سامنے لے آئی جہاں بڑے بڑے حروف میں فاروق ترمذی لکھا ہوا تھا۔

”ریلی نائلہ، کیا واقعی یار۔“ خوشی سے اجالا کی آنکھیں جگنوؤں کی مانند چمکنے لگیں۔

”وہ تو میرے موسٹ فیورٹ شاعر ہیں یار، کیا شاعری کرتے ہیں واہ، آج اُن سے ملاقات بھی ہو جائے گی۔“ اجالا بہت خوش تھی اپنی پسندیدہ ہستی سے ملنے کی خوشی اُسے ہواؤں میں اڑائے پھر رہی تھی مگر پھر وہ ایک دم چپ ہو گئی۔

”کیا ہوا۔“ نائلہ نے اُسے شہو کا دیا۔

”یار کیا پتا وہ مجھ سے بات کرنا بھی پسند کریں یا نہ کریں۔“

”اجالا تم تو خود شاعرہ ہو اور اتنی سلیجھی ہوئی اور خوش اخلاق ہو وہ تو ادبی دنیا کے بندے ہیں یا، تم نے ریڈیو پر کبھی اُن کے شوز سنے ہیں کیا، اُن کے پندرہ شعری مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔“ جو باتیں نائلہ اُسے بتا رہی تھی وہ سب اجالا پہلے سے ہی جانتی تھی۔

فاروق انہی کے شہر کا رہنے والا شاعر تھا اور اجالا بہت شوق سے اُن کی شاعری پڑھتی تھی۔

سخن شعاری ہی سمجھیں سخن وری کیا ہے
وگر نہ شعر تو ہر کوئی کہا کرتا ہے

پنک تمیض سفید چوڑی دار پاجامہ، لائٹ پنک اسکارف میں مقید اجالا کا معصوم و سحر طراز چہرہ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں، سفید ہاتھ پتھر و طلی انگلیوں کے چمکتے ناخن، وہ حسن کا شاہکار تھی کسی شاعر کی غزل تھی۔ وہ بالکل اُس کے سامنے اسٹیج پر دو زانو ہو کر بیٹھی تھی اس کے سامنے رکھے مکتب پر مائیک اور تازہ گلابوں کا بڑا سا گلدستہ رکھا تھا وہ بھی پھولوں میں خوشبو کی مانند نظر آ رہی تھی۔ بہت ساری نگاہوں کا مرکز بنی اجالا مرتضیٰ ذرا بھی نروس نہیں تھی ہولے ہولے خوبصورت لب و لہجے میں لفظوں کے موتی بکھیر رہی تھی اُس کی سریلی آواز کا اتار چڑھاؤ پُر اثر تھا موقع کی مناسبت سے اشعار کا انتخاب اور سخن شعاری کا ایک منفرد انداز اُس کے

اعلیٰ ذوق اور ادبی شناسائی و وابستگی کا پیمانہ رہا تھا۔ سب اسی کی جانب متوجہ تھے وہ خوش تھی مسرور سرشار تھی۔

محفل کے اختتام پر اجالا آڈیٹوریم سے نکل کر اساتذہ کے لیے مختص کمرے کی سمت جا رہی تھی تبھی اُس کی نظر فاروق ترمذی پر پڑی آٹو گراف بک لیے کھڑی لڑکیوں کے درمیان گھرا کھڑا تھا اجالا کی بے اختیار ہنسی نکل گئی اجالا نے اچھتی سی نظر لڑکیوں پر ڈالی اور آگے بڑھ گئی چونکہ اسٹیج پر بطور مہمان خصوصی وہ سلام دعا کر چکی تھی۔

”سنیے.....“ وہ ٹھٹک کر رُک کر فاروق کی طرف دیکھا وہ سب کو چھوڑ کر اُس کی سمت بڑھ رہا تھا۔
”جی.....“ وہ مودب سی بولی۔ گرے سلوار قمیض پر بلیک کوٹ پہنے وہ اونچا لمبا مرد بلاشبہ مردانہ وجاہت کا حامل تھا۔

”بہت خوب صورت بولتی ہو تم۔“ مسکراتے لب بولتی آنکھیں ایک پل کے لیے وہ نروس ہو گئی۔

”شکریہ۔“ وہ سر جھکا کر بولی لہجوں میں اُس کا ازلی اعتماد عود کر آیا۔

”ہوں۔“ گھنی مونچھوں تلے لب معنی خیزی سے مسکرائے۔

”آپ بہت اچھی شاعری کرتے ہیں۔“ اجالانے لگے ہاتھوں تعریف کر ڈالی۔

”تسلیمات، بس ہم تو کیکٹس کے پودے کی مانند ہیں سخت جان پودا، دیگستانوں میں اُگنے والا کیکٹس جس کی تلاش پانی ہوتی ہے پیاسا رہ کر کیکٹس کانٹوں سے بھر جاتا ہے بہت پیاس ہے میرے اندر بھی محبت کی اپنائیت کی، محبت کی تلاش پیاس کی صورت اندر باہر چکراتی پھر رہی ہے یہی پیاس یہی جستجو لفظوں کی صورت صفحہ قرطاس پر بکھر

جاتی ہے جسے لوگ شاعری کہتے ہیں۔“ اُس کے لہجے میں درد ہلکورے لے رہا تھا اجالا دم سادھے اُس کے لفظوں سے معنی اخذ کر رہی تھی۔

”میرے پاس آپ کی ساری کتابیں ہیں اور میں آپ کے ریڈیو شوز بھی سنتی ہوں۔“ وہ دھیرے سے بولی فاروق ترمذی نے گہری توجہ سے اُسے دیکھا تھا۔

”ویسے مس اجالا ایک بات تو مجھے ماننی پڑے گی۔“ وہ دلچسپی سے دیکھ رہا تھا۔

”کیا۔“

”بیوٹی وڈ برین کا ایسا دلکش امتزاج زندگی میں پہلی بار دیکھا ہے۔“ وہ شرارت سے ہنسا۔
اجالانے شرما کر سر جھکا لیا اُس کے عارضہ تمتمانے لگے ہونٹ تھر تھرانے لگے پلکیں حیا کے بوجھ سے جھک گئیں۔

مقابل تو بڑے بڑوں کو زیر بار کرنے کی صلاحیت رکھتا تھا اور یہاں تو معصوم سی اجالا تھی جملے سے جھانکتی ذرا سی معنویت سے چھوٹی موٹی کی مانند سمٹ گئی تھی۔

”آپ کو نیا مجموعہ کلام آنے پر مبارک ہو کلام بہت دل فریب ہے۔“ اجالانے اپنا دامن بجا کر سلیقے سے بات بدل دی فاروق ترمذی نے سر تسلیم خم کر کے ”نوازش“ کہا۔

”آپ سے مل کر بہت اچھا لگا اجالا۔“ وہ گھمبیر لہجے میں بولا۔

”مجھے بھی آپ سے ملنا اچھا لگا۔“

”اللہ حافظ۔“ وہ اپنا دل سنبھالتی نظریں جھکائے پلٹی۔

”فون ضرور کرنا لازمی۔“ وہ ہاتھ ہلاتے کہہ رہے تھے۔

”آہ..... دل بے خود.....“ نئے نئے نویلے

جذبات کی دلفریبی حواسوں پر چھانے لگی تھی۔
یہ اُن دونوں کی ملاقات تھی سحر انگیز شخصیت کا
مالک تیس سالہ خوبصورت فاروق ترمذی۔

☆.....☆.....☆

”رانیہ بھابی وہ بہت خوبصورت ہے آپ
دیکھتیں تو بس دیکھتی رہ جاتیں۔“ یہ جملہ وہ صبح سے
نیچانے کتنی بار کہہ چکی تھی رانیہ بس مسکرائے جا رہی
تھی کیا کہتی۔

”بھابی اُس کی آنکھیں اتنی ساحراتی بولتی
ہوئی سی ہیں کہ اُن کی آنکھوں میں دیکھا ہی نہیں
جاتا، مگر اُن کو تو جیسے عادت ہے مقابل کی آنکھوں
میں جھانکنے کی، بہت امپریسو پرسنالٹی ہے۔“ وہ
بے تکاب بولے جا رہی تھی اس وقت وہ بھابی کے
کنبل میں اُن کے ساتھ کھسی ہوئی تھی۔ رانیہ مسلسل
مسکرائے جا رہی تھی۔

آنے والے کچھ دنوں میں اجالا نے ایک دن
جھجکتے ہوئے فاروق کو فون کیا تھا وہ بہت خوش ہوا
اُس کی بے پایاں خوشی اُس کے لفظوں سے جھلک
رہی تھی پھر تو یہ سلسلہ ہی چل نکلا اُن کی ابھی تک
دوبارہ باقاعدہ ملاقات نہیں ہوئی تھی۔

انہی دنوں سعد کا بیٹا ہوا تھا گھر بھر میں خوشی کی
لہر دوڑ گئی تھی اجالا ننھا سا گڈا پا کر بہت خوش تھی۔
سارا دن اُسی کے ساتھ لگی رہتی اُس کے ہاتھ ایک
اور مصروفیت آ گئی تھی۔

وہ اپنے بھائی پھابی اور اب اپنے بھتیجے میں
کھو کر سب بھول گئی تھی رحمان کی بھی بیٹی سال بھر
کی ہو گئی تھی اجالا سکینڈ ایئر کے امتحانات سے فری
ہو کر گھر میں رزلٹ کا انتظار کر رہی تھی۔

زندگی سبک ندی کی طرح رواں تھی انہی دنوں
لبنی اور فرقان کی شادی ہو گئی۔ فاروق ترمذی سے
اچانک اُس کا رابطہ ٹوٹ گیا ابھی تو دل نے دھڑکنا

سیکھا تھا ابھی تو وہ تازہ تازہ محبت گزیدہ ہوئی تھی کہ
یہ جدائی درمیان میں کہاں سے آ گئی۔

اُس کا رزلٹ آ گیا تو اجالا نے تھرڈ ایئر میں
ایڈمیشن لے لیا اُس کا اور فاروق کا صرف فون پر
ہی رابطہ تھا اور تو وہ کچھ بھی نہیں جانتی تھی کہ وہ کہاں
رہتا ہے کس فیملی سے تعلق رکھتا ہے۔

اجالا جب بھی کالج جاتی اپنی گاڑی روک
روک کر اجنبی چہروں میں اُس آشنا کا چہرہ کھوجتی جو
اُسے بتائے بنا نجانے کہاں چلا گیا تھا۔ کالج میں
وہ چلتے چلتے رُک جاتی اُسے گمان گزرتا جیسے
فاروق نے اُسے صدا دی ہے وہ اُس کی تلاش میں
سرگرداں ادھر ادھر بھٹکتی رہتی۔ بالآخر ایک دن وہ
دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ریڈیو اسٹیشن چلی گئی وہ
وہاں بھی نہیں تھا۔ اجالا کو اپنی بے اختیاری پر جی
بھر کرتاؤ آیا بھلا ایسی بے خودی بھی کیا۔ مگر وہ چاہ
کر بھی خود کو سنبھال نہیں پارہی تھی۔

ایسے ہی بے کیف سے دن گزر رہے تھے کہ
ایک دن کوریئرسروس کے ذریعے خوبصورت سرخ
گلابوں کا تازہ بکے اُسے ملا وہ حیران تھی کہ اُسے
کسی نے پھول بھجوائے ہیں اُس نے بکے کے
ساتھ آئے پیکٹ کو کھولا واٹ اور بے بی پنک کلر کا
کارڈ تھا جس پر مس یو کے الفاظ جگمگا رہے تھے۔
ابھی وہ اسی حیرت میں تھی کہ اُن کے گھر کا فون
بجنے لگا وہ بھاگ کر گئی اور جلدی سے ریسیور اٹھایا۔
”ہیلو اجالا۔“ دوسری جانب فاروق تھا۔

”جی..... آپ کیسے ہیں کہاں ہیں؟“ وہ اپنی
رو میں اپنی تمام بے چیریاں بتاتی چلی گئی رورور
اُس نے اپنی ساری دلی کیفیات بیان کر ڈالیں
اُسے ذرا بھی احساس نہیں ہو سکا تھا کہ وہ کیا کر بیٹھی
ہے جب احساس ہوا تب دانتوں تلے زبان داب
لی مگر اب کیا فائدہ لفظ تو کمان سے نکلے تیر کی مانند

فاروق کے دل تک پہنچ چکے تھے۔

”تم سناؤ تمہاری شاعری کیسی جا رہی ہے۔“
”آج کل میری شاعری میں اداس کا رنگ
رج بس گیا ہے اداسی بس اداسی۔“
”میں بھی تمہارے فراق میں آہیں بھرا رہتا
ہوں مگر کیا کروں۔“

”اجالا کیا میں اتنا بخت آور ہو سکتا ہوں کہ
تمہارے جیسی لڑکی مجھے چاہے جس کا دل سچے
موتیوں جیسا ہے جس کی من موہنی سی صورت ہے جو
ہر فن میں طاق ہے۔“

”جلدی سے آجائیں نا۔“ اُس کی آواز میں
محسوس کی جانے والی بے چارگی و افسردگی تھی۔
”میں جلد آؤں گا وعدہ کرو گی ایک۔“ نجانے
وہ اُسے کون سے پیمان میں باندھے لگا تھا۔
”جی کہیے۔“ وہ ہمتن گوش ہوئی۔

”جی.....“ وہ بس اتنا ہی کہہ سکی پہلے ہی وہ
اپنی بے تابی ظاہر کرنے پر شرمندہ تھی۔
”سچ تو یہ ہے اجالا کہ میں پہلی ہی ملاقات
میں دل ہلا بیٹھا تھا مگر کہنے سے ڈرتا تھا کہ کہیں
تمہیں برا نہ لگ جائے۔“ وہ ہولے سے بولا۔

”جب میں آؤں تو سب سے پہلے تمہارا چہرہ
دیکھنا چاہتا ہوں۔“
”جی ضرور، کیوں نہیں۔“

”آپ کہاں چلے گئے تھے۔“
”پہلے یہ بتاؤ پھول اور کارڈ پسند آئے۔“
”وہ آپ نے بھیجے ہیں۔“

”ڈیلی بات کرتے رہیں گے اب، اداس
مت ہونا۔“

”جی میں نے بھیجے ہیں۔“ فاروق کا لہجہ
مٹھاس سموئے ہوئے تھا۔

”جی.....“ اجالا دھڑ دھڑ کرتے دل کو
سنجھالتی ہلکان ہو رہی تھی۔
”او کے میری جان اپنا بہت خیال رکھنا، پتا
ہے تم نے اپنا کیوں خیال رکھنا ہے۔“
”کیوں؟“

”اجالا میں نے ماس کیونیکشن امریکہ سے کیا
تھا پھر میں نے مائٹرز مضمون میں براڈ کاسٹنگ لیا اور
آج کل میں شکاگو میں ہوں ایک براڈ کاسٹنگ
اسکول سے ایک سال کا ڈپلومہ کرنے آ گیا تھا۔ یہ
ڈپلومہ میرے بہت کام آئے گا میں پاکستان میں
آ کر ریڈیو اشار براڈ کاسٹنگ اسکول کھولنا چاہتا
ہوں جہاں میں نوجوان لڑکے لڑکیوں کو ٹریننگ
دوں گا تاکہ وہ اپنی صلاحیتوں کا کھل کر مظاہرہ
کر سکیں۔“ فاروق بول رہا تھا اور اجالا توجہ سے سن
رہی تھی۔

”کیونکہ تم میری ہو۔“ فاروق نے گنگنا کر کہا
تھا۔

”جی.....“ اجالا کو تو یوں لگا جیسے دو جہان کی
خوشیاں مل گئی ہوں۔

اجالا کو کائنات کی ہر چیز میں سکون، خوبصورتی
نظر آ رہی تھی دراصل وہ خود خوش تھی تو اُسے ہر منظر
مسکراتا گنگنا تا دکھائی دے رہا تھا وہ خود کو ہواؤں
میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

بتا کر تو جانا چاہیے تھا نا۔ ایسے اچانک ہی چلے
گئے۔“ اجالا کے لبوں پر شکوہ نہ چاہتے ہوئے بھی
آ گیا۔

☆.....☆.....☆
اجالا اور رائمہ سعد کے ساتھ جا رہی تھیں۔
سعد کے کسی کو لیگ کی شادی تھی وہ وقت پر ہی پہنچ

”بس جلدی میں انفارم نہیں کر سکا، اب
رابطے میں رہوں گا اور جلد واپس آؤں گا۔“
”جی۔“

”کیا وہ حقیقتاً فاروق تھا یا مجھے غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ خود سے اُلجھ رہی تھی۔

میں تو اُسے ہزاروں کے مجمعے میں پہچان سکتی ہوں بھلا میری آنکھیں کیسے دھوکا کھا سکتی ہیں وہ فاروق ہی تھا۔“ وہ خود کلامی کرتے ہوئے جیسے خود کو باور کروا رہی تھی۔

تبھی کھانا شروع ہو گیا۔ رائے نے اُسے آواز دے کر بلا لیا تو وہ وقتی طور پر اُس اُلجھن سے نکل گئی مگر واپسی کے سفر میں پھر وہ یہی سب کچھ سوچ رہی تھی اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا..... اُس کا دل ماننے کو تیار نہیں تھا کہ جو اُسے نظر آیا وہ فریب نظر تھا وہ تو شکاگو میں تھا روز وہاں سے فون کرتا تھا۔

اجالا کو تازہ پھول اسی شہر سے ہی بھیجے گئے تھے مگر اُس نے پوچھا ہی نہیں تھا فاروق سے یا پھر اُس نے باریک بینی سے غور کرنے کی نہ ہی کوشش کی تھی اور نہ ہی ضرورت سمجھی تھی۔

نجانے وہ کب تک اُلجھتی رہتی کہ اگلے دن فاروق کا فون آ گیا۔

”کیسی ہے میری جان۔“ فاروق ترمذی نے سارے جہان کی چاہتیں اپنے لفظوں میں سمودی تھیں۔

”جی ٹھیک ہوں، تم کیسے ہو۔“

”اپنی جان کی دعاؤں کی بدولت خوش باش ہوں۔“ وہ خوش نظر آ رہا تھا۔

”فاروق کل میں نے تمہیں دیکھا تھا۔“

”مجھے دیکھا، ہا ہا ہا.....“ اُس نے تہقہ لگایا اور پھر تادیر اسی انداز میں ہنستا رہا جیسے اُسے اجالا کی دماغی حالت پر شبہ ہو۔

”میں سچ کہہ رہی ہوں میں نے تمہیں دیکھا۔“ وہ وثوق سے بولی۔

گئے تھے ہوٹل میں بکھری جگمگاتی، چمکدار اور روشنیوں کے عکس میں ادھر ادھر اڑتی پھرتی، خوشنما خوش رنگ ملبوسات میں ماڈرن طرح دار لڑکیاں، شوخیاں، شرارتیں، میزبان خواتین بہت محبت سے ملیں اتنی ڈینٹ، ویل ایجوکیٹڈ، ٹپ ٹاپ ماڈرن، اسٹائلش اور لبرل خواتین، جبکہ رائے اور اجالا دونوں ہی ایک جیسی تھیں سادہ طبیعت آج بھی کوئی خاص تیاری نہیں کی گئی تھی مگر پھر وہ دونوں بے حد اچھی اور پُرکشش لگ رہی تھیں۔

یہ شہر کا سب سے بڑا اور مہنگا میرج ہال تھا اتنے بڑے پیمانے پر آرینج کیا ہوا یہ وسیع اور ماڈرن فنکشن جہاں مہمانوں کی ایک خاصی بڑی تعداد موجود تھی اجالا کے لیے کوئی چہرہ بھی شناسا یا مانوس نہیں تھا۔ سارے چہرے اسی جیسی تھے مگر جیسے رنگ و نور کا سیلاب تھا۔ جو جہاں امنڈ آیا تھا اجالا ایک الگ تھلگ کونے میں بیٹھی ہنستے مسکراتے چہروں کو دیکھ کر خوش ہو رہی تھی۔

انٹرنس پر اچانک ہی غیر معمولی صورت حال پیدا ہونے اور مہمانوں، خواتین و حضرات کے جھمکنے کی صورت میں رش سا اکٹھا ہونے کے آثار نظر آ رہے تھے۔ وہاں کا فاصلہ زیادہ نہیں تھا اجالا نے سبھی لوگوں کو تیزی سے باہر کی طرف جاتے دیکھا اچانک اجالا کو وہ نظر آیا تھا۔

بجلی کی سرعت سے جیسے سب واضح ہو گیا اجالا کی آنکھیں دھندلا گئیں اور سانسیں وہیں تھم گئیں اور دل..... دل تو لگتا تھا حرکت کرنا بند کر دے گا۔ پھر اُس سے تیزی سے اُسے واپس پلٹتے دیکھا وہ جارہا تھا اجالا تیزی سے اُٹھ کر اُس سمت بھاگی تھی جدھر فاروق ترمذی گیا تھا مگر وہاں اُس کا نام و نشان تک نہ تھا۔ اجالا دھواں ہونی سانسوں کے ساتھ واپس لوٹی۔

اجالا نے رو رو کر اپنی آنکھیں سجالیں رائے۔
اُن دنوں پھر پریکٹس تھی۔ وہ پڑمردہ اور نڈھال
سی رہتی تھی اُجالا نے رائے کو بھی نہیں بتایا کہ فاروق
اُس سے روٹھ گیا ہے اور اب وہ اُسے کیسے منائے
کاش اُجالا رائے کو بتا سکتی مگر اُس کی طبیعت کی وجہ
سے وہ اُسے کیسے بتاتی۔ اُجالا کو فاروق خود ہی کال
کرتا تھا۔

اُس نے تو کبھی نمبر دیکھنے کی زحمت بھی گوارا
نہیں کی تھی وہ اتنی معصوم اور سادہ تھی کہ وہ جھوٹ
بھی بولتا تھا تو وہ سچ مانتی تھی بھروسا اور یقین تو محبت
کی پہلی سیڑھی ہوتے ہیں اور اُس نے تو اعتبار کی
سیڑھی پر پہلا قدم ہی اعتماد سے رکھا تھا یقین کامل
ہی تو بندگی ہوتا ہے۔ کسی نے سچ ہی کہا کہ محبت
اندھی ہوتی ہے محبت کی اپنی آنکھیں تو ہوتی ہی
نہیں ہیں محبت دنیا کا ہر منظر ہر رنگ محبو کی نظروں
سے دیکھتی ہے اور ہمیشہ دیکھنا چاہتی ہے محبوب کی
نظر سے دیکھنا بہت دلربائی بہت کشش رکھتا ہے۔

دو دن خوب تڑپانے کے بعد فاروق نے اُجالا
کو فون کیا تھا گلے شکوے ہوتے رہے اُجالا مسلسل
روتی رہی اُسے مناتی رہی۔ پھر وہ مان لہی گیا۔
”اچھا اب رو کر مجھے تکلیف مت دو، آنسو
صاف کرو۔“ فاروق نے پیار سے ڈپٹا اُجالا سوں
سوں کرتی ناک کے ساتھ اپنے آنسو صاف کرنے
لگی۔

”اب ٹھیک ہونا اُجالا۔“

”جی ٹھیک ہوں۔“

”بھائی اور بھیا کیسے ہیں، اور گڈو کیسا ہے۔“

اب وہ روٹین کی باتیں کر رہا تھا موڈ ٹھیک تھا۔

”جی بالکل ٹھیک خوش باش۔“ اُجالا خوش دلی

سے بولی۔

”کہاں دیکھا میری معصوم بلبل نے اپنے
فاروق کو۔“ وہ ابھی بھی ہنس رہا تھا۔ وہ کیوں
مسلسل ہنس رہا تھا اُجالا کی سمجھ سے بالاتر چیز تھی۔

”کل میں سعد بھیا کے ساتھ ایک شادی کی
تقریب میں گئی میں ایک الگ تھلگ کونے میں
بیٹھی تمہیں یاد کر رہی تھی تم مجھے بہت یاد آ رہے تھے
میں ہر چہرے میں تمہارا چہرہ کھوج رہی تھی مجھے ہر
چہرہ تمہارے چہرے سے مشابہ لگ رہا تھا۔ تبھی
انٹرنس کی طرف سے میں نے تمہیں ہال میں آتے
اور پھر ٹھٹھک کر رکتے اور پھر تیزی سے باہر کی
طرف جاتے دیکھا میں اُٹھ کر تمہارے پیچھے بھاگی
تب تک تم غائب ہو چکے تھے۔“ اُجالا کہتے کہتے رو
دی۔

”اُجالا ایک آنسو بھی بہایا تو میں تم سے بات
نہیں کروں گا اپنے آنسو صاف کرو جلدی
شاباش۔“

”جی کر لیے۔“ اُجالا نے جلدی سے آنکھیں
رگڑیں۔

”اچھا میری جان دیکھو میری بات سنو میں
تا حال شکاگو میں ہی ہوں دوسری بات یہ کہ تم مجھ
سے بہت محبت کرتی ہو ہر جگہ مجھے دیکھتی ہو اسی لیے
تمہیں گمان گزرا ہوگا۔ تمہارا اپنا خیل مجسم وجود بن
گیا ہوگا پگلی، تمہاری آنکھیں صرف مجھے ہی دیکھنا
چاہتی ہیں نا تو ہر طرف تمہیں فاروق ہی دکھائی دیتا
ہے ٹھیک کہہ رہا ہوں نا۔“

”جی..... مگر.....“

”اگر مگر کچھ نہیں، کیا میں یہ سمجھوں کہ تمہیں مجھ
پر بھروسا نہیں، کیا تمہیں لگتا ہے میں جھوٹ بول رہا
ہوں۔“ فاروق کے الفاظ سے غصے کے ساتھ برہمی
پکھنے لگی اور اُس نے فون بند کر دیا اُجالا کی جان پر
بن آئی فاروق ناراض ہو گیا تھا۔

”ہمارے گھر نیا مہمان بھی آنے والا ہے۔“

”واؤ، مبارک ہو، بہت خوشی کی بات ہے۔“

”جی بالکل۔“

پھر وہ بہت دیر ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے وقت کو جیسے پر لگ گئے وہ ناراض تھا تو وقت گزارے نہیں گزرتا تھا اب وہ مانا تھا تو جیسے وقت ہاتھوں سے ریت کی مانند پھسلا جا رہا تھا شام کے سائے چاروں طرف پھیلنے لگے تب فاروق نے نہایت محبت و لگاؤ سے آہیں بھرتے فون بند کیا تھا۔

سعد مرتضیٰ کے ہاں بیٹی ہوئی تھی اجالا کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ سعد مرتضیٰ کو تو گو یافت اقلیم کی دولت مل گئی تھی سعد مرتضیٰ پہروں بیٹی کو گود میں لٹائے تکتا رہتا، اُس کے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں کو چومتا رہتا راتوں کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔

اجالا کے بی اے کے امتحانات سر پر تھے وہ دل و جان سے محنت کر رہی تھی۔ راتوں نے ذرینہ کو خصوصی تاکید کر رکھی تھی اجالا کے حوالے سے، ذرینہ رات کو پا قاعدگی سے اجالا کے کمرے میں دودھ رکھ کر جاتی تھی اجالا کے کمرے میں فریج میں فروٹس چیک کرتی پہلا ختم ہو جاتا تو اور فروٹ رکھ جاتی یہ راتوں کی ہدایات تھیں جن پر ذرینہ سختی سے عمل کرتی تھی۔

اجالا آخری پیر دے کر آئی تو لمبی تان کر سو گئی بہت دیر تک وہ سوئی رہی۔ سعد کئی مرتبہ اُس کے کمرے میں آیا اُسے سوتا پا کر پھر پلٹ گیا۔ سعد کی اپنی اولاد بھی ہو گئی تھی۔ مگر اجالا کے لیے اُس کی محبت میں رتی برابر فرق بھی نہیں آیا تھا۔ سعد اجالا سے ہمیشہ کی طرح محبت کرتا تھا اُس کا خیال رکھتا تھا لاڈ کرتا تھا۔ راتوں بھی روایتی بھابی ثابت نہیں ہوئی تھی وہ بھی اچھی محبت کرنے والی بھابی تھی۔

اجالا نے خوب نیند پوری کی تھی بہت دنوں

سے وہ اپنی پسند کی موویز دیکھنا چاہ رہی تھی مگر فرصت کے لمحات اُسے میسر نہیں آ رہے تھے اب امتحانات کا بوجھ سر سے اُترا تھا تو وہ خود کو ہلکا پھلکا محسوس کر رہی تھی۔ کنبی کے بھی بیٹی ہوئی تھی اور وہ اپنی بیٹی میں مصروف ہو کر رہ گئی تھی۔

اتوار کا دن تھا لہذا اپنی بیٹی کے ساتھ اجالا کے بے حد اصرار پر اُس کے گھر آئی تھی اجالا اُسے اپنے بیڈ روم میں لے آئی تھی۔ اجالا کا پروگرام انڈین مووی ”کچھ کچھ ہوتا ہے“ دیکھنے کا تھا وہ لہذا کے ساتھ مووی دیکھ رہی تھی مگر لہذا بیٹی کے ساتھ ہی لگی ہوئی تھی اجالا بار بار اُس کی توجہ مووی کی طرف دلاتی مگر لہذا کی توجہ بار بار بیٹی کی طرف لگ جاتی وہ بڑی مشکل سے سوئی تو تب لہذا اجالا کی طرف متوجہ ہوئی تھی شاہ رخ خان اور کاجول اجالا کے فیورٹ اداکار تھے۔

”دفع ہو جا، تک کر بیٹھتی ہی نہیں ہوتی تو۔“ بیٹی کے کسمسانے پر اجالا نے دیکھا لہذا سب چھوڑ چھاڑ جا کر بیٹی کے پاس بیٹھ گئی، اجالا کی بات پر لہذا ہنس دی۔

”تم چھڑی چھانٹ ہو اور میں شادی شدہ ایک بیٹی کی ماں، سمجھو اس بات کو۔“

”مجھے نہیں پتا۔“ اجالا نروٹھے پن سے بسوری۔

”راہول کھنہ کتنا اسٹو پڈ ہے نا کہ اُسے انجلی کی سچی محبت نظر کیوں نہیں آ رہی، وہ اپنے گھر جلتے ہوئے زار و قطار رو رہی ہے سب کو سمجھ آ رہی ہے مجھے سمجھ آ رہی ہے راہول کھنہ کو سمجھ کیوں نہیں آتی انجلی کے آنسو راہول کو ساری کہانی سنار ہے نہیں انجلی کے دل میں چھپے سارے جذبے آشکار کر رہے ہیں وہ اندھا ہوا کھڑا ہے وہ لہذا دیکھو ذرا۔“ اجالا لہذا سے مخاطب تھی اور لہذا نے کب بیٹی کو لے کر کچن میں چلی گئی تھی۔ بیٹی کو بھوک لگی تھی اجالا تلملا کر رہ

گئی اُسے سمجھ آ چکی تھی کہ لہنی اب صرف ماں ہے۔

☆.....☆.....☆

”میں آرہا ہوں اجالا اور میں پاکستان کی سرزمین پر قدم دھرنے کے بعد جو دیکھنا چاہتا ہوں وہ تمہارا چہرہ ہے میں نے یہ وقت تمہارے بغیر کیسے گزارا ہے یہ تمہیں بتانا ہے ان گزرے ماہ و سال میں میرے اندر کیسے تمہارا ہجر پل پل مجھے تھلستا رہا ہے یہ داستان ہجر و الم تمہیں سنانی ہے۔

”تم آؤ گی نا۔“ فاروق ترمذی بڑی آس سے پوچھ رہا تھا وہ امید و تبہم کی کیفیت میں تھا۔

”جی ضرور۔“ اجالا نے بغیر سوچے سمجھے ہامی بھری۔

”بیچ اجالا۔“ وہ نہال سا ہو کر رہ گیا۔

”پرسوں منگل واسلے دن بارہ بجے لاہور ایئر پورٹ پر پہنچ جانا میں تمہاری من موہنی صورت دیکھ کر اپنی ٹھکن اُتارنا چاہتا ہوں تمہارے سحر آفریں حسن میں سر تا پا ڈوب کر سیراب ہونا چاہتا ہوں۔“

”آؤ گی نا۔“ جذب سے بولتے بولتے آخر میں اُس کا لہجہ ملتتی ہو گیا اور اجالا سرا سیمہ سی سوچ میں پڑ گئی۔

”میں کبھی اکیلی لاہور گئی نہیں۔“

”تو کیا ہوا، گاڑی تمہاری اپنی ہے پُر اعتماد ہو پڑھی لکھی ہو کیا مسئلہ ہے۔“

”وہ تو ٹھیک یہ مگر سعد بھیا مجھے اکیلے بھیجنے پر آمادہ نہیں ہوں گے۔“

”اُن کو بتانے کی یا اجازت لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں ہے تم باشعور ہو بالغ ہو ہر وقت سعد کے مسائل میں مت الجھا کرو، اپنی زندگی آپ جیو۔“ وہ اُسے نجانے کون سی باتیں سمجھا رہا تھا کس راہ پر چلانا چاہ رہا تھا۔

”مگر.....“ اجالا ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

”اگر مگر کچھ نہیں، تمہیں آنا ہے ہر صورت رات تک سوچ لو میں پھر کال کروں گا۔“

”جج..... جی.....“ اجالا نے خشک ہوتے لیوں پر زبان پھیری۔

”مگر ایک بات یاد رکھنا اجالا اگر تمہارا جواب نفی میں ہوا تم نے آنے سے انکار کر دیا تو میں پاکستان کبھی بھی لوٹ کر نہیں آؤں گا شکاگو میں ہی اپنی جان دے دوں گا۔“ فاروق نے فون بند کر دیا۔

”نہیں..... نہیں۔“ اجالا لبوں پر ہاتھ رکھے اپنی سسکیاں دباتی رہی وہ تو اس کے بغیر جینے کا تصور بھی محال سمجھتی تھی پھر وہ کیا کرے سعد مرضی سے چھپانا اُسے اچھا نہیں لگ رہا تھا اور بتانے کی صورت میں سعد اُسے لاہور جانے کی اجازت نہیں دیتا عجیب کشمکش تھی جس میں اجالا اُلجھ کر رہ گئی تھی کیا کرے۔

رات کو اُس نے دوبارہ فون کیا تھا مگر بات کے آغاز میں ہی پھر وہی بات دہرا دی تھی کہ اجالا نے اگر ایئر پورٹ آنے سے انکار کیا تو وہ یہیں شکاگو میں ہی اپنی جان دے دے گا۔ اجالا کبھی ہاں کہہ دیتی اور کبھی ٹال مٹول کرنے لگ جاتی۔

”اجالا ایک بات بتاؤ تمہیں مجھ سے محبت ہے۔“ وہ عجیب رنجیدگی سے پوچھ رہا تھا۔

”جی بہت زیادہ۔“ اُسے کہنے میں کوئی تامل نہیں تھا اُسے اعتراف کرنے میں کوئی عار نہیں تھا۔

”جھوٹ بولتی ہو تم۔“ وہ دھاڑا اُس کی دھاڑ میں آنسوؤں کی آمیزش بھی شامل تھی۔

”نہیں فاروق ایسے مت کہو، میں تم سے بہت محبت کرتی ہوں۔“ اجالا کپکپاتے ہوئے رو دی۔

”غلط کہتی ہو تم، کیا ثبوت ہے کیسے ثابت کر سکتی ہو تم۔“

”جیسے تم کہو فاروق۔“ وہ بے کسی سے رو دی۔

تھی۔ وہ بہت بار سعد کے ساتھ لاہور گئی تھی راستے اُسے ازبر تھے مگر اکیلے جانے کا خیال اُسے سہا رہا تھا اسٹیئرنگ پر دھرے اُس کے ہاتھوں کی لرزش واضح تھی مارے گھبراہٹ کے اجالا کا حلق بار بار خشک ہو رہا تھا پاؤں جیسے بے جان ہو رہے تھے۔ اندھیرا چھٹ رہا تھا اجالا چاروں طرف پھیل رہا تھا۔

”اوہ بھیا اٹھ گئے ہوں گے۔“ اجالا نے ایک دم گاڑی روک دی اُس کے دل کو کچھ ہونے لگا۔ وہ اٹھتے ہی سب سے پہلے میرا پوچھیں گے۔“ اجالا کو ڈھیروں خفت نے آن گھیرا اُس کے بالائی لب پر پسینے کے ننھے ننھے سے قطرے ابھر آئے شرمندگی سے اجالا کی آنکھیں آنسو ڈھونڈ لائیں اُس نے بے اختیار اپنا سراسٹیئرنگ پر گرا دیا یہ پہلا جھوٹ تھا یہ پہلی خطا تھی یہ پہلی خود غرضی تھی جو اجالا نے کی تھی وہ نادم تھی پشیمان تھی۔

”مجھے گھرنہ پا کر وہ کیا سوچیں گے اور میں واپس جا کر اُن کو کیا بتاؤں گی کہ میں کہاں گئی تھی۔ کیوں گئی تھی۔“ وہ روئے گئی پچھتانے لگی سعد مرتضیٰ نے اُسے بھائی کی محبت و مان ہی نہیں ایک باپ کی شفقت سے بھی نوازا تھا اپنے ہاتھ کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔

”مجھے واپس لوٹ جانا چاہیے کہہ دوں گی کہ جاگنگ کے لیے گئی تھی۔“ مگر فاروق کے الفاظ اس کا ارادہ متزلزل کر رہے تھے۔

”اجالا میرے دل میں تمہارے لیے بہت عزت بہت محبت اور بے پناہ خلوص ہے دل کرتا ہے تم جہاں جہاں قدم رکھو وہاں دور دور تک صرف پھول ہی پھول ہوں۔ تم یقین کیوں نہیں کر لیتیں کہ تم فاروق ترمذی کے لیے بہت خاص ہو۔ میں تمہیں کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتا۔ میں تمہارے بغیر

”اجالا تمہیں مجھے ملنے آنا ہے میں صرف تمہیں دیکھنا چاہتا ہوں اجالا میں تم سے بے حد بے شمار بے حساب محبت کرتا ہوں تمہیں دیکھا تو جینے کی امنگ دل میں بیدار ہو گئی ایک مخلص ہم سفر کی طلب دل کرنے لگا تمہاری طرف ہنسنے لگا تم دنیا میں وہ واحد ہستی ہو جو بغیر کہے میرا دکھ جان جاتی ہو۔ میری درد آشنا ہو تکلیف مجھے ہوتی ہے تمہیں وہاں اتنی دور علم ہو جاتا ہے تم نے میری خالی، رتھجوں کی ماری آنکھوں کو نیندوں سے بھر دیا ہے بیٹھی نیند سونے لگا ہوں۔ میری مسکراہٹ اور ہنسی کھوکھلی بے جان ہوا کرتی تھی اب میں زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کا مالک بن بیٹھا ہوں تم میری تمنا ہو، میرا تمہارے سوا کوئی نہیں ہے تم بھی مجھے رونے بلکنے کے لیے اس دنیا میں بے بارود دگار چھوڑ دو گی نا۔“ اُس کی آواز رندھ گئی حلق آنسوؤں سے بھر گیا اجالا کی توجان پر بن آئی۔

”فاروق میں ضرور آؤں گی چاہے کچھ بھی ہو۔“ وہ پُر عزم اور مضبوط لہجے میں بولی۔

”ہاں تمہیں آنا ہوگا۔“ وہ دوسری طرف خباث سے مسکرایا تھا۔ پھر فاروق نے ہلکا سا استہزائیہ قہقہہ لگایا اور پھر ہنسا تھا عجیب سرور بھری ہنسی خمار آلود قہقہے لگاتا رہا اُس کی ہنسی میں فتح کا غرور تھا پالینے کا نشہ آورا احساس اُسے طمانیت بخش رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح اجالا بہت جلدی اٹھ گئی تھی۔ اُس نے رائے کو بھی نہیں بتایا تھا۔ چونکہ دار غلام عباس فجر کی نماز کے لیے مسجد گیا ہوا تھا۔ اجالا نے جلدی سے گاڑی پورچ سے نکالی اُس کے ہاتھ پاؤں کانپ رہے تھے سعد مرتضیٰ کا ڈبل اسٹوری کا گھر اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا اور سعد مرتضیٰ کی لاڈلی بہن مین گیٹ کھول کر گاڑی سڑک پر ڈال چکی

”چھوڑو، یا گل ہو کیا، لوگ.....“ اجالا کی گھٹی گھٹی آواز دہرائی۔

”اوائے کون ہو تم لوگ، یہ پاکستان ہے لندن نہیں ایسی بے حیائی کا کھلے عام مظاہرہ، ڈوب مرو، پکڑو ان کو، تھانے لے چلو، ان کی ساری بدمعاشی نکالتے ہیں۔“ کوئی پولیس والا تھا وہ دونوں بوکھلا کر الگ ہوئے دوسرے لفظوں میں فاروق نے اُسے خود سے الگ کر دیا۔ اس سے پہلے کہ وہ سنبھلتی پولیس والوں نے اجالا اور فاروق کو پکڑ کر اپنی گاڑی میں دھکیل دیا۔ وہ دونوں بات سنیں، بات سنیں ہی کرتے رہے مگر پولیس والوں نے اُن کی کوئی بات نہیں سنی۔

حالات و واقعات ایسی کروٹ لیں گے یہ تو اجالا کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا اور فاروق تو مرد تھا محافظ تھا اس وقت ڈیل کرنا معاملات کو ٹھیک کرنا اُس کا فرض تھا مگر وہ کچھ بھی نہیں کر پایا تھا یا پھر جان بوجھ کر کچھ کرنا ہی نہیں چاہتا تھا اجالا تو کسی چڑیا کی مانند سہمی ہوئی تھی۔ اُسے تو کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہی تھی یہ یہ سب کیا ہوا ہے۔

پولیس کی گاڑی تھانے کے بڑے سے گیٹ سے اندر داخل ہوئی ایک پولیس والے نے اجالا سے اُس کا پرس، چھین کر اُس کے بال مٹھی میں جکڑ کر اُسے بے دردی سے کھینچا تھا اجالا کی درد بھری سکاری نکلی اُس نے آنسو بھری آنکھوں سے فاروق کی طرف مدد طلب نظروں سے دیکھا۔ وہ سعد مرتضیٰ کی پناہوں سے نکل کر خوار ہو رہی تھی۔ اُس نے کس پر بھروسا کیا جو اُسے بچا نہیں پایا تھا۔ کرخت چہرے والی عورت اُسے طعنے تشنے دیتی گھسیٹ رہی تھی اُس نے پھر پیچھے دیکھا تھا فاروق وہیں کھڑا تھا ایک لمحے کے لیے اجالا کو لگا جیسے فاروق مسکرا رہا ہے، اطمینان سے کھڑا ہے۔

مر جاؤں گا میرے پاس تمہارے سوا کچھ نہیں ہے میرا سب کچھ تم ہو۔“ فاروق کی آواز اُسے کسی بازگشت کی طرح سنائی دینے لگی وہ شاعر تھا لفظوں کی جادوگری کا ماہر، ہر ہنر میں طاق۔

”اجالا نے واپس پلٹنے کی ایک کوشش کی مگر کوششیں بھی بھلا کبھی انسانوں آ کے چاہنے سے کامیاب ہوا کرتی ہیں۔“ وہ اب دوبارہ عازم سفر تھی آگے کی طرف جدھر فاروق تھا جس سے وہ محبت کرتی تھی۔ وہاڑی کا کوئی علاقہ تھا جب اُسے شدت کی بھوک کا احساس ہوا تھا اُس نے گاڑی روک کر قریب سے ایک لڑکے کو اشارہ کیا نو عمر سا لڑکا جو بہت پھرتی سے برگر بنا رہا تھا لپک کر آیا اجالا نے اُسے ایک برگر لانے کو کہا تھا۔

☆.....☆.....☆

اجالا گیارہ بجے کے قریب لاہور پہنچ گئی تھی اُس نے اپنے بالوں کو برش کیا ڈیش بورڈ پر پڑی چھوٹی سی پانی کی بوتل اٹھائی ٹشو بھگو بھگو کر اپنا چہرہ صاف کیا ہلکی سی پنک لپ اسٹک کا جل کی ہلکی سی دھار سے ہی اُس کا چہرہ تروتازہ گلاب کی مانند کھل اٹھا۔ رائل بلیوسوٹ، ہم رنگ شال کندھے پر ٹکائے وہ گاڑی سے باہر نکلی۔ ایئر پورٹ پر معمول کارش تھا وہ ایک لچلے کے لیے گھبرا گئی۔

”سلام مادام۔“ تبھی کوئی اُس کے قریب سے چپکتی آواز میں بولا اجالا مڑی۔

”فاروق۔“

”ہاں میری جان میں آدھا گھنٹہ پہلے آ گیا بہت بے تاب تھا تمہیں دیکھنے کے لیے۔“ فاروق نے اُسے کندھوں سے تھام کر سینے سے لگا لیا وہ بوکھلا گئی اور خود کو الگ کرنے کی کوشش کرنے لگی مگر اُس کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہو سکی۔ فاروق اُسے اپنے ساتھ لگا کر بچھے جا رہا تھا۔

دوشیزہ 127

READING
Section

”پولیس والے اُسے کیوں نہیں لے کر جا رہے۔“ اجالا نے اُس عورت سے پوچھا۔
 ”بکواس بند کر چل آگے۔“ اُس عورت نے سلاخوں کے پیچھے اجالا کو سفاکی و بے رحمی سے دھکا دیا تھا اُس کا سر زور سے دیوار سے ٹکرایا اور وہ ہوش و خرد سے بے گانہ ہوتی چلی گئی۔ اُس کے سر کے پچھلے حصے سے خون بری طرح بہ رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

”اٹھ تیری ضمانت ہوگئی ہے۔“ کسی نے اُس کے پیٹ میں زور دار پاؤں سے ٹھوک ماری تھی۔ اجالا درد سے بلبلائی اٹھ بیٹھی اُس کے سر میں درد کی ناقابل برداشت ٹیسیں اٹھ رہی تھیں۔ اُس کا ہاتھ غیر ارادی طور پر اپنے سر کی طرف گیا اُس کے سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی پھر اُسے سب یاد آتا چلا گیا۔
 ”یا اللہ مجھے معاف کر دے میں بھٹک گئی گمراہ ہو کر غفلت میں بڑ گئی مجھے معاف کر خدایا۔“ اُس نے اپنے دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھنے کی کوشش کی مگر وہ چکرا کر رہ گئی پھر اسی عورت نے اُسے سہارا دے کر اٹھایا اور اُسے قہر آلود نظروں سے دیکھا۔ اُس عورت کی نگاہوں میں اجالا کے لیے نفرت و ناپسندیدگی تھی جیسے اجالا کوئی بہت گری ہوئی لڑکی تھی اور اُسے اجالا سے گھن آ رہی ہو۔ اجالا لڑکھرائی اُس عورت نے اُسے سہارا دے کر ایک دم چھوڑ دیا تھا۔ اجالا بے دم سی ہو کر وہ ٹھنڈے فرش پر گری وہ اپنے زخم زخم وجود کو کوسردی سے اکڑا ہوا محسوس کر رہی تھی اتنی ٹھنڈ اور ایسے سوگوار حالات نے اُسے ادھ موا کر ڈالا تھا۔ اُس کا ذہن جیسے دھند سے اٹا ہوا تھا خوابیدہ ذہن پھوڑے کی مانند دکھ رہا تھا۔

اُس نے کھل کر سانس لینے کی کوشش کی اس کوشش نے اُسے تڑپا کر رکھ دیا شاید وہ ساری رات

ایک ہی زاویے میں لیٹی رہی تھی اُس کی پسلیوں میں جیسے درد نے آگ دھکا رکھی تھی۔ اُس کو اتنی بے رحمی سے تھانے کے وسیع احاطے میں گھسیٹا گیا تھا کہ اب جا بجا خراشیں نظر آ رہی تھیں اُس کی رائل بلیو شرٹ جگہ جگہ سے پھٹی ہوئی تھی اُس کی رائل بلیو شرٹ میں سے اُس کا دودھیا بدن جھانک رہا تھا اجالا کو ایسے لگ رہا تھا برف کی سیکڑوں وزنی سلیں اُس کے سر کے اوپر رکھ دی گئی ہیں اور وہ اتنے بوجھ تلے ہل نہیں پا رہی اُس نے اٹھنے کی کوشش کی اپنی تمام تر ہمتیں مجتمع کی زمین سے اٹھنے کی سعی میں اُس کا ناتواں و نازک وجود میں درد کی ایک تیز لہر اس کے سر سے پاؤں تک گزر گئی۔

”آہ۔“ وہ کراہی اور پھر بے دم ہو کر وہیں ڈھیر ہو گئی نازوں پٹی اجالا کہاں اذیتوں سے آشنا تھی وہ درد کی ٹھوکریں کھاتی پھر رہی تھی۔

”اٹھو۔“ اب کہ بار اُسے بہت محبت و نرمی سے اٹھایا گیا تھا سہارا بھی دیا گیا تھا شاید کسی نے اُسے اپنے بازوؤں میں اٹھالیا تھا نقاہت کے مارے اُس کی آنکھیں بند تھیں۔

☆.....☆.....☆

نجانے کتنے گھنٹے کتنے دن گزر گئے تھے اجالا کے بیرونی زخم اب ٹھیک تھے اُسے یہاں کون لے کر آیا اُس کی ضمانت کس نے کروائی ابالا کو کچھ خبر نہیں تھی۔ یہ ایک صاف ستھرا بیڈروم تھا جہاں وہ لیٹی ہوئی تھی۔ ایک ایک کر کے سارے واقعات اُس کے دماغ کی اسکرین پر چنے لگے اُسے وحشت سے ابکائی سی آنے لگی اذیت سے اُس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اُس نے اپنے گالوں پر گرتے گرم سیال کو چھوا۔

”اللہ مجھے بچالے میری عزت کی حفاظت کرنا۔“ اُس نے دھیرے سے آنکھیں بند کر لیں

آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر پلکوں کے بند توڑنے لگے۔
 ”سعد بھیا مجھے بچالو، مجھے نکالو یہاں سے۔“
 ”یا اللہ رحم فرما میری مدد فرما میرا کوئی پرسان
 حال نہیں۔“

”فاروق کہاں ہے، کیا وہ مجھے اکیلا چھوڑ کر
 بھاگ گیا، نہیں ایسا نہیں ہو سکتا وہ ایسا نہیں
 کر سکتا۔“

”سعد بھیا، میں اپنے ہی گھر سے در بدر ہو گئی
 میری خطا تے مجھے تذلیل و رسوائی، مار پیٹ،
 کوسنے و دھتکار دی۔ میری روح کی دھجیاں اڑا کر
 رکھ دیں فاروق تم کہاں ہو۔“

”میری تو روح تک منجمد ہو چکی ہے۔ پھر یہ
 آنسو کیوں نہیں جے۔“

”فاروق تم تو کہتے تھے کہ تم مجھے کبھی کسی مشکل
 میں اکیلا نہیں چھوڑو گے اب آ کے دیکھو مجھ پر کیسی
 آفت آئی ہے یوں پولیس کے ہتھے لگنا اور
 رات تھانے میں گزارنا، اوہ میرے اللہ مجھے تو مر
 جانا چاہیے۔“ کم مائیگی و بے چارگی کا احساس زہر
 کی مانند اجالا کی رگوں میں پھیل رہا تھا۔

”کیا فاروق مجھے چھوڑ گیا۔“ اُس کا پیار اُس
 کا جنون ماننے سے انکاری تھا۔

”جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے۔“

”میرا یقین جو کامل تھا جس کے سہارے میں
 اُسے ملنے نکل پڑی وہ میرا یقین.....“ دل کر لایا۔
 ”لوٹنا ہوتا تو جاتا ہی کیوں۔“ خاموشی صدا
 بن گئی۔

”کوئی وجہ ہوگی کوئی مجبوری۔“ اُس نے کمزور
 سی دلیل دی خود کو مطمئن کرنا چاہا۔

”جس دن میرا یقین ٹوٹا اسی دن میرے بدن
 سے روح جدا ہو جائے گی۔“ ابھی دل خوش گمان
 تھا۔ ابھی وہ خود سے عہد کر رہی تھی۔ یہ عہد کیسے درد

دینے والا تھا اور آنے والا وقت اپنے آنچل میں اتنی
 انہونیاں اتنے واقعات چھپائے بیٹھا تھا وہ بے خبر تھی۔
 یہ تو پہاڑی علاقہ تھا جہاں اکا دکا گھر ہی نظر
 آتے تھے جہاں اُسے رکھا گیا تھا وہ گھر سے اپنی
 مرضی سے فاروق کو لینے لگی تھی۔ اُسے اُسی دن واپس
 لوٹ جانا تھا مگر وہ واپس لوٹ نہیں سکی تھی۔ اُس کے
 گرد ایسا جال بن دیا گیا تھا کہ وہ پھڑ پھڑا بھی نہ سکی
 واپسی کے سارے راستے ساری راہیں مسدود
 ہو گئیں۔ اُس کے گرد فسوں خیز لفظوں کا تانا بانا ایسے
 چال بازی سے بنا گیا تھا محبت کا ریشمی حصار باندھ کر
 اُسے گھائل کر دیا تھا اُسے کمرے میں قید کرنے کی
 ضرورت نہیں تھی کیونکہ حراما نصیبی نے اُسے جیسے
 ذہنی طور پر اور جسمانی طور پر مفلوج کر دیا تھا اُس میں
 اتنی سکت کہاں تھی کہ وہ یہاں سے بھاگ سکتی جہاں
 دور دور تک زندگی کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

دنیا دلفریب ہے مگر و فریب سے بھری ہوئی،
 خوشیوں کو نظر لگ جاتی ہے کوئی بعض و حسد کا مارا
 جان دیتی ہے خزاں کیسے اپنا وار کرتی ہے آنکھوں
 کے خواب کیسے مٹی ہوتے جہیں بری خبر سناحت
 پریشانیاں کیسے زندگی کی حقیقتوں کے دروا کرتی
 ہیں کوئی ظاہر پر مرمتا تھا کوئی مایا کا دیوانہ تھا۔
 رحمان کو اس نے دیکھا تھا وہ باہر برآمدے میں کسی
 سے باتیں کر رہا تھا۔ اجالا کا دل اچھل کر حلق میں
 آ گیا۔ اس نے زنگ آلود کھڑکی کو ذرا سا کھولا
 سامنے جو ہستی تھی اسے تو وہ ہزاروں میں پہچان
 سکتی تھی جس کی وجہ سے وہ اس حالت میں پہنچ
 تھی۔ فاروق ترمزی مگر ساتھ میں رحمان کی
 موجودگی اسے خوفزدہ کر رہی تھی اس کے دل میں
 اندیشے سراٹھانے لگے۔

(اس خوب صورت ناولٹ

اکلی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے)

For Next Episodes Visit
 Paksociety.com

دو سیریز 129

READING
 Section

دوستگیران

میں کس جگہ

آپ دوستگیران کے خریدار بن کر ملک کو

ذیبادلہ پیکیج

اندرون ملک = 890 روپے

ہر ملک ہر شہر اور ہر محلے میں دستیاب ہے

155 امریکی ڈالرز	ایران	155 امریکی ڈالرز	کویت
155 امریکی ڈالرز	سری لنکا	155 امریکی ڈالرز	سعودی عرب
155 امریکی ڈالرز	جاپان	155 امریکی ڈالرز	یو اے ای
155 امریکی ڈالرز	لیبیا	155 امریکی ڈالرز	مصر
155 امریکی ڈالرز	ڈنمارک	155 امریکی ڈالرز	یونان
155 امریکی ڈالرز	جرمنی	155 امریکی ڈالرز	فرانس
155 امریکی ڈالرز	ہالینڈ	155 امریکی ڈالرز	برطانیہ
155 امریکی ڈالرز	پولینڈ	155 امریکی ڈالرز	ناروے
165 امریکی ڈالرز	کینیڈا	165 امریکی ڈالرز	امریکہ
165 امریکی ڈالرز	آسٹریلیا	165 امریکی ڈالرز	افریقہ

ذرا سا لٹنا

آج ہی رابطہ کیجیے || C-88 - فرسٹ فلور - خیابان جامی کمرشل - ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی - فیز - 7، کراچی

فون نمبر: 35893122 - 021-35893121

READING
Section

محبت درود دیتی ہے

استغفر اللہ اتنے کالے رنگ پر سفید دانت کتنے عجیب و غریب لگ رہے ہیں۔ فلزا کے متوجہ کرتے ہی شیزا نے سامنے کھڑے شخص پر نظر ڈالی۔ اب اتنا بھی کالا نہیں ہے جتنا آپ نے اسے بنانے کی کوشش کر ہی ہیں۔ بس سانوالا رنگ ہے جو یہاں کے موسم.....

مما.....مما

مگر ابی الہی خیر اسے کیا ہوا ہے۔
وہ تیزی سے اس کے کمرے کی جانب

فلزا کی تیز چیختی ہوئی آوازاں کے کانوں سے



READING
Section

کہ شہناز کے سامنے حلیمہ کی ذات کو ڈسکس کیا جائے۔

☆.....☆.....☆

واؤ اتنا خوبصورت کمر، میں تو یہ ڈریس ہی لوں گی۔

”یہ ڈریس شیزا کا ہے۔“ سعدیہ نے اس کے سامنے رکھا سوٹ اٹھاتے ہوئے کہا۔

”ویسے بھی تو تمہیں بلو کمر پسند نہیں ہے تمہارے لیے تو میں تمہاری پسند کارڈ اور گرین کمر لے کر آئی ہوں۔“

فلزا کے چہرے کے بگڑتے زاویہ دیکھ کر انہوں نے وضاحت دی۔

”کوئی بات نہیں آپ ان میں سے ایک شیزا کو دے دیں میں تو یہ ہی لوں گی۔“

اس نے ماں کی باتوں کو قطعی نظر انداز کرتے ہوئے ان کے سامنے رکھا سوٹ ایک بار پھر سے اٹھالیا۔

ویسے بھی رائل بلو کمر گورے لوگوں پر زیادہ اچھا لگتا ہے۔ سوٹ کو اپنے ساتھ لگاتے ہوئے وہ اترائی۔

کیوں شیزا ٹھیک کہہ رہی ہوں نا اور یہ دیکھو یہ کمر مجھ پر کتنا اٹھ رہا ہے۔ اب کی بار اس نے سامنے بیٹھی شیزا کو اپنا ہم نوا بنانا چاہا۔

”آپ کو جو پسند آئے آپ لے لیں، کوئی مسئلہ نہیں ہے مجھے تو ویسے بھی سارے رنگ اچھے لگتے ہیں۔“

جانتی تھی کہ فلزا نے یہ سوٹ اُس کی ضد میں اٹھایا ہے مگر اُسے الجھنے کی عادت نہ تھی۔ اس لیے نظر انداز کر گئی۔

”اوہ تھینک یو سو میٹ ہارٹ اینڈ آئی لو یو۔“ اپنا مطلب پورا ہوتے ہی وہ سامان اٹھائے

بڑھیں، دروازہ کھولتے ہی سامنے نظر آنے والے منظر نے انہیں ہر بات بنا پوچھے ہی سمجھا دی۔ فلزا کے سامنے کھڑی حلیمہ ہاتھ میں پانی کا گلاس پکڑے تھر تھر کانپ رہی تھی۔

آپ کو کتنی بار منع کیا ہے مجھے اس کے ہاتھ کھانے یا پینے کے لیے کچھ نہ بھیجا کریں۔ گھن آتی ہے مجھے اس کے کالے ہاتھوں سے۔“

ماں پر نظر پڑتے ہی فلزا نے حلیمہ پر ایک حقارت بھری نگاہ ڈالتے ہوئے کہا۔

”تم جاؤ حلیمہ یہاں سے اور شہناز سے کہو کہ چھوٹی بی بی کو پانی دے جائے۔“

حلیمہ ان کی بات سنتے ہی تیزی سے کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کی آنکھوں میں چمکتے آنسو سعدیہ سے چھپے نہ رہ سکے۔

”بہت بری بات ہے فلزا، کسی انسان کی اس طرح بے عزتی کرنا، یہ گورے، کالے خوبصورت بد صورت ہر طرح کے لوگ اسی پروردگار کی تخلیق ہیں۔ جس نے تمہیں اور ہم سب کو پیدا کیا، اگر تم خوبصورت ہو تو اس میں تمہارا کوئی کمال نہیں اور نہ ہی حلیمہ کی بد صورتی اس کی اپنی منتخب کردہ ہے۔ یہ سب بنانے والے کا حسن ہے۔ جس پر انگلی اٹھانا ہم میں سے کسی کو زیب نہیں دیتا۔“ انہیں فلزا کا اس طرح چلانا سخت ناگوار گزارا تھا۔ جس کا اندازہ ان کے چہرے کے تاثرات دیکھ کر بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ جو بھی ہے ماما آپ یہ اچھی طرح جانتی ہیں کہ کالے رنگ کے لوگ دیکھتے ہی میرے دل کو کچھ ہونے لگتا ہے۔ اس لیے پلیز مجھے آپ حلیمہ سے کہیں وہ میرا کوئی کام نہ کیا کرے۔“

اس سے قبل کہ سعدیہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، شہناز پانی کا دوسرا گلاس لے آئی جسے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں

اس سے قبل کہ سعدیہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، شہناز پانی کا دوسرا گلاس لے آئی جسے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں

اس سے قبل کہ سعدیہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، شہناز پانی کا دوسرا گلاس لے آئی جسے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں

اس سے قبل کہ سعدیہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، شہناز پانی کا دوسرا گلاس لے آئی جسے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں

اس سے قبل کہ سعدیہ اس کی بات کا کوئی جواب دیتی، شہناز پانی کا دوسرا گلاس لے آئی جسے دیکھتے ہی وہ خاموش ہو گئی کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں

کمرے سے باہر نکل گئی۔ تمہیں اس طرح اپنی پسندیدہ چیزیں فلزا کو نہیں دینی چاہئیں۔ اس سب سے اس کی عادتیں خراب ہوتی ہیں۔“ سعدیہ نے فلزا کے باہر نکلتے ہی شیزا کو مخاطب کیا۔

”اب اور کیا خراب ہوں گی۔ ان کی عادتیں تو بچپن سے ہی خراب ہیں۔ تب تو آپ یا پاپا دونوں میں سے کوئی بھی منع نہیں کرتا تھا۔ الٹا ہر غلط بات میں اس کا ساتھ دیتے تھے۔“ شیزا کا گلہ بجا تھا، سعدیہ یک دم شرمندہ سی ہو گئی۔

”دراصل سارا قصور تمہاری دادی کا ہے۔ یہ شروع سے ان کی لاڈلی رہی، اس لیے میں یا ظہیر کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اگر کچھ کہہ دیں تو جانتی ہونا تمہاری دادی کس قدر داویلا کرتی ہیں۔“ اپنی غلطی اور کوتاہی کا ذمہ دار دوسروں کو مت ٹھہرائیں، مان جائیں کہ فلزا کی خوبصورتی نے آپ کے دلوں کو اس کی جی حضوری پر لگا رکھا تھا۔

شیزا شروع ہی سے ایسی ہی تھی۔ صاف اور کھری بات کرنے والی۔

”جب تک لوگ اس کے حسن کو دیکھ کر ستائشی کلمات کہتے رہے آپ کا سرفخر سے تارہا اور اب جب لوگوں نے اس کی خوبصورتی کو ایک طرف رکھ کر اس میں خوب سیرتی تلاشنا چاہی تو آپ کو اپنی غلطی کا احساس ہوا مگر اب اس احساس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔“

اپنی کتابیں سمیٹ کر وہ کمرے سے باہر نکل گئی۔ اس کے پیچھے کمرے میں رہ جانے والی سعدیہ، شیزا کی باتوں پر دل ہی دل میں قائل ہوتے ہوئے شرمندہ ہوتی رہی۔

☆.....☆.....☆

استغفر اللہ اتنے کالے رنگ پر سفید دانت کتنے عجیب و غریب لگ رہے ہیں۔ فلزا کے متوجہ

کرتے ہی شیزا نے سامنے کھڑے شخص پر نظر ڈالی۔ اب اتنا بھی کالا نہیں ہے جتنا آپ نے اسے بنانے کی کوشش کر ہی ہیں۔ بس سانوالا رنگ ہے جو یہاں کے موسم کے لحاظ سے ہر محنت کش کا ہو جاتا ہے۔ اگر آپ بھی مسلسل سارا دن دھوپ میں کھڑی رہیں تو دو ہی دنوں میں آپ کو بھی اپنی رنگت میں واضح فرق نظر آنے لگے گا۔

شیزا نے اپنے سے تین سال بڑی بہن کو سمجھایا۔

”اللہ نہ کرے جو میں ایسے دھوپ میں کھڑی رہوں۔ پتا نہیں تم ہمیشہ ایسی فضول باتیں کیوں کرتی ہو۔“

شیزا کی بات سمجھے بنا فلزا نے اسے لتاڑ دیا جواباً وہ خاموش رہی کیونکہ وہ اتنی گرمی میں فلزا سے الجھ کر موسم کی حدت بڑھانا نہ چاہتی تھی۔

”تمہیں کچھ اور لینا ہے یا واپس چلیں۔“

شیزا کو خاموش دیکھ کر اس نے ایک بار پھر مخاطب کیا۔ نہیں میری شاپنگ مکمل ہو گئی ہے۔ آپ خان چاچا کو فون کریں گاڑی سامنے لے آئیں۔

اس کے ساتھ کھڑی شیزا نے دھوپ سے سرخ ہوتی اپنی بہن کے چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جواب میں کہا۔

☆.....☆.....☆

اُف بی بی جی لال سوٹ میں کتنی خوبصورت لگ رہی ہیں۔ سیڑھیاں اترتی فلزا پر نگاہ پڑتے ہی بے اختیار حلیمہ نے سوچا۔

تم یہاں کیوں کھڑی ہو۔ ہٹ جاؤ میرے سامنے سے۔ میری بچی کا اچھا بھلا موڈ خراب ہو جاتا ہے۔“

دادی نے منہ اٹھائے کھڑی حلیمہ کو لتاڑا جسے

سننے ہی وہ فوراً استری اسٹینڈ کی جانب بڑھ گئی تاکہ یونیفارم استری کر سکے۔ کیونکہ اُس نے صبح کالج جانا تھا اور حلیمہ اس کے کپڑے رات ہی استری کر کے پینگ کر دیا کرتی تھی۔

”خیریت تو ہے دادی آج ماما کچن میں مصروف ہیں کوئی خاص مہمان آ رہا ہے کیا۔“
دادی کے گلے میں بازو ڈالتے ہوئے فلزائے پیار سے پوچھا۔

”تمہیں اپنے پرانے پڑوسی شبیر صاحب یاد ہیں نا۔“

”ہاں انہیں میں کیسے بھول سکتی ہوں سارا بچپن ہمارا ان کے گھر گزرا۔ آئی نرگس تو مجھ سے بے حد محبت کرتی تھیں۔“

”ان کا دوسرے نمبر والا بیٹا عبد الہادی یاد ہے۔“ دادی نے مزید یاد دلایا۔

”جی وہ کالا سوکھا سا عبد الہادی۔“ فلزائے منہ بناتے ہوئے جواب دیا۔ دادی اُس کی بات سننے ہی ہنس دیں۔

”بری بات ہے فلزائے تمہیں کتنی بار منع کیا ہے کسی کا اس طرح مذاق نہیں اڑاتے۔“

کچن سے باہر نکلتی سعدیہ نے اس کا آخری جملہ سننے ہی ٹوکا۔ بہت قابل بچہ ہے وہ سول سروس

کا امتحان پاس کر کے اعلیٰ سرکاری افسر لگا ہے، اپنی ٹریننگ کے سلسلے میں اسلام آباد آیا تھا تو میں نے سوچا کیوں نہ ایک دن اپنے گھر بلا لیا جائے۔ ویسے بھی جس گھر میں جوان بیٹیاں موجود ہوں وہاں ایسے قابل لڑکوں پر نظر رکھنا پرتی ہے۔“

ان کے اور نرگس کے درمیان کئی سال قبل دھکے چھپے لفظوں میں جو بات ہوئی تھی۔ وہ چاہتی تھیں کہ اُسے کسی بہانے فلزائے کے سامنے بھی لے آئیں۔

”آپ کو پورے گھر میں ایک ہادی ہی قابل نظر آیا جو اپنے تینوں بھائیوں میں سب سے زیادہ بد شکل تھا۔ فلزائے ان کی بات سمجھتے ہی چڑ گئی۔“
”ہاں۔“ اطمینان سے جواب دیتی وہ سامنے رکھے صوفے پر بیٹھ گئیں۔

”تینوں بچوں میں سب سے زیادہ قابل ہادی ہی ہے اور ویسے بھی جہاں لڑکی کی خوبصورتی دیکھی جاتی ہے وہاں لڑکے کی قابلیت کو اہمیت دی جاتی ہے، ہادی سے بڑا عبد الباری آسٹریلیا میں ہوتا ہے جہاں اس نے کسی انگریز لڑکی سے شادی کر رکھی ہے۔ جبکہ چھوٹا والا عبدالرحمان تم سے چھوٹا ہے۔“ انہوں نے کھل کر ہر بات فلزائے پر واضح کرنا چاہی۔

”اتنا پسند ہے آپ کو ہادی تو شیراز کے لیے ہاں کر دیں اور پلینز میرے بارے میں کوئی بھی فیصلہ مجھ سے پوچھے بنا مت کیجیے گا۔ ایسا نہ ہو میرا انکار بعد میں آپ سب کو سب کے سامنے شرمندہ کر دے۔ اس نے اپنی ماں کو تنبیہ کرتے ہوئے کہا۔

ارے چھوڑو یہ تم ماں بیٹیاں کس بحث میں الجھ گئیں۔“

دادی نے ماحول کی گرمی دور کرنے کی کوشش کی۔

”بچہ آئے گا تو دیکھ لو پسند آ جائے گا تو ٹھیک ورنہ زبردستی کیسی، کوئی ایک آدھ دن کی تو بات نہیں عمر بھر کا ساتھ ہے۔ جو بنا پسندیدگی کے نہیں گزرتا اور اس سلسلے میں جوان اولاد پر زبردستی کی اجازت نہیں ہے، لہذا بہتر ہوگا کہ تم اسے اپنا فیصلہ خود کرنے دو۔ یہ نہیں تو اور سہی ایسی خوبصورت بچی کے لیے بھلا رشتوں کی کیا کمی۔“

سعدیہ کو باتیں سنانے کے ساتھ ساتھ انہوں نے فلزائے کے حسن کو خراج تحسین پیش کرتے ہوئے

اس کی بھی حوصلہ افزائی کی جو بافلز انے بڑی محبت کے ساتھ دادی کا منہ چوم لیا۔

”بے شک شادی کے معاملے میں اولاد پر زبردستی نہیں کی جاسکتی مگر انہیں سمجھانا تو ہمارا فرض ہے نا اور ویسے بھی جس عمر میں ہے نا بڑی اماں اس عمر میں فیصلے دل سے کیے جاتے ہیں اور دل کے فیصلے ہمیشہ دھوکہ دیتے ہیں اور جب تک دماغ سے سوچنے کی عقل آتی ہے، وقت ہاتھ سے نکل جاتا ہے پھر بیٹھے رہو پچھتانے کے لیے۔“

سعدیہ کو بڑی اماں کا اس طرح فلزا کا ساتھ دینا ذرا نہ بھایا۔ آجائیں دادی میں اور آپ پھوپھو کی طرف چلتے ہیں۔ جب تک واپس آئیں گے ماما کا موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔

اماں کے کچن میں جاتے ہی وہ آہستہ سے دادی سے مخاطب ہوئی۔

”اور وہ جو عبدالہادی آ رہا ہے تمہاری اماں کا خاص مہمان اس سے کون ملے گا۔“ دادی بیک وقت ہاں اور ناں کی کیفیت میں مبتلا رہیں۔

شیزا ماما اور پاپا یہ تینوں لوگ کافی ہیں اُسے پروٹوکول دینے کے لیے۔ آپ بتائیں میرے ساتھ آ رہی ہیں یا میں جاؤں۔“

دل ہی دل میں فیصلہ کرتے ہوئے وہ فوراً ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

”آئے ہائے پچی ایسی بھی کیا بے صبری ہے جو مجھے چھوڑ کر بھانے کی فکر میں ہو۔ تھوڑا دم تو لو میں بھی ساتھ چلتی ہوں۔ گھنٹوں پر ہاتھ رکھ کر اٹھتے ہوئے انہوں نے فلزا کو گھورا، فلزا نے قریبی موجود اسٹک اٹھا کر ان کے ہاتھ میں دے دی اور آہستہ آہستہ چلتی انہیں باہر لے گئی۔“

”ماما میں اور دادی پھوپھو کی طرف جا رہے ہیں۔ ایک گھنٹہ تک آجائیں گے۔“ باہر نکلتے نکلتے

اُس نے ماں کو اطلاع دی۔ جانتی تھی کہ وہ غصے میں ہونے کے باعث جواب نہ دیں گی اور ان کے اس غصے کا فائدہ فلزا نے اٹھایا جو دادی کے ساتھ آہستہ آہستہ واک کرتی ہوئی، دوسری گلی کے کونے پر موجود پھوپھو کے گھر آ گئی۔ پھر رات کا کھانا کھانے کے بعد کافی دیر بعد وہ اور دادی گھر واپسی کو نکلے اس وقت جب اُسے یقین ہو گیا تھا کہ ہادی اب تک واپس جا چکا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

خدا کی قدرت دیکھو ایک ہی گھر میں رہنے والی دوستی بہنیں اور دونوں میں زمیں و آسمان کا فرق۔ پیاز چھیلتی شہناز نے ایک نظر باہر صوفہ پر بیٹھی شیزا پر ڈالتے ہوئے حلیمہ کو مخاطب کیا۔

سچ کہہ رہی ہو کہ ایک اتنی خوبصورت کہ سمجھو ہاتھ لگائے تو میلی ہو جائے اور دوسری عام سی شکل و صورت والی لڑکی جیسی ساری لڑکیاں ہوتی ہیں۔ حلیمہ کا تجزیہ اپنی عقل سے بڑھ کر تھا۔

بے وقوف میں بات شکل کی نہیں کر رہی، میں تو دونوں کے اخلاق کا فرق واضح کر ہی ہوں۔ ایک طرف آگ کے گولے جیسی فلزا بی بی اور دوسری طرف نرم اور ٹھنڈی ہوا کی مانند اپنی شیزا بی بی۔

شہناز ڈرامہ دیکھنے کی بے حد شوقین تھی۔ اس لیے اُس کی گفتگو میں بھی حلیمہ کو کسی ڈرامے کا ڈائلاگ محسوس ہوتی، لیکن کس ڈرامے کا یہ اُسے سوچنے پر بھی یاد نہ آیا۔

شہناز گلاس دھو کر مجھے پانی پلاؤ۔ اس سے قبل کہ حلیمہ کوئی جواب دیتی کچن کے دروازے پر فلزا آن کھڑی ہوئی۔ جو غالباً ابھی یونیورسٹی سے واپس آئی تھی۔ اس کی آواز سنتے ہی حلیمہ گھبرا کر فوراً سائیڈ پر ہو گئی۔ مبادا کہیں اُسے حلیمہ کا اس طرح فریج کے پاس کھڑے ہونا برانہ

لگ جائے۔

”اور تم وہاں کھڑی کیا کر رہی ہو باہر نکل کر میرے جوتے صاف کرو۔ جانے یونیورسٹی میں کہاں سے ان میں کیچڑ لگ گئی ہے۔“

حلیمہ کو مخاطب کرتے ہوئے اس کے لہجہ میں فخر و مغرور کے ساتھ ساتھ حقارت کا عنصر بھی نمایاں ہو گیا۔

”جی اچھا۔“ وہ تیزی سے اُس کے قریب سے گزرتی کچن سے باہر نکل گئی۔

”کسی سے کام کروانے کے لیے ضروری نہیں کہ اُسے احساس دلایا جائے کہ ہم تمہیں اس کام کی اجرت دیتے ہیں یا دوسرے لفظوں میں کہ تم ہمارے ملازم ہو۔ آپ وہ ہی کام نرم لہجہ اختیار کرتے ہوئے بھی حلیمہ کے لیے کہہ سکتی تھیں۔ اس کے دو فائدے ہوتے ایک تو حلیمہ کا دل خوش ہو جاتا اور وہ زیادہ محنت اور محبت سے آپ کے جوتے صاف کرتی دوسرا آپ کا نرم اور غرور سے عاری لہجہ اللہ تعالیٰ کو بھی پسند آتا جس کا اجر آپ کو ضرور ملتا۔“ اُس کے واپس پلٹتے ہی شیزا نے نرم لہجہ میں اُسے سمجھانا چاہا۔ اللہ تعالیٰ کی مجھ پر بڑی نظر کرم سے جس کا اندازہ اس بات سے لگا لو کہ اُس نے مجھے کس قدر حسین بنایا ہے بالکل مکمل اور پھر عیب سے پاک لاؤنج میں لگے قد آدم شیشہ کے سامنے کھڑے ہو کر فلزا نے اپنا اچھی طرح جائزہ لیتے ہوئے شیزا کو جواب دیا۔

”ہر عیب سے پاک ذات صرف اللہ کی ہے۔“ شیزا کو اس کا یہ آخری جملہ بہت برا لگا یہ بھی سبب تھا جو وہ ٹو کے بنا رہ نہ سکی۔

شکل و صورت کی خوبی اچھے اخلاق کے ساتھ ہی بھاتی ہے ورنہ برا اخلاق سب کچھ تہس نہس کر دیتا ہے۔

چینل سرچ کرتے ہوئے اس نے آہستہ آواز میں کہا۔

”پتا نہیں کیوں شیزا کبھی کبھی مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے، جیسے دوسرے لوگوں کی طرح تم بھی میری خوبصورتی سے جلنے لگی ہو۔“

اپنے سلکی کندھے تک آتے بالوں کو جھٹک سے پیچھے کرتی ہو شیزا کے بالکل سامنے آن کھڑی ہو۔

”غلط فہمی ہے آپ کی کیونکہ اپنی نظر میں، میں خود دنیا کی حسین ترین لڑکی ہوں، اس لیے مجھے کسی اور سے جلنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

فلزا کی بات نے شیزا کو تھوڑا سا دکھی ضرور کیا مگر جلد ہی اس کی عادت سمجھ کر وہ اپنا دکھ اندر ہی پی گئی۔

میری مانو تو کوئی اچھی سی کریم استعمال کرو کیونکہ جب سے تم کالج جانے لگی ہو۔ تمہارا گندمی رنگ جل کر سانولا ہو گیا ہے۔ اب ایسا نہ ہو کہ مزید جل کر تم کالی ہو جاؤ پھر یقین جانو ماما پاپا کے لیے بہت مشکل ہو جائے گی کوئی تمہارا رشتہ نہ لے گا۔“

فلزا دھیمی آواز میں ہنستے ہوئے بولی۔ وہ کیا کہنا چاہتی تھی۔ شیزا اچھی طرح سمجھ گئی۔

”جو میرے نصیب میں ہے وہ مجھے ضرور ملے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔“ اسے جواب دے کر وہ اندر کمرے میں آ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ یونیورسٹی سے گھر لوٹی تو لاؤنج سے آتی ہوئی آوازیں سن کر باہر ہی رک گئی۔ کوئی مہمان آیا ہے کیا؟ اس نے قریب سے فرش دھونی حلیمہ کو مخاطب کیا۔

”جی ہادی بھائی آئے ہیں۔“

”ہادی بھائی.....“ حلیمہ کے جواب نے اُسے

تھوڑا سا حیران کر دیا۔ وہ تو اس رات کی دعوت کے بعد سے ہادی کو بالکل بھول چکی تھی، مگر آج حلیمہ کے اندازے اُسے ایسا محسوس ہوا جیسے ہادی اس کی غیر موجودگی میں اکثر ہی یہاں آتا رہتا ہے۔ اس نے حلیمہ کو جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ بیگ سے اپنا شیشہ نکال کر خود کا اچھی طرح جائزہ لیا۔ بالوں میں پریش پھیرا، لپ اسٹک کا رنگ تھوڑا گہرا کیا وہ چاہتی تھی کہ ہادی اس کی خوبصورتی دیکھتے ہی اپنی شکل و صورت کے کمتر ہونے کے احساس میں مبتلا ہو جائے۔ اسے اپنی دو سالہ یونیورسٹی لائف میں یہ اچھی طرح اندازہ ہو چکا تھا کہ کس طرح قابل سے قابل لڑکے اسے اپنے سامنے دیکھ کر بات کرنا بھول جاتے اور بے وقوفوں کی طرح آنکھیں کھولے بس اُسے ٹکر ٹکر دیکھا کرتے اور یہ ہی سب توقعات ہادی سے رکھتے ہوئے وہ لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو گئی۔ سامنے والے صوفے پر شیزا بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے یقیناً ہادی تھا۔ جس کی پشت فلزا کی جانب تھی۔

”کون آیا ہے تمہاری ہنسی کی بڑی تیز آواز لاؤنج سے باہر آرہی ہے۔“ بالکل انجان بنتی ہوئی وہ شیزا کے قریب جا پہنچی۔

”السلام وعلیکم۔“ شیزا کے جواب سے قبل ہی اُسے ہادی کے سلام کی آواز سنائی دی۔

”وعلیکم السلام“ اپنے بالوں کو ادا سے جھٹکتے ہوئے اس نے اپنے مخاطب کو دیکھا۔ سانولی رنگت، بھرا بھرا جسم اور نظر کے چشمہ کے ساتھ ایک بالکل عام سا لڑکا جو اس تھوڑے قدرے تبدیل ہو چکا تھا۔ جو آج تک ہادی کے حوالے سے اس کے ذہن میں تھا مگر پھر بھی اس میں کوئی ایسی خاص بات نہ تھی جو فلزا کی سوچ کا محور ٹھہرتا۔

”یہ فلزا ہیں۔“ شیزا نے فوراً تعارف کروانے

کی ذمہ داری نبھائی۔

”میں پہچان گیا تھا۔“ اُسے سرسری سا جواب دے کر وہ اپنے سامنے رکھی کتاب میں کم ہو گیا جو غالباً شیزا کی تھی۔

”ارے تم کب آئیں تمہاری یونیورسٹی تو چار بجے آف ہوتی ہے۔ ابھی تو صرف ایک بجے ہے۔“ کچن سے باہر نکلتی سعدیہ نے اپنی جگہ کھڑی فلزا کو دیکھ کر پکارا۔ آج اکنامکس کی کلاس نہیں ہوئی۔“

ماں کو جواب دے کر وہ وہیں بیٹھ گئی۔ ہادی اپنے سامنے میٹھ کی کتاب کھولے شیزا کو کچھ سمجھا رہا تھا، دس منٹ تک وہ وہیں بیٹھی رہی مگر ہادی نے جیسے اس کی موجودگی کو بالکل محسوس نہ کیا اس کا لاؤنج میں ہونا یا نہ ہونا ان دونوں کے نزدیک قطعی غیر اہم تھا۔ اس بات کا احساس ہوتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

”تم فریش ہو جاؤ میں کھانا لگا رہی ہوں۔“

”اس نے دیکھا حلیمہ سامنے ٹیبل پر برتن لگا رہی تھی۔ حلیمہ کے کالے کالے ہاتھوں میں کھانے کی پلیٹیں دیکھتے ہی اُسے کراہت کے ساتھ ساتھ غصہ بھی آرہا تھا۔ ماما کو کتنا بھی منع کر دوں پھر بھی کھانے کے برتن ٹیبل پر اسی سے لگوار ہی ہیں۔“

”مجھے فی الحال بھوک نہیں ہے لیکن جب کھانا ہوگا میں خود ہی کچن سے آ کر نکال لوں گی۔“

حلیمہ پر ایک قہر آلود نگاہ ڈالتے ہوئے وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ جب کہ اُس کا انداز دیکھتے ہی سعدیہ کو اندازہ ہو گیا کہ اُسے کیا بات بری لگی ہے۔

☆.....☆.....☆

شیزا کو میٹھ مشکل لگ رہا تھا۔ اس لیے جب کبھی اُسے ضرورت ہوتی ہادی سمجھانے آ جاتا، اس

پڑنے پر جب باہر نکلتی ہے تو ہر منظر کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔

☆.....☆.....☆

جانے کیوں اُس دن کے بعد سے اس کا دل چاہتا کہ وہ جب گھر جائے تو ہادی موجود ہو مگر اس شام کے بعد اُسے ہادی دوبارہ دکھائی ہی نہ دیا۔ سچ ہے جب ہم کسی کو دیکھنا چاہیں اور وہ نظر نہ آئے تو بے چینی بڑھ جاتی ہے۔ ایسی ہی بے چینی کا شکار آج کل فلزا تھی۔ وہ یونیورسٹی سے گھر واپس آنے کے بعد کافی دیر تک لاؤنج میں ہی بیٹھی رہتی اور پھر ہر گزرتا پل اُسے بے چین کیے رکھتا، ابھی بھی اس نے ریموٹ کی مدد سے کئی چینل بدلے اور پھر بالآخر تھک کر ٹی وی ہی بند کر دیا۔

”کیا بات ہے فلزا تم آج کل دوپہر میں سوتی نہیں ہو۔“

دو چار دن سے اُسے اسی طرح لاؤنج میں بیٹھا دیکھ کر سعدیہ بنا پوچھے نہ رہ سکی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ یہ وقت فلزا کے سونے کا ہوتا ہے اور اپنی اس روٹین کی وہ کئی سالوں سے عادی تھی۔ جس میں پچھلے کچھ دنوں سے آنے والی تبدیلی حیرت انگیز تھی۔

مجھے محسوس ہو رہا ہے شاید میرا وزن بڑھ رہا ہے اس لیے دوپہر میں نہیں سوتی۔“

ماں کو مطمئن کرنے کے لیے اس سے بہتر بہانہ اسے کوئی اور نہ سوجھا تھا۔

”اچھا مجھے تو ایسا نہیں لگتا تمہیں ضرور کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔“

سعدیہ نے اچھی طرح فلزا کا جائزہ لیتے ہوئے کہا۔

”مما یہ آج کل شیزامیتھ نہیں پڑھ رہی۔“

وہ اپنے مطلب کی بات پر آتے ہوئے بولی۔

”پڑھتی ہے کیوں؟“

دن کے بعد سے ایک آدھ دفعہ اس کا فلزا سے سامنا ضرور ہوا مگر فلزا نے اُسے قطعی نظر انداز کر دیا وہ ہادی پر ایک نظر ڈالنا بھی اپنی شان کے خلاف سمجھتی تھی۔ جبکہ دوسری طرف اُسے حیرت ہوتی کہ ہادی نے خود بھی اُسے کبھی مخاطب نہ کیا تھا۔

اُس دن وہ سو کر اٹھی تو باہر چھوٹے سے لان میں ہادی پایا کے ساتھ موجود تھا۔ فلزا نے اپنے کمرے کی گھڑکی سے دیکھا کہ بلیک چیک والی شرٹ کے کف فولڈ کئے سانولا سلونا سا ہادی پایا سے جانے کن باتوں میں مصروف تھا، بے اختیار اس کی نگاہ ہادی کے ہاتھوں پر پڑی، حلیمہ کے ہاتھوں جتنے کالے ہاتھ فرق صرف یہ تھا کہ حلیمہ کے ہاتھ بالکل سوکھے سڑے سے تھے جبکہ ہادی کے مردانہ وزنی ہاتھ تھے۔

شکر ہے میں نے ماما کو پہلے ہی دن صاف صاف منع کر دیا ورنہ یہ مصیبت میرے گلے پڑ جاتی۔ اور پھر حور کے پہلو میں لنگور والا محاورہ مجھ پر پورا اترتا۔“ دل ہی دل میں یہ سب سوچ کر وہ ہنس دی اور دروازہ کھول کر باہر لان میں نکل آئی۔ جہاں گرمی کے موسم میں چلنے والی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے بہت اچھے لگ رہے تھے۔ وہ وہیں لاؤنج کے باہر پہلی سیڑھی پر ہی بیٹھ گئی۔ جب اچانک پایا سے بات کرتے ہوئے ہادی ہنس دیا اس کی ہنسی کی آواز سنتے ہی بے اختیار فلزا نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی، سانولے چہرے پر سفید دانتوں کی لڑی، ایک عجیب بہار دکھا رہی تھی۔ وہ مبہوت سی ہو گئی کوئی ہنستے ہوئے اتنا خوبصورت بھی لگ سکتا ہے۔ یہ سوچ ہی اُسے حیران کر گئی اس دن زندگی میں پہلی بار اُسے احساس ہوا خوبصورتی کا تعلق رنگ سے نہیں ہوتا یہ تو شاید انسان کہ دل کے اندر کہیں کنڈلی مارے بیٹھی ہوتی ہے۔ اور وقت

سعدیہ کے اس سوال کا مقصد نہ سمجھ پائی۔ ”دراصل اس کے سر نظر نہیں آتے اس لیے پوچھ رہی ہوں۔“

حتی الامکان اس نے اپنا انداز سرسری رکھتے ہوئے کہا۔

”کون ہادی.....؟“ سعدیہ نے فلزا کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

”جی.....“ وہ آہستہ سے بولی۔

”اس کے پیپرز ہو رہے ہیں۔ اس لیے نہیں آ رہا لیکن یہ آج وہ تمہیں کیسے یاد آ گیا۔“ فلزا کے سوال نے سعدیہ کو تھوڑا سا حیران کر دیا۔

”اللہ نہ کرے وہ جو مجھے یاد آئے میں تو شیزا کی وجہ سے پوچھ رہی تھی کیونکہ اس کا میتھ بہت خراب ہے اور جلد ہی اس کے پیپرز ہونے والے ہیں۔“

ماں کی بات سنتے ہی وہ یکدم پرانی والی فلزا بن گئی لا پرواہی اور ہادی سے چڑتی ہوئی۔ جسے اس کا رنگ روپ ذرا پسند نہ تھا۔

ویسے تو اب اس کی خاصی تیاری مکمل ہو چکی ہے اور یہ سب ہادی کی بدولت ممکن ہوا۔“

مما کی بات سنتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی اُسے لگا اب شاید ہادی دوبارہ نہ آئے گا، قبل اس کے کہ وہ

عالم مایوسی میں اندر اپنے کمرے کی جانب جاتی کہ

یک دم باہر کا دواز کھول کر ہادی اندر داخل ہوا۔ اس کے شانلوے سلو نے چہرے پر نظر پڑتے ہی فلزا جی

اٹھی، ہادی کے پیچھے ہی شیزا بھی شاید وہ ہادی کے ساتھ کہیں سے آئی تھی اور یہ بات اتنی دیر میں

مما نے ایک بار بھی اسے نہ بتائی، شیزا اور ہادی کو ساتھ ساتھ دیکھ کر فلزا کی خوبصورت پیشانی شکن آلود ہو گئی۔

”ارے یہ تمہیں کہاں مل گئی۔“

شیزا کو ہادی کے ساتھ دیکھ کر مما کی حیرت فطری تھی۔ مطلب ان دونوں کے ایک ساتھ آنے کی کوئی امید نہیں بھی نہ تھی۔

”گیٹ کے باہر سے۔“ ہادی جواب دیتے ہوئے ہنسا۔ وہ ہی قاتل ہنسی جس نے آج کئی دنوں

سے فلزا کو اپنے سحر میں جکڑ رکھا تھا۔

”میں کالج وین سے اتری تو یہ صاحب اپنی گاڑی میں گھر کے سامنے دکھائی دیے۔“

شیزا کی ہادی پر ڈالی جانے والی نظر میں ایسا کیا تھا جو فلزا جی جان سے سلگ اٹھی۔ اُسے آج احساس ہوا جو انسان دل کو بھا جائے اس پر پڑنے

والی کوئی ایک نظر بھی کتنا دل جلاتی ہے۔ خواہ وہ نظر کسی اپنے کی ہی کیوں نہ ہو۔

”ارے آج آپ سوئیں نہیں۔“ شیزا کی جیسے ہی نظر اس پر پڑی وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”نہیں.....“ اُسے رکھائی سے جواب دیتی وہ وہیں لاؤنج میں آ گئی۔ اور عین ہادی کے سامنے جا بیٹھی۔

”سچ ہے یہ محبت ہی نہ انسان کو رسوا کر دیتی ہے۔“

ہادی اُسے قطعاً انور کے ماما سے مصروف گفتگو تھا۔

”حلیمہ ہادی کے لیے جوس لے آؤ۔“

مما کے پکارتے ہی وہ اٹھ کھڑی ہوئی، خاموشی سے کچن میں جا کر جوس گلاس میں نکالا، ٹرے میں

رکھا اور لاؤنج میں آ کر ٹرے ہادی کے سامنے کر دی۔

”ارے آپ نے کیوں زحمت کی حلیمہ لے آتی۔“

جوس کی ٹرے فلزا کے ہاتھ میں دیکھ کر وہ تھوڑا سا پزل ہو گیا۔

”چونکہ میں خود بھی حلیمہ کے ہاتھ سے لے کر کچھ کھانا پسند نہیں کرتی اس لیے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ گھر میں آئے ہوئے کسی مہمان کو وہ سرو کرے۔“

فلزا جوس کیوں لائی تھی؟ یہ بات سعدیہ پہلے کی جان چکی تھی۔ اب فلزا نے خود بھی اس کی وضاحت کر دی۔

”کیوں۔“ ہادی کے لیے فلزا کی پیش کردہ وضاحت خاصی حیران کن تھی۔

”تم جاؤ فلزا تمہاری دادی دو دفعہ تمہارا پوچھ چکی ہیں۔ جا کر پوچھو ہو سکتا ہے انہیں تم سے کوئی کام ہو۔“

مما ڈر گئیں۔ کہیں وہ حلیمہ کے متعلق کوئی ایسی بات نہ کہ دے جو وہ ہادی کو بری لگے۔

”او کے.....“ مختصر سا جواب دے کر وہ دادی کے کمرے کی جانب بڑھ گئی۔ سعدیہ نے دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ اس نے مزید کوئی فضول بات نہ کی اور بنا بحث کے ہی وہاں سے ہٹ گئی۔

☆.....☆.....☆

اس نے اپنے کمرے کی کھڑکی سے ہادی کو باہر جاتے ہوئے دیکھا، بنا سوچے سمجھے الماری میں لٹکا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالا اور تیزی سے چلتی باہر آ گئی، ہادی گیٹ سے باہر ہی نکلا تھا تب وہ اُس کے پیچھے جا کھڑی ہوئی۔

”ایکیوزمی ہادی! اگر آپ کو زحمت نہ ہو تو پلیز مجھے یونیورسٹی تک ڈراپ کر دیں۔ مجھے اپنا فیس پے آرڈر جمع کروانا ہے۔ آج لاسٹ ڈیٹ ہے اور میں صبح جمع کروانا بھول گئی۔ اس نے تیزی سے اپنا مدعا بیان کیا۔

”کوئی بات نہیں آ جاؤ میں ڈراپ کر دوں گا۔“

ہادی نے فرنٹ ڈور اس کے لیے کھول دیا۔ ”تھینک یو۔“ ایک ادا سے اس نے اندر بیٹھتے ہوئے ہادی کا شکر یہ ادا کیا۔ اسی پل جب ہادی نے فرنٹ ڈور بند کر کے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اوپر ٹیرس پر کھڑی شیزا کی اچانک اس پر نظر پڑی۔

”یہ فلزا ہادی کے ساتھ کہاں جا رہی ہے۔“ اُسے ہادی کے ساتھ جاتا دیکھ کر شیزا کو حیرت ہوئی۔

کہاں تو ہادی سے اس قدر چڑتی تھیں کہ نام سننا گوارا نہیں اور کہاں اس کے ساتھ گاڑی میں فرنٹ سیٹ پر بیٹھی ہیں حیرت ہے۔“

شیزا نے حیران ہوتے ہوئے سوچا اور گاڑی آہستہ آہستہ چلتی اس کی نظروں سے اوجھل ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ایک بات پوچھوں دادی۔ وہ دادی کی گود میں سر رکھے کتنی دیر سے ہی بالکل خاموش لیٹی تھی اب جانے ایسی کیا بات یاد آئی جو فوراً اٹھ بیٹھی۔

”سو باتیں پوچھو میرے بچے تمہیں کچھ پوچھنا منع تھوڑی ہے۔“

دادی نے پورے لاڈ سے اُس کی بات کا جواب دیا۔

”آپ نے کبھی محبت کی ہے؟“ وہ ایک جذب کے عالم میں دادی کی جانب تکتے ہوئے بولی۔

”ہاں۔“ دادی کا جواب فلزا کے لیے حیران کن تھا۔ پہلی محبت اپنے اللہ سے کی جس نے ہمیں یہ سب کچھ عطا کیا، ہماری کوتاہیاں، ہماری غلطیاں، ہمارے گناہ، سب پر پردہ ڈالا، وہ ذات ہمیں نوازے جاتی ہے، نوازے جاتی اور نوازے ہی جاتی ہے۔ بے شک ہم اُس کی نافرمانی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں مگر پھر بھی وہ ہم پر ہمیشہ اپنی

نظر کرم رکھتا ہے۔ اور جو خود ہم سے اتنی محبت کرتا ہو پھر ہماری اصل محبت کا حق دار پہلے وہ ہے پھر کوئی اور۔“

”اوہ دادی! اللہ سے محبت تو ہر انسان کرتا ہے، میرا مطلب ہے اس کے علاوہ آپ کو کبھی کسی انسان سے محبت ہوئی۔“

وہ کیا کہنا چاہتی تھی دادی کی سمجھ میں شاید اب آیا تھا۔ ہاں اللہ کا شکر ہے تمہارے دادا سے ہی محبت تھی۔

تو کیا آپ شادی سے پہلے ان سے ملتی تھیں۔“ وہ حیران ہوتے ہوئے بولی، اُسے اتنے سالوں میں آج پہلی بار علم ہوا دادا اور دادی کی لو میرج تھی۔

”نہیں..... ہمارے زمانے میں شادی سے پہلے نامحرم سے ملنے اور ان سے محبت کرنے کا کوئی رواج نہ تھا۔“

فلزا کا کچھ دیر قبل لگایا گیا اندازہ غلط ثابت ہوا۔

تمہارے دادا میرے سگے چاچا کے بیٹے تھے مگر اس زمانے میں پردہ بہت سخت تھا۔ اس طرح منہ پھاڑ، لڑکیاں لڑکوں کے سامنے نہ آیا کرتی تھیں۔ جیسے اس وقت فیشن ہے۔ میری محبت تو شادی کے بعد شروع ہوئی جو ان کا حق اور میرا فرض تھی۔

اچھا یہ تو پھر محبت سے زیادہ مجبوری ہوئی کہ جس کہ پلے باندھ دیا اس سے پیار کرو بے شک دل مانے یا نہ مانے۔

دادی کی باتیں سن کر اُس نے برا سامنہ بنایا۔ اچھا اور جو وہ شتر بے مہار لڑکیوں کے ساتھ گھومتے پھرو، محبت محبت کے گیت گاتے جاؤ اور پھر پتا چلے لڑکے نے کہیں اور بیاہ رچا لیا اور لڑکی کی

کسی اور کے متھے لگ گئی تو بھلا بتاؤ اب وہ دونوں محبت کرنے والے اپنے سے وابستہ ہونے والے دوسرے لوگوں کو کیا دیں گے محبت ہی دیں گے نا۔“

بات کرتے کرتے دادی نے اُس سے تصدیق چاہی۔ شادی کے بعد ہر لڑکی کو اپنے میاں سے پیار ہو جاتا ہے اور ایسی ہی مثال لڑکوں کی ہے، اب تو بیٹا محبت کئی کئی بار ہو جاتی ہے کئی لوگوں کو تو گھر میں بیوی بچے رکھتے ہوئے بھی باہر راہ چلتی لڑکی سے پیار ہو جاتا ہے۔ پھر ایسی بے فیض محبت سے تو بھلی ہمارے زمانے کی محبت تھی نہ کبھی کسی کو دیکھا اور نہ دل ایک کہ بعد دوسرے کی الفت میں الجھا۔

دادی کا بیان کردہ نظریہ محبت فلزا کی محبت سے قطعی مختلف تھا مگر وہ ان سے بحث کے موڈ میں قطعی نہ تھی۔

”دادی سب لوگ ایک جیسے نہیں ہوتے۔ اس زمانے میں بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو محبت کے نام پر دنیا نیاگ رہتے ہیں اور جن کے لیے محبت دنیا کا سب سے خوبصورت رشتہ ہوتی ہے ان کے لیے محبت سے بڑھ کر کچھ نہیں ہوتا۔ محبت ہی ان کی زندگی اور محبت ہی ان کی موت ہوتی ہے۔“

وہ عالم جذب میں آنکھیں بند کیے دھیرے دھیرے بول رہی تھی جبکہ اُس کے الفاظ دادی کو حیران و پریشان کر گئے انہیں محسوس ہوا ضرور کوئی گڑبڑ ہے ورنہ فلزا اور اتنی گہری باتیں قطعی نا ممکن۔ فلزا میری بچی خیر تو ہے آج تو کیسی باتیں کر ہی ہے۔

وہ بے اختیار فلزا کا کندھا ہلاتے ہوئے بولیں۔

خیر ہی تو نہیں ہے دادی، یہ جو محبت ہے نا اس نے میرے وجود کے اندر اپنے نچے گاڑ دیے ہیں مجھے ناکارہ کر دیا ہے۔ مجھ سے میرا اپنا آپ چھین کر

قبل ہی چلے جاتے ہیں۔ ”ہاں اکثر ایسا ہوتا ہے۔“
 گاڑی کالا کھولتے کھولتے وہ رُک گیا۔
 ”دراصل شیزا کالج سے آتے ہی میتھ پڑھنے
 میں زیادہ انٹرسٹڈ ہوتی ہے اور مجھے بھی یہ وقت بہتر
 لگتا ہے کیونکہ شام کو میرے جم کا ٹائم ہوتا ہے اور
 پھر رات کو مجھے خود پڑھنا ہوتا ہے۔“

اس نے گاڑی کے پاس کھڑے کھڑے پوری
 تفصیل سے فلزا کو آگاہ کیا۔

”اچھا.....“ اسے سمجھ نہ آیا کیا کہے کس طرح
 اس پر اپنی بے چینی واضح کرے اُسے بتائے کہ شیزا
 کے علاوہ بھی کوئی اس گھر میں ہے جو اس سے بات
 کرنا چاہتا ہے اسے دیکھنا چاہتا ہے۔

”چلو اب کسی چھٹی والے دن آؤں گا۔ پھر تم
 سے میٹنگ کریں گے۔“

فلزا کو لگا وہ اس کے دل کی بات جان گیا
 ہے۔ ضرور آنا میں انتظار کروں گی۔“

ہادی کے پاس سے آتی کلون کی خوشبو کو اپنے
 اندر اتارتی وہ ایک جذب کے عالم میں بولی۔ اللہ
 حافظ۔

اگلے ہی پل ہادی گاڑی میں بیٹھ کر اُسے مہر
 سے اڑالے گیا اور وہ کتنی دیر وہاں کھڑی اس راستے
 کو دیکھتی رہی جس سے ہادی کی گاڑی گزر کر اس کی
 نگاہوں سے اوجھل ہو گئی تھی۔

☆.....☆.....☆

جانے یہ محبت کیا ہوتی ہے
 کس طرح ہمارے دلوں میں داخل ہوتی ہے
 ہمیں، ہم سے ہی جدا کر دیتی ہے
 اور جب یہ ہوتی ہے تو پھر کچھ اور نہیں ہوتا
 شام میں وہ اپنے کمرے سے باہر نکلی تو لاؤنج
 میں تیار کھڑی ماما کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ عام طور پر
 ماما کیلے کم ہی کہیں جاتی تھیں۔

بالکل تنہا کر دیا مجھے۔ میں اندھی ہو گئی ہوں،
 دادی مجھے کچھ دکھائی نہیں دے رہا۔ وہ آہستہ سے
 سسکی، آنسو اُس کی آنکھ سے بہہ نکلا۔ ہزار بار کہا
 ہے اتنا پر فیوم لگا کر گھر سے باہر نہ نکلا کرو جو ان
 جہان اور خوبصورت لڑکیوں پر جن عاشق ہو جاتے
 ہیں مگر میری بات کسی کی سمجھ میں آئے تب نا۔“

فلزا کے سر پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے وہ دم کرنے
 لگیں فلزا کی حالت نے دادی کو خوف کے ساتھ
 ساتھ وہم میں بھی مبتلا کر دیا۔

فلزا کا اندر کا درد، وہ سمجھ ہی نہ پائیں اور سکتی
 فلزا کو کندھے سے لگائے اس کی کمر پر ہاتھ پھیرنے
 لگیں یہ ان کا فلزا کو تسلی دینے کا اپنا ہی ایک انداز
 تھا۔

☆.....☆.....☆

فلزا کو محسوس ہوا وہ شیزا سے جلنے لگی ہے۔ ہادی
 شیزا سے اتنی محبت اور پیار سے بات کرتا کہ اُسے
 شیزا پر رشک آنے لگا۔ اس نے خود پر پہلے سے
 زیادہ توجہ دینا شروع کر دی۔ وہ خوب تک سک
 سے تیار ہوتی جس نے اُس کی خوبصورتی کو چار
 چاند لگ جاتے وہ جان بوجھ کر ہادی کے سامنے
 جاتی اور منتظر رہتی ہادی کی کسی ایک ایسی نظر جس
 میں اس کے لیے ستائش ہو مگر جانے وہ کیسا شخص تھا
 جس پر فلزا کی موجودگی کا اثر کبھی بھی نظر نہ آیا اور وہ
 ہمیشہ فلزا کے وجود سے لاپرواہ ہی رہا۔ اُس دن وہ
 یونیورسٹی سے گھر لوٹی تو گیٹ کے عین سامنے ہادی
 کو کھڑے پا کر کھل اٹھی، گاڑی کا دروازہ کھول کر
 باہر نکلی اور فوراً اس کے پاس جا پہنچی۔

”آپ کب آئے؟ اسے سمجھ نہ آیا کہ وہ ہادی
 سے کیا بات کرے۔“ ”آیا نہیں اب تو جا رہا ہوں۔“
 جواب دیتے ہوئے وہ مسکرا دیا۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ آپ میری واپسی سے

آپ کہاں جا رہی ہیں؟ وہ پوچھے بنا رہ نہ سکی۔
بازار جا رہی ہوں شیزا کے ساتھ تم نے تورات
ہی منع کر دیا تھا۔

اسے یاد آ یارات ممانے اُسے سے پوچھا بھی
تھا مگر اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔
”ٹیکسی میں جائیں گی۔“

خان چاچا دو دن کی چھٹی پر تھے شیزا اور ماما میں
سے کوئی ڈرائیونگ نہیں جانتا تھا۔

ہاں جانا تو کیب میں ہی تھا مگر ابھی ابھی ہادی
کا فون آیا تھا۔ اس سے بات ہوئی تو وہ بولا تیار ہو
جائیں میں لے جاتا ہوں۔“

”اوہ تو یہ ہادی کے ساتھ بازار جا رہی ہیں۔“
ماں کی بات سنتے ہی اس نے دل ہی دل میں
کچھ سوچا۔ میں پندرہ منٹ میں تیار ہو کر آ رہی ہوں
آپ میرا بھی ویٹ کر لیں۔ مجھے بھی کچھ کام یاد
آ گیا ہے۔ شیزا کو کمرے سے باہر آتا دیکھ کر وہ
جلدی سے بولی۔

”اچھا پھر تم ایسا کرو تم اور شیزا دونوں چلی جاؤ،
اس کو ٹیلر کے پاس جانا ہے اور شاید ایک آدھی کوئی
چیز اور لینی ہے میں تو صرف اس کی تنہائی کے خیال
سے جا رہی تھی۔“

فلزا کو آمادہ دیکھ کر وہ سعدیہ نے شکر کیا کہ وہ
بازار کی خواری سے بچ گئی عام طور پر خان چاچا کے
ساتھ وہ دونوں بہنیں ہی بازار جایا کرتی تھیں۔ اور
پھر جب وہ پندرہ منٹ بعد تیار ہو کر باہر نکلی تو ہادی
آچکا تھا۔ اس نے جیسے ہی اپنی گاڑی کا فرنٹ ڈور
کھولا فلزا اس کے برابر جا بیٹھی، شیزا خاموشی سے
پیچھے سیٹ پر بیٹھ گئی۔

پہلے کہاں جانا ہے؟ اس کی مخاطب یقیناً شیزا
تھی جسے وہ بیک ویو مرر سے دیکھ رہا تھا۔ پہلے ٹوبیہ
چلیں مجھے ہیئر کٹ لینا ہے، آج بڑی مشکل سے

ٹائم نکال کر آئی ہوں۔
شیزا کے بولنے سے قبل ہی فلزا بول اٹھی۔ پہلے
تو ہم منال جا رہے ہیں کیونکہ شیزا کو وہاں کی کافی
بہت پسند ہے۔ پھر اس کے بعد ’مرکز‘ جہاں سے
شیزا نے ٹیلر سے اپنے کپڑے لینے ہیں۔ شیزا کی
خاموشی کو محسوس کرتے ہی خود ہی ہادی نے پروگرام
ترتیب دے ڈالا۔

پھر تمہیں ٹوبیہ چھوڑ کر ہم وہاں سے پنڈی
جائیں گے وہاں سے شیزا نے کچھ کتابیں خریدنی
ہیں ٹھیک بتا رہا ہوں نا تمہارے پروگرام سے کچھ
مس تو نہیں ہو گیا۔“

اس کا مخاطب اب بھی شیزا ہی تھی۔ فلزا کا حلق
اندر تک کڑوا ہو گیا۔ ایسا کریں آپ پہلے فلزا کو ٹوبیہ
چھوڑ دیں۔“

شیزا شروع سے ہی صلح جو طبیعت کی مالک تھی۔
اس لیے اب بھی نہ چاہتی تھی کہ فلزا کو کوئی بات بری
لگے۔

نہیں مجھے بھی منال کی کافی اچھی لگتی ہے۔ اس
لیے میں تمہارے ساتھ جا رہی ہوں، ٹوبیہ پھر کسی
دن چلی جاؤں گی۔“

شیزا کی پیشکش کو اس نے قطعی طور پر رد کر دیا۔
اور پھر اس دن کی شاپنگ سے فلزا کو ایک فائدہ
ضرور ہوا۔ ہادی کا رویہ اس سے قدرے تبدیل
ہو گیا اور کچھ نہ سہی کم از کم دونوں کے درمیان ایک
دوستی کی فضا ضرور پیدا ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

نرگس کا فون آیا تھا وہ چاہ رہی ہے کہ..... وہ
جیسے ہی لاؤنج کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی، ماما
کا جملہ اس کے کانوں سے ٹکرایا، اس سے قبل کے
پاپا ان کی بات کا کوئی جواب دیتے یک دم ان کی
نگاہ فلزا پر پڑی جسے دیکھتے ہی ان کے چہرے پر

رونق آگئی اور وہ خوشی سے بھرپور لہجہ میں بولے۔
 ”ارے میرا شیر پتر آگیا یونیورسٹی سے۔“
 ”جی پاپا“ فلزا جواب دے کر ان کے برابر ہی
 جا بیٹھی۔

”ہاں تو بھئی کیا کہہ رہی تھیں نرگس
 بھابی۔“ فلزا کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے
 انہوں نے ماما کو مخاطب کیا۔

”وہ اسلام آباد آنا چاہ رہی تھیں۔ میں نے کہا
 کہ بقر عید یہاں آ کر کریں مارے ساتھ کیونکہ مبشر
 بھائی تو باری کے پاس لندن گئے ہوئے ہیں۔ پیچھے
 سے یہ تینوں ماں بیٹا بھی گھر میں۔
 ماما کی بات سنتے ہی فلزا کا دل بنا کسی وجہ سے
 دھڑک اٹھا۔

پھر کیا جواب دیا انہوں نے۔“ فلزا کے دل
 میں آئے الفاظ پاپا کی زبان سے ادا ہوئے۔
 ”پہلے تو مان نہیں تھی رہیں، پھر مان گئیں اور یہ
 طے پایا کہ پہلے دن اپنے گھر قربانی کر کے رات
 میں یہ وہاں سے روانہ ہوں گی اور پھر باقی عید
 ہمارے ساتھ منائیں گی۔“ ماما نے پورا پروگرام
 بتایا۔

”چلو یہ تو تم نے اچھا کیا، پاپا ان کے پروگرام
 سے پوری طرح متفق تھے۔

”فلزا دیکھو تمہیں دادی بلا رہی تھیں۔“ سعدیہ
 کی بات سن کر وہ سمجھ گئی کہ ان کا مقصد محض مجھے
 یہاں سے ہٹانا ہے وہ خاموشی سے اٹھ کھڑی ہوئی
 اُسے لگا ضرور کوئی ایسی بات ہے جو ماما اس کے
 سامنے نہیں کرنا چاہتیں۔ اس کا مطلب ہوا نرگس
 آنٹی کسی خاص مقصد کے تحت اسلام آباد آ رہی ہیں
 اور وہ خاص مقصد کیا ہو سکتا تھا بنا کسی سے پوچھے وہ
 سمجھ گئی۔ اور اُس کا رواں رواں خوشی سے ناچ اٹھا
 اور اُسے یقین ہو گیا کہ کچھ دعائیں یوں بنا مانگے

بھی پوری ہو سکتی ہیں۔ جیسے کچھ ہی دنوں بعد ہادی
 اس کا مقدر بننے جا رہا تھا کیونکہ بڑی ہونے کے
 ناطے یقیناً آنے والا پہلا رشتہ اس کا ہی ہونا چاہیے
 تھا اور یہ خیال ہر گزرتے دن کے ساتھ اس کے
 اندر مستحکم ہوتا گیا اور ہادی بنا کسی وجہ کے اس کے حق
 ملکیت میں داخل ہو گیا۔

محبت انسان کو کس قدر بدل دیتی ہے۔ اس کا
 اندازہ ہر گزرتے دن کے ساتھ فلزا کو بھی ہونے
 لگا۔ اب اُسے کالے، سانولے، گندمی اور گورے
 سب رنگ ایک جیسے ہی لگنے لگے۔ حیرت تو یہ تھی کہ
 اس کا رویہ حلیمہ سے بھی کس قدر تبدیل ہو گیا ہے
 شک حلیمہ اب بھی اس کا کوئی کام نہ کرتی تھی، مگر
 اب حلیمہ کو اپنے سامنے دیکھ کر وہ چڑانہ کرتی تھی۔
 اس میں آنے والی یہ تبدیلی سعدیہ نے ضرور محسوس
 کی۔ مگر کچھ بولی نہیں۔ وہ اُسے شاید اپنی کسی دعا کا
 ثمر بھی جو وہ یاں ہونے کے ناطے ہمیشہ فلزا کے حق
 میں کیا کرتی تھی۔ دادی سمجھتی رہیں کہ فلزا پر کچھ اثر
 ہو گیا ہے۔ یا شاید کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ اسی سب
 وہ صبح و شام اس کے لیے پانی کیا کرتیں اور دن
 میں کئی بار اس کی نظر بھی اتارا کرتیں جو بھی تھا فلزا
 کی شوخ و چنچل طبیعت میں ایک ٹھہراؤ سا آ گیا تھا
 اور اب وہ انگلیوں پر دن گن رہی تھی کہ کب یہ ماہ ختم
 ہوگا اور نرگس آنٹی آئیں اور وہ باقاعدہ طور سے
 ہادی کے نام سے منسوب ہو جائے۔

☆.....☆.....☆

شینزا کتنی دیر سے فون پہ مصروف تھی، فلزا نے
 ایک دو بارٹی وی کی آواز کم کر کے سننا بھی چاہا کہ
 دوسری طرف لائن پر کون ہے مگر شینزا کی آواز اس
 قدر دھیمی تھی کہ وہ کچھ سمجھ ہی نہ پائی لیکن جو بھی تھا
 دوسری طرف ضرور کوئی ایسی خاص شخصیت تھی جس
 سے بات کر کے شینزا کے چہرے پر چھانے والی

اور رشک کا شکار ہو جاتی ہوں کیا ہے اس لڑکی میں.....

اس نے اپنے سامنے کھڑی، اپنی سگی بہن پر ایک نظر ڈالتے ہوئے نہایت ہی خود غرضانہ انداز میں سوچا اور مسکرا دی۔

”نہ میرے جیسا اسٹائل اور نہ میرے جیسا رنگ و روپ، قد بھی ہادی کے کندھے سے نیچا، اس میں کچھ بھی ایسا نہیں ہے جو کوئی اسے مجھ پر فوقیت دے۔“

سامنے لگے قد آدم آئینے میں اس نے اپنا اور شیزا کا موازنہ کیا خوبصورتی کسی سے خوف زدہ نہیں ہوتی بلکہ خوف زدہ کرتی ہے۔“

یہ خیال میں آتے ہی اس میں موجود فخر و غرور پہلے سے کئی گنا زیادہ بڑھ گیا۔ فخر و غرور میں گھر کر اس نے شیزا سے یہ پوچھنے کی بھی زحمت نہ کی کہ وہ اتنی دیر سے ہادی سے کیا بات کر رہی تھی۔ اسے اب صرف نرگس آنٹی کا انتظار تھا جن کے آتے ہی ہادی کے جملہ حقوق اس کے نام منسوب ہو جاتے اور پھر وہ اسے ایسا اپنے قابو میں کرے گی کہ وہ شیزا کا نام بھی بھول جائے گا۔ یہ سوچ دماغ میں آتے ہی فلزا بظاہر مطمئن ہو گئی۔

☆.....☆.....☆

ہادی اپنے گھر گیا ہوا تھا، دو دن سے فلزا کی طبیعت خاصی بے چین تھی۔ اسے محسوس ہوا جیسے کچھ ہونے والا ہے اور پھر اس کے اند کا وہم اگلے دن اُس وقت سچ ثابت ہو گیا جب اُس نے سنا کہ نرگس آنٹی کا فون آیا ہے اور انہوں نے ہادی کے لیے شیزا کا رشتہ مانگا ہے۔ کتنی دیر تو اُسے یقین ہی نہ آیا کہ ممانے جو بتایا ہے وہ سچ ہے یا اس کا وہم، اس لیے تو اس نے دوبارہ تصدیق کرنا ضروری سمجھا۔

خوشی اور محبت کی جھلک فلزا کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ وہ تھوٹکی سی بے چین ہو گئی، اب اُسے شدت سے انتظار تھا۔

شیزا کے فون بند کرنے کا، جیسے ہی اس نے فون بند کیا فلزا نے اس کے چہرے پر ایک نظر ڈالی جہاں بڑی خوبصورت مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔

”کیا بات ہے کیوں خود بخود مسکرا رہی ہو۔“ اسے اس طرح مسکراتا دیکھ کر فلزا ٹوٹ کے بنا نہ رہ سکی۔ ”ایسے ہی ہادی کی کوئی بات یاد آ گئی تھی۔“ شیزا کے غیر متوقع جواب نے فلزا کو تھورا سا تپا دیا۔

”یہ اس وقت تمہیں بیٹھے بٹھائے ہادی کیسے یاد آ گیا۔“

ابرو چڑھائے اپنے ناخن فائل کرتے ہوئے اس نے شیزا پر ایک نظر ڈالی۔

”بیٹھے بٹھائے یاد نہیں آئے ابھی ابھی انہوں نے فون پر مجھ سے ایک ایسی بات کی ہے جسے یاد کر کے ابھی بھی مجھے ہنسی آرہی ہے۔“

ہادی نے ایسی کیا بات کہی جس نے شیزا کے چہرے پر مسکراہٹ کا عجیب سا نور بکھیر دیا اس بات سے فلزا کو کوئی دلچسپی نہ تھی اس کی دلچسپی کا محور صرف اتنا تھا کہ فون کے دوسری جانب ہادی تھا۔ اس سے بات کرتا شیزا کا اسٹائل، فلزا کو وہ سب سمجھا رہا تھا جو وہ سمجھنا نہ چاہتی تھی۔

”میں بلاوجہ وہم میں مبتلا ہو رہی ہوں۔“

اس نے شیزا کے سانولے سے عالم چہرے پر ایک نظر ڈالتے ہوئے سوچا میرے اور شیزا سے انتخاب اگر کوئی ایک ہو تو یقیناً کوئی بے وقوف شخص بھی مجھے ہی منتخب کرے گا۔ مجھ جیسی خوبصورت لڑکی کے سامنے شیزا جیسی عام شکل و صورت کی لڑکی کوئی اہمیت نہیں رکھتی۔ میں بلاوجہ ہی اس کو لے کر حسد

آپ کسی کے رشتہ کی بات کر رہی ہیں ماما“ وہ تصدیق چاہ رہی تھی کہ جو اس نے سنا وہ صحیح ہے یا غلط۔

”شاید مجھے نام سننے میں غلط فہمی ہوئی ہے شیزا اور فلزا ہمارے ناموں میں کوئی بھی خاص فرق نہیں ہے۔“

”اپنا ہادی ہے نا اُس کی بات کر رہی ہوں“ ماما کی خوشی قابل دید تھی۔

”میں سمجھ گئی مگر ہادی کا رشتہ کس کے لیے آیا ہے۔ بے چینی اس کے لہجہ سے عیاں تھی۔

شیزا کے لیے ابھی تو میں نے تمہیں بتایا کہ نرگس کا فون آیا تھا۔

”وہ چاہ رہی ہیں کہ عید پر ہادی اور شیزا کی منگنی کی رسم ادا کر دی جائے۔ ماما اپنے ہی دھیان میں بولیں۔

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ دھیمے لہجہ میں چلائی۔

”شیزا کا رشتہ ہادی کے ساتھ ناممکن بے چینی اس کے لہجہ سے عیاں تھی۔

”کیا بات ہے فلزا کیا بولے جا رہی ہو۔“ ماما نے اُسے کندھے سے تھام کر ہلایا۔ آپ کیسی ماں ہیں ہر جگہ شیزا کو مجھ پر فوقیت دے دیتی ہیں۔ سعدیہ کا ہاتھ اُس نے اپنے کندھے سے جھٹکتے ہوئے کہا۔ سعدیہ کو محسوس ہوا وہ رو رہی ہے۔ وہ ایک دم ساکت ہو گئیں۔

”فلزا کیا بات ہے؟ تم کیوں رو رہی ہو۔“ ماں تمہیں فلزا کا رونا نہیں پریشان کر گیا۔

”آپ جانتی ہیں نا میں شیزا سے بڑی ہوں۔ اس ناطے ہادی پر پہلا حق میرا تھا۔“ روتے ہوئے اس نے جو الفاظ کیے وہ سعدیہ کو ہلا گئے۔

”تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے نا۔“ وہ بے اختیار اُسے جھنجھوڑ بیٹھیں۔

تم ہوش میں ہو فلزا، میں ہادی کی بات کر رہی ہوں۔ وہ ہادی جو کالا اور سوکھا سا تھا اودھنے تم نے شروع سے ہی ناپسند کرتی رہی ہو۔ پھر اب ایک دم کیسے یہ سب تمہارے دماغ میں کہاں سے۔“ فلزا کے اس طرح رونے نے ان کا دماغ سلگا دیا تھا۔

”ایک دم نہیں آیا ماما یہ تو اس دن سے ہی آ گیا تھا جس دن آپ نے مجھے اپنی اور نرگس آنٹی کی گفتگو کے متعلق بتایا تھا۔“

اس نے وقت کی نزاکت سمجھتے ہوئے جھوٹ کا سہارا لیا کیونکہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ مگر بیٹا اس دن تو تم نے مجھے صاف انکار کر دیا تھا۔ جس کی گواہ تمہاری دادی بھی ہیں۔“

سعدیہ کو سمجھ نہ آیا کہ اس سارے معاملے میں ان سے کہاں غلطی ہوئی۔

”وہ میری جذباتیت تھی ماما، مگر آپ تو سمجھ دار تھیں۔ ماں ہونے کے ناطے آپ کو تو پتا چلنا چاہیے تھا کہ میرے دل میں کیا ہے مگر نہیں آپ نے ہمیشہ کی طرح شیزا کے دل کا خیال رکھا اور مجھے نظر انداز کر دیا۔

سعدیہ کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا جواب دے ان کے سامنے دونوں ان کی ہی بیٹیاں تھیں۔ اب ان کے لیے فیصلہ کرنا مشکل تھا کہ وہ کس کا ساتھ دیں بہر حال جو بھی تھا فیصلہ شیزا کے حق میں ہو چکا تھا۔

انہیں صرف ایسا محسوس ہوا جیسے صرف اس کی ضد میں ہی فلزا ہادی کی طرف متوجہ ہوئی ہے ورنہ تو اُسے کالا یا سانولا رنگ ہمیشہ قابل نفرت لگا پھر یہ کایا کیسے پلٹ گئی ان کی کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

”بہر حال ماما میں ہادی کے بغیر نہیں جی سکتی، آپ پلیز نرگس آنٹی سے بات کریں۔ انہیں سمجھائیں کہ بڑی بیٹی کے ہوتے ہوئے چھوٹی کا رشتہ نہیں طے کیا جاسکتا امید ہے وہ آپ کی بات

سمجھ جائیں گی۔“

ایک بار پھر اپنی مرضی کا نتیجہ حاصل کرنے کے لیے وہ کچھ بھی کرنے کو تیار تھی۔

”بہت مشکل ہے بیٹا کیونکہ یہ فیصلہ ہادی کا ہے۔“ دھیمے لہجے میں دیے گئے ان کے جواب نے فلزا کو عرش سے اٹھا کر فرش پر پھینک دیا۔
”ایسا نہیں ہو سکتا مگر ضرور آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔“ وہ بے یقین تھی۔

نہیں فلزا یہ غلط فہمی نہیں ہے سچی حقیقت ہے جو میں تمہیں بتا رہی ہوں۔ اس لیے بہتر ہوگا بیٹا تم اپنے دل سے ہادی کا خیال نکال دو اور اس حوالے سے جو کچھ بھی تمہارے اندر ہے اسے آج ہی ختم کر دو جو بات تمہارے اور میرے درمیان ہوئی اسے دوبارہ کسی کے سامنے کرنا کیونکہ اس میں نہ صرف تمہاری بلکہ ہم سب ہی بے عزتی ہے۔ ہادی اب تمہارا ہونے والا بہنوئی ہے۔ اس کی عزت اسی حوالے سے کرو اس کے علاوہ کوئی اور خیال دل میں مت لاؤ۔ ورنہ شیزا کا دل برا ہوگا۔

وہ فلزا کو کسی غلط فہمی میں نہ رکھنا چاہتی تھی۔ اس لیے سب کچھ کھل کر صاف صاف سمجھا دیا۔

ایسا نہیں ہو سکتا مگر میرے ساتھ زیادتی ہوگی اگر آپ سب نے اس سلسلے میں اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہ کی تو میں اپنی جان دے دوں گی لیکن ہادی کو کبھی اپنا بہنوئی نہیں تسلیم کروں گی، اس لیے بہتر ہوگا کہ وہ اگر میرا نہ ہو تو آپ شیزا کے لیے بھی زرگس آنٹی کو منع کر دیں۔“

حتمی انداز میں کہتی ہوئی وہ وہاں سے چلی گئی۔ مگر جاتے جاتے سعدیہ کو ایک ایسے عذاب میں مبتلا کر گئی جس سے نکلنے کا کوئی راستہ فی الحال انہیں دکھائی نہ دیا۔

☆.....☆.....☆

دیکھو بیٹا اپنی ضد چھوڑ دو۔ ہادی میں ایسا کیا ہے جس کے لیے تم اس قدر بلکان ہو رہی ہو۔ اپنی شکل دیکھو دو دن میں سالوں کی بیمار لگنے لگی ہو۔“

دادی نے فلزا کے بال سنوارتے ہوئے اُسے ایک بار پھر سے سمجھانے کی کوشش کی حالانکہ جانتیں تھیں کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے کیونکہ وہ شروع ہی سے اپنی ہر بات منوانے کی عادی تھی۔ میں نہیں جانتی کہ دادی اس میں کیا ہے اور کیا نہیں ہے میں تو صرف اتنا جانتی ہوں کہ مجھے اس سے محبت ہے اور بس۔

”مگر بیٹا بات تو تب بنے گی جب وہ تجھ سے محبت کرے۔“

دادی نے اس کے ٹھنڈے ٹھار ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر سہلائے۔

”آپ نے تو کہا تھا دادی شادی کے بعد ہر لڑکی کو اپنے شہر سے محبت ہو جاتی ہے اسی طرح شیزا کی کسی سے بھی شادی ہوگی وہ خود بخود اپنے شوہر سے محبت کرنے لگے گی۔“ اپنی بات کی تصدیق کے لیے اس نے دادی کے چہرے پر ایک نظر ڈالی۔ گہری سانس لی اور بات کو دوبارہ شروع کیا۔

”اسی طرح نکاح کے بعد ہر لڑکا خود سے منسوب لڑکی کو محبت دینے پر مجبور ہو جاتا ہے سو ہادی بھی ہو جائے گا بلکہ میں اس سے اتنی محبت کروں کہ وہ شیزا کو بھول جائے گا، اس نے دادی کے الفاظوں کا سہارا لے کر انہیں قائل کرنا چاہا۔

”یہ سب اتنا آسان نہیں ہے بیٹا، جتنا تم نے سمجھ لیا ہے۔“ تو پھر آپ لوگ زرگس آنٹی کو منع کر دیں تاکہ کسی بھی حوالے سے ہادی اس گھر میں داخل نہ ہو۔ اس طرح کم از کم ہم دونوں بہنوں کے آپس کے تعلقات خراب نہ ہوں گے۔

یہی مشورہ اُس نے سعدیہ کو بھی دیا تھا۔

دوشیزہ 147

READING
Section

ٹھیک ہے میں تمہاری ماں کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔ دادی کی اتنی تسی ہی اس کے لیے کافی تھی۔

☆.....☆.....☆

افوہ اماں آ کر آپ سمجھتی کیوں نہیں ہے شیزا اور ہادی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں، پھر میں کس طرح فلزا کی بے کار کی ضد کے آگے ان دونوں کی محبت داؤ پر لگا سکتی ہوں۔

دادی فلزا سے وعدہ کر کے آئی تھیں کہ وہ سعدیہ کو ہادی کے رشتہ سے انکار کرنے پر آمادہ کر لیں گی۔

”دیکھو بہو، بیٹیاں تو دونوں تمہاری ہی ہیں پھر سوچو ذرا ایک بیٹی کے دل کی دنیا جاڑ کر تم دوسری کو کس طرح آباد کرو گی۔“

”دوسری کا تو دماغ خراب ہے اس نے ہر بات کو معمول سمجھ رکھا ہے۔ جب چاہا رنگ و روپ کو بنیاد بنا کر انکار کر دیا اور جب چاہا اس کی محبت میں آہیں بھرنے لگی، اُسے سمجھائیں اماں اس طرح بچکانہ حرکتوں سے زندگی نہیں گزرتی بلا وجہ اپنی اور ہم سب کی زندگیاں خراب کر رہی ہے۔“

اتنے دنوں کی بحث نے سعدیہ کے اعصاب کو شل کر دیا تھا وہ یہ سب ظہیر سے چھپ کر کر رہی تھیں۔ ابھی انہیں کسی بات کا علم نہ ہوا تھا ورنہ گھر میں وہ فساد ہوتا کہ الامکان وہ تو صاف صاف نرگس کو منع کر دیتے اور اس طرح شیزا کا نقصان ہوتا جو وہ نہ چاہتی تھیں۔ دوسری طرف شیزا تھی جو کئی دنوں سے گھر میں ہونے والی عجیب و غریب کہانی کو دیکھ اور سن ضرور رہی تھی مگر فی الحال خاموش تھی۔ جانتی تھی کہ اس کی ماں اس کی بہترین وکیل ہے۔

☆.....☆.....☆

فون کب سے بج رہا تھا، فلزا نے کمرے سے

نکل کر دیکھا باہر کوئی بھی نہ تھا۔ اس سے قبل کہ وہ اسٹینڈ تک پہنچتی حلیمہ نے ریوڑ اٹھالیا۔ السلام و علیکم ہادی بھائی میں آپ کو ہی یاد کر رہی تھی۔

اس کی چہکتی آواز اس بات کی غمازی تھی کہ اس نے ابھی تک فلزا کو نہیں دیکھا۔

کس کا فون ہے؟ فلزا اس کے سر پر جا پہنچی۔ وہ جی ہادی بھائی کا..... اس نے فوراً ڈر کے مارے ریوڑ اُسے تھما دیا۔ السلام و علیکم..... فون کان سے لگاتے ہی ہادی کی آواز سماعت کے ذریعے دل میں گھر کر گئی۔

وعلیکم السلام اتنے دنوں بعد تمہاری آواز سنی یقین نہیں آ رہا کہ تم ہی ہو وہ ایک دم ہی آپ سے تم پر آ گئی، ادب و آداب کے سارے مراحل اس نے منٹوں میں ہی طے کر لیے۔

شیزا کہاں ہے کب سے اُسے فون کر رہا ہوں سیل آف جا ہا ہے اس کا۔ ایسے جیسے ہادی نے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”پتا نہیں شاید کہیں باہر گئی ہے، وہ گھر کب ہوتی ہے فون آف کر دیا ہو گا تا کہ تم سے بات نہ کرنا پڑے۔ آپ پہلی بار موقع ملا تھا تھا شیزا کے خلاف ہادی کا دل خراب کرنے کا اور وہ یہ موقع کھونا نہ چاہتی تھی جانے دو بارہ ملے یا نہ ملے۔“

نہیں اس کے سیل کی بیٹری کچھ پر ابلیم کر رہی ہے چارج جلدی ختم ہو جاتا ہے۔ پہلے ہی مرحلے پر وہ اپنی کوشش میں ناکام ہو گئی۔

اللہ حافظ میں آئی کے سیل پر اس سے بات کر لیتا ہوں۔

اور ہاں ایک منٹ..... اس سے پہلے کہ وہ فون رکھتی ہادی کی آواز ایک بار پھر اس کے کان سے لکرائی۔

”جب تک آپ کو کسی کے بارے میں درست بات کا علم نہ ہو اسے آگے تک مت پہنچائیں اس طرح آپ کا اپنا میچ دوسروں کی نظر میں خراب ہوتا ہے۔“
یہ کہہ کر بنا جواب دے ہادی نے فون بند کر دیا وہ کیا کہنا چاہتا تھا فلزا سمجھ گئی، محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ اپنے مطلب کا مہاورہ اُسے ہر وقت یاد آ کر مزید شرمندگی سے بچا گیا۔

☆.....☆.....☆

ایک ماہ کیسے گزرا اُسے پتا بھی نہ چلا، لاکھ اُس کی کوشش کے باوجود بقر عید کا دن بھی آ گیا۔ اس پورے عرصے میں اس کے اور شیزا کے درمیان رکی سی بات رہ گئی تھی۔ جو ہوتی تھی ورنہ ایک دوسرے کے لیے قطعی اجنبی بن گئیں۔ جس میں سارا قصور فلزا کا تھا، فلزا کی خاموشی سے ممانے یہ اندازہ لگایا کہ شاید اُسے اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے، مگر ایسا نہ تھا۔ فلزا جیسے لوگوں کو بہت مشکل سے کوئی بات سمجھ آتی ہے وہ بھی اس وقت جب تک وہ سمجھنا چاہیں، چاند رات تھی اور وہ صبح سے ہی بے چین تھی۔ ایک دن بعد نرس آنٹی نے آ کر شیزا کو ہادی کے نام کی انگٹھی پہنا دینی تھی اور وہ فریق کی طرح کھڑی تماشا دیکھتی رہ جاتی ایسا وہ نہ چاہتی تھی اپنی ہر کوشش میں ناکامی کے بعد اس کے پاس ایک ہی راستہ باقی بچا تھا وہ یہ کہ وہ شیزا سے بات کرے۔ جانتی تھی شیزا شروع ہی سے بے وقوف ہے ضرور بہن کے آنسو دیکھ کر پکھل جائے گی۔ یہ خیال دل میں آتے ہی وہ مطمئن ہو گئی اسے موقع کا انتظار تھا کیونکہ شیزا کو اپنا ہم نوا بنانا کچھ زیادہ مشکل نہ تھا۔ رات ابو بکر منڈی حلے گئے تو وہ دونوں بہنیں خان چاچا کے ساتھ مہندی لگوانے قریبی بازار آ گئیں اور وہیں فلزا نے شیزا سے بات کرنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ شیزا مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے۔

پارلر میں رش کے باعث وہ دونوں انتظار گاہ میں تھی۔ ”میرا خیال ہے ہادی کے علاوہ کوئی دوسری ضروری بات نہ ہوگی آپ کے پاس مجھ سے کرنے کے لیے ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں۔“

اس کا اندازہ بالکل درست تھا، فلزا نے شکر ادا کیا وہ تمہیہ باندھنے کے عمل سے بچ گئی۔

میرا خیال ہے تم سمجھ چکی ہو میں کیا کہنا چاہتی ہوں اور مجھے امید ہے کہ تم مجھے مایوس نہ کرو گی۔

اس نے بے اختیار ہی شیزا کے ہاتھ تھام لیے۔

”ایک بات کہوں فلزا۔“ اس نے فلزا کے

ہاتھوں میں تھما ہاتھ آہستہ سے چھڑوا لیا۔ آپ کے

ساتھ صرف ایک مسئلہ ہے وہ یہ کہ شروع سے ہی جو

چیز میں نے اپنے لیے پسند کی آپ کو بھی وہ ہی پسند

آئی اور میں آپ کی محبت میں اپنی ہر پسندیدہ چیز

آپ کو دینی لگی اپنے پسندیدہ کپڑے، جوتے،

جیولری سب کچھ، اس لیے نہیں کہ میں آپ سے

ڈرتی ہوں بلکہ اس لیے کہ مجھے آپ سے محبت ہے

اور اس محبت کی وجہ آپ کی خوبصورتی نہ تھی بلکہ وہ

خونی رشتہ تھا جو میرے اور آپ کے درمیان تھا۔ آپ

میری اکلوتی بہن تھیں آپ کے علاوہ میرے پاس اور

کوئی رشتہ نہ تھا۔ میں نے ہمیشہ آپ کے حوالے سے

مثبت انداز میں ہی سوچا جبکہ آپ کی سوچ میرے

حوالے سے نفی میں ہی رہی۔“ وہ سانس لینے کے لیے

رُکی۔ اُس کی باتیں فلزا کو حیران کر ہی تھیں اُسے امید

نہ تھی کہ شیزا اس سے اس طرح بات کرے گی شاید

ہادی کی محبت نے شیزا کو اعتماد بخش دیا تھا۔

مجھے میری محبت نے ہمیشہ دینا سکھایا ہر وہ چیز

جو آپ نے مجھ سے مانگی میں نے اپنی محبت میں

آپ کو دے دی اور مجھے حیرت ہے آپ نے نفرت

اور محبت دونوں میں صرف دوسروں سے لینا ہی

سیکھا، دوسروں کی ہر وہ چیز جو انہیں پسند ہو آپ

چھین لینا چاہتی ہیں۔ میری نفرت میں آپ نے مجھ سے سب کچھ چھین لیا اور اب ہادی کی محبت میں آپ اسے مجھ سے چھیننا چاہتی ہیں مگر فلزا ہادی کوئی بے جان چیز نہیں ہے جسے میں آپ کی محبت میں دان کر دوں۔ ہادی ایک جلتی جاگتی حقیقت ہے وہ مجھ سے محبت کرتا ہے اور معاف کیجیے گا میں اپنا سب کچھ آپ کو دے سکتی ہوں مگر ہادی نہیں ہاں البتہ اگر پھر بھی آپ کی تسلی نہ ہو تو آپ ہادی کے سامنے اپنا دامن پھیلا کر دیکھیں شاید کچھ حاصل ہو جائے۔

شیزا کے الفاظ تھے یا انکارے، فلزا ایک دم شرمندہ ہو گئی، اس نے سوچا نہ تھا کہ شیزا کبھی اس سے اس طرح بات کرے گی۔ وہ تو ہمیشہ اس کی عزت کرتی آئی تھی۔ پھر آج کیا ہوا شاید سارا قصور اسی کا تھا اُس نے صرف اپنی انا اور ضد کی خاطر اپنی چھوٹی بہن کے ہاتھوں اپنی عزت بھی گنوا دی۔

اُسے افسوس ہوا کہ کاش وہ اپنی ماں کی بات مان کر اپنے جذبات صرف ان تک ہی رہنے دیتی تو آج اس طرح شرمندہ نہ ہوتی۔ ہادی صرف شیزا کا تھا یہ یقین اُس کے لہجہ میں بول رہا تھا فلزا ہار گئی تھی۔ اُس کے دل میں ہادی کی محبت یک طرفہ تھی اور یک طرفہ محبت کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی اپنی آنکھوں میں آئے آنسو اس نے دل ہی میں اتار لیے۔

☆.....☆.....☆

سامنے صوفے پر واٹ سوٹ میں بھی سنوری شیزا بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ فلزا نے ایک بھر پور نگاہ اس کے چہرے پر ڈالی۔ جہاں محبت کا نور بکھرا ہوا تھا اس کے قریب بیٹھا شخص خوش و خرم ہادی، ایک مکمل کپل ان دونوں کے درمیان وہ کہیں نہ تھی۔ سب خوش تھے سوائے اس کے میں نے بلاوجہ محبت نامی روگ پال لیا۔

”مجھے حلیمہ کی بددعا لگ گئی ہے جو میری زندگی

سے خوشی رخصت ہو گئی۔“ دور کھڑی بھی سنوری حلیمہ کو دیکھتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں یہ ہی آیا۔

”سچ ہے میں جتنا اس کے رنگ روپ سے نفرت کرتی رہی اتنا ہی مجھے ویسے ہی رنگ روپ والے مرد سے محبت ہو گئی۔ جس کے نزدیک میری خوبصورتی کی کوئی اہمیت نہ تھی مگر اس محبت میں ناکامی کا ایک فائدہ ضرور ہوا مجھے کم از کم اپنی اوقات ضرور یاد آ گئی۔ اور یہ احساس کہ خوبصورتی کا تعلق دل سے ہوتا ہے چہرے سے نہیں۔“ یہ سوچتے ہی وہ ہلکا سا مسکرا کر اپنی جگہ اٹھ کھڑی ہوئی تاکہ شیزا اور ہادی کے پاس جا کر انہیں مبارک باد دے سکے۔ اب اُس کے دل میں جو کچھ بھی تھا وہ اُسے دنیا سے چھپانا تھا اور نہ دنیا جیسے نہ دیتی محبت کا رنگ تو تا عمر جو وہ اپنے دل میں پال چکی تھی مگر اب یہ روگ دنیا کے سامنے تشہیر کر کے بدنام ہونے سے بہتر تھا جو کچھ اسے قبول کر کے زندگی گزاری جائے اور اسی سوچنے اُسے تھوڑا سا مطمئن کر دیا تھا اور وہ آہستہ آہستہ چلتی شیزا کے قریب آ گئی دور کھڑی سعدیہ نے دیکھا وہ بہت ہنس ہنس کر ان دونوں سے بات کر رہی تھی۔ اُسے اس طرح ہنستا دیکھ کر ایک اطمینان سا ان کے چہرے پر آ گیا۔

شکر ہے اسے اپنی غلطی کا احساس ہوا اور نہ بہت مشکل ہو جاتی۔ اپنے قریب بیٹھی اماں بی کے کان میں انہوں نے سرگوشی کی، جس کی تصدیق انہوں نے صرف سر ہلا کر کی کیونکہ وہ فلزا کو اچھی طرح جانتی تھیں وہ ان لوگوں میں سے تھی، جنہیں کبھی اپنی غلطی کا احساس نہیں ہوتا سوائے اس کے کہ وہ وقت اور حالات کے ساتھ سمجھوتہ کر لیتے ہیں، اور یہ ہی ان کے لیے بہتر ہوتا ہے وہ سمجھ گئی تھیں کہ فلزا نے بھی سمجھوتہ کر لیا ہے۔

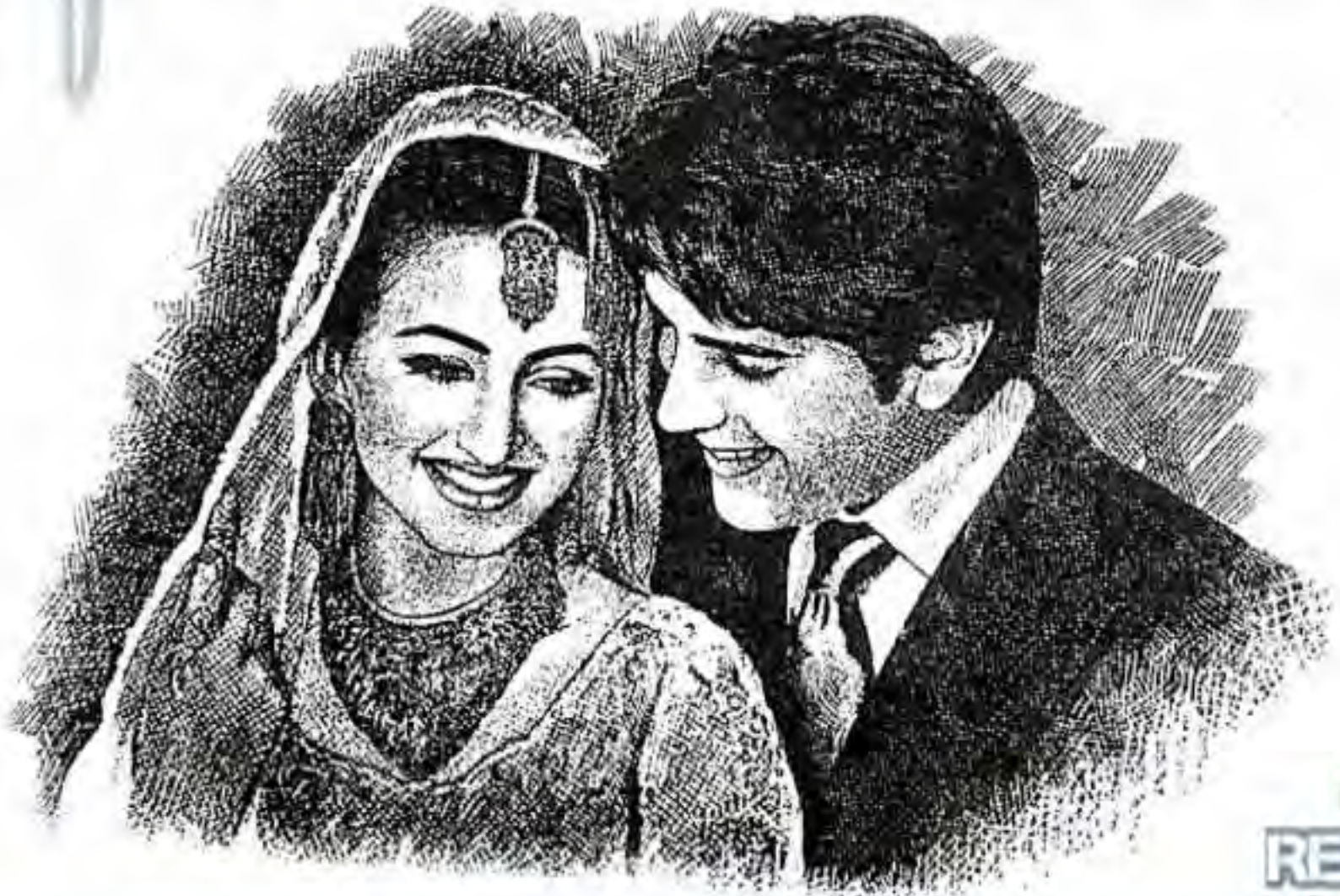
☆☆.....☆☆

مورے پیسا

محبت میں ملاوٹ کر دیتے تو ہم کبھی بھی نہ ملتے یہ سچ ہے عبدالہادی۔“ وہ خوشی سے مسرور تھی آج جیسے شکر ادا کرنے کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ ”ہاں در شہوار محبت میں ملاوٹ کر لینے والے کبھی سرخرو نہیں ہوتے چاہے کچھ بھی کر لیں ہماری ہر صبح روشن.....

کہ پانی بھی نہ پینا پڑے اور پیاس مٹ جائے.....؟؟ ٹیل می..... کیا کوئی ایسا طریقہ ہے کہ سانس لیے بغیر انسان زندہ رہ پائے..... بتاؤ نا ہے کوئی ایسا طریقہ.....“
وہ پاگلوں کی طرح اپنی آنکھوں میں لہورنگ

”اہل کیا تم نہیں جانتیں کہ میں اُس سے کتنا کتنا..... کتنا شدید پیار کرتی ہوں.....؟؟ تم مجھے کہتی ہو میں صبر کروں.....؟؟ میں کیسے صبر کروں اہل! تم بتاؤ کوئی ایسا راز ہے جس سے سورج بھی نہ نکلے اور نیادن چڑھ جائے؟ کیا کوئی ایسا حل ہے



دور ہوئی تھی اور بولتے بولتے رُک گئی۔“
”کیا امل کا دل کا پنے لگا۔“

”بابا کو بتادو کہ اگر زبردستی کی گئی تو اس بار اس محل جتنے بڑے گھر میں اس سے بھی برا ہوگا جو پانچ سال پہلے ہوا تھا۔“ وہ نہایت دکھ بھرے انداز میں قطعاً کہہ رہی تھی۔ امل کو اپنے حواس قابو میں رکھنا دشوار ہو گئے۔ وہ ساتھ ہی رکھی کرسی پر زبردستی خود کو سنبھال کر بیٹھ گئی۔

یہ کسی کہانی، ڈرامے کا فلم کا سین نہیں تھا بلکہ یہ تو ایک حقیقت تھی جو وہ اپنی آنکھوں کے سامنے رکھ دیا تھا۔ وہ ایک لڑکی ہی تھی بہت خوبصورت لڑکی وائٹ لباس میں ملبوس پر یوں کا ساجسن و سراپا لیے نازک پھولوں جیسی پر وہ پہاڑی کے بالکل اوپر Peak پر کیوں جائے جا رہی تھی۔ تیز تیز جیسے خودکشی کا ارادہ رکھتی ہو۔ پہاڑی کے اس پار تو کوئی کھائی تھی۔ بہت گہری کھائی تھی۔ وہ لڑکی بہت تیزی سے چڑھ رہی تھی۔ وہ گر گئی تو بیچ نہ پائے گی۔

عبدالہادی کا دماغ تیز میٹر کی طرح گھوما تھا سارے حواس بہال ہو گئے تھے وہ تیزی سے اس کے پیچھے جانے لگا۔

”اے لڑکی..... سنو لڑکی..... تم وہاں کیوں جا رہی ہو.....؟؟ تم گر کر مر جاؤ گی..... تم آگے مت جاؤ.....“ وہ حیرت و خوف سے چلا چلا کر اس کو بلا رہا تھا، پر شاید اس کی آواز سن چکی تھی اور اسی وجہ سے اس کے قدموں میں اور تیزی سے آگئی تھی۔ عبدالہادی کے قدم اور بھی تیز ہو گئے اور بالآخر عبدالہادی نے پھر تیلے انداز میں پہنچتے ہی اس لڑکی کا بازو تیزی سے اپنی طرف کھینچا تھا اور اس سرعت اور جلد بازی کے انداز میں وہ دونوں ہی اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکے اور پہاڑی پر دھڑام سے

بھرے اپنے منہ سے بلا سوچے سمجھے بہت مشکل سوالات اپنے سامنے کھڑی امل سے کر رہی تھی۔ کوئی راز، کوئی حل طریقہ ہوتا تو وہ اپنی زبان کھولتی۔ وہ سناٹے میں تھی اُس کی شدت، اس کی جذباتیت، اس کا جنون..... امل کی روح کانپ رہی تھی۔

”میں نہیں مانوں گی..... کبھی نہیں۔“ اس کا فیصلہ امل تھا۔

”امل میرا سب کچھ اس کا ہے سب کچھ، میری روح، میرا جسم، میری زندگی، میری موت، میری سانسیں میرا خون، میں سب کچھ اس کو سونپ چکی ہوں۔“ وہ چلا چلا کر حلق پھاڑ پھاڑ کر، بے خوف ہو کر بتا رہی تھی۔ اتنی نڈر، اتنی بے خوف، اتنی بے باک کیا یہ ہر وقت ہنسنے ہنسانے والی در شہوار ہی ہے؟؟“ امل مجسمہ حیرت تھی۔

”تم مجھے صبر کی تلقین مت کرنا۔ نا ہی مجھے کسی بھی عمل کے لیے روکنا..... میں بتا رہی ہوں میں کچھ بھی کرنے کے لیے نہیں رکوں گی، کبھی بھی نہیں؟؟ اس کے بغیر جینا ناممکن ہے ناممکن.....“ وہ قطعی انداز سے کہتی ہوئی امل کے پاس آ کھڑی ہوئی تھی اور پھر بے بس ہو کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ امل کو اپنی پیاری بہت پیاری دوست پر بے تحاشا ترس آیا تھا۔ امل نے اسے گلے سے لگا لیا اور خود بھی رونے لگی۔

”امل تم امی کو بتادو تم بابا کو بتادو کہ میں بہت بہت پیار کرتی ہوں اس سے۔ مجھے اس کے علاوہ کسی سے شادی نہیں کرنی ہے۔“ وہ چھوٹے بچوں کی طرح ضد کر رہی تھی۔

”بتادوں گی شہوار، سنبھالو خود کو۔“ امل نے لرزتے لب کھولے تھے۔

”امل تم بابا کو بتادو کہ.....“ وہ ایک جھٹکے سے

گر گئے۔ وہ دونوں نیچے کی طرف گرتے جا رہے تھے۔ عبد الہادی نے اس لڑکی کا بازو چھوڑا نہیں تھا بلکہ اور بھی سختی سے پکڑ لیا تھا۔ وہ دونوں گر رہے تھے۔

فرق صرف اتنا تھا کہ ان کا رخ کھائی کی طرف نہیں بلکہ پتھر پٹی سڑک کی طرف تھا۔ کتنے ہی نوکیلے پتھر دونوں کو زخمی کر چکے تھے۔

☆.....☆.....☆

”ایسا نہیں ہو سکتا وہ مجھے چھوڑ کر کیسے جا سکتا ہے؟“ در شہوار حیرت و کرب کا شکار تھی۔ وہ بے یقینی سے کمروں کے چاروں اطراف گھوم کر دیکھ رہی تھی۔ ہر چیز پہ سناٹا تھا۔ ہر چیز پتھر پٹی تھی۔ رکی ہوئی سانسوں کی طرح۔ در شہوار کا دماغ کسی گرداب میں پھنس رہا تھا۔ بے یقینی کا پہاڑ اس کے اوپر آگرا تھا۔

”نہیں..... یہ لکھائی اس کی نہیں ہے۔“ وہ ہاتھ سے پکڑے کاغذ کو اپنی آنکھوں کے بہت قریب لا کر لا کر دیکھ رہی تھی۔

”میں آپ کے بابا کو بھی کوئی بھی صدمہ دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا در شہوار..... آپ میری پسند ضرور ہو مگر محبت نہیں، جو آپ کی خاطر میں ہر حد سے گزر جاؤں۔“

”نہیں نہیں یہ لفظ یہ الفاظ یہ جملے اس کے نہیں ہیں۔“ وہ چلانے لگی تھی۔ دل پاتال میں جا رہا تھا۔ اپنے وجود کو کسی جلتی ہوئی بھٹی کے اندر گرتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔

”میں یہاں سے اپنی مرضی سے جا رہا ہوں مجھے کسی نے مجبور نہیں کیا۔ آپ مجھے ڈھونڈنے کی کوشش مت کرنا کیوں کہ اگر میں دوبارہ آپ کو مل بھی گیا تب بھی آپ کا نہیں ہو پاؤں گا۔ کیوں کہ آپ کے پاپا نے آپ کی شادی طے کر دی ہے اور

مجھے یقین ہے کہ آپ ایک بہت اچھی زندگی گزارو گی۔“

”کوئی گہانی اور کچھ ناگہانی سی آفت، کوئی دعا تھی یا کوئی بد دعا تھی، کوئی سمجھوتہ تھا یا مصلحت، ہر لفظ اس تحریر کا اپنے اندر ایک بھید چھپائے ہوئے تھا۔

”نہیں..... کبھی نہیں! تم میرے ساتھ اتنا بڑا دھوکہ نہیں کر سکتے۔ تم مجھے اتنی بڑی بد دعا دے کر نہیں جا سکتے۔“ در شہوار نے جنونی انداز سے چلاتے ہوئے وہ کاغذ ٹکڑے ٹکڑے کر ڈالا۔

”تم کہاں ہو.....؟ تم باہر آؤ تم یہیں کہیں چھپے ہو۔ وہ مشتعل ہو کر چلا رہی تھی اور طیش میں آ کر اس کے کمرے کی چیزیں اٹھا اٹھا کر زمین پر مار رہی تھی۔

”باہر آؤ ہادی! باہر آؤ تم مجھے چھوڑ کر نہیں جا سکتے۔“ اس کا سب کچھ چھن گیا تھا۔ وہ واش کا دروازہ کھول کر پکارنے لگی پھر بھاگتی ہوئی واپس آ کر کمرے کے تمام پردے ہٹا ہٹا کر دیکھنے لگی۔

پورا وجود شدت سے کانپ رہا تھا اس کا۔ وہ بے قابو ہو رہی تھی۔ عبد الہادی وہ پوری شدت سے چلا رہی تھی۔ عبد الہادی تمہارے بغیر میں ایک دن بھی زندہ نہیں رہ سکتی۔ وہ اپنے بال نوچنے لگی۔ اس کا خزانہ جیسے زمین کے اندر دفن ہو گیا تھا وہ باہر نہیں نکال پارہی تھی۔

”عبد الہادی واپس آ جاؤ پلیز واپس آ جاؤ۔“ اس کے شیشے کا گلاس اٹھا کر سامنے رکھے ڈرینگ ٹیبل کے شیشے پر زور سے مارا تھا۔ ڈرینگ ٹیبل کا شیشہ ایک چھناکے سے ٹوٹ کر ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا۔

”عبد الہادی۔“ ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں میں عبد الہادی کی شکل نظر آئی تھی۔ وہ لمحے کے

ہزاروں حصے میں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کے پاس پہنچ گئی۔ پر یہ کیا..... ان کے اندر تو وہ خود تھی توٹی پھوٹی در شہوار لہو لہو، نوحہ کناں در شہوار، پاگل در شہوار جنونی در شہوار وہ خود کو بہتی آنکھوں کے ساتھ دیکھ رہی تھی اور پھر ایک بڑا نوک دار ٹکرا اپنے ہاتھ میں اٹھا کر تیزی سے اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی کاٹنے لگی۔ ”آ جاؤ عبدالہادی آ جاؤ۔“ ابلتا خون اور مدھم آواز۔

پورا کمرہ عجب حالات بیان کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

ایک نوکیلا پتھر اس لڑکی کے سر سے ٹکرا کر اس کو زخمی کر چکا تھا اور خون بہت تیزی سے بہ رہا تھا۔ پکی سڑک پر گرتے ہی عبدالہادی نے اس کا بازو چھوڑ دیا تھا۔ خراشیں اور چوٹیں اس کو بھی آئی تھیں۔ پر وہ ہوش میں تھا جبکہ وہ اپنا ہوش کب کا کھو چکی تھی۔ عبدالہادی خود کو سنبھال کر فوراً اٹھ کھڑا ہو گیا تھا۔ وہ بے ہوش سڑک پر پڑی تھی۔ خون نکلنے کی وجہ سے رنگ پیلا زرد ہوتا جا رہا تھا۔ عبدالہادی نے تیزی سے اسے اپنے بازوؤں میں اٹھایا اور بھاگتا ہوا سڑک پر دائیں طرف مڑ گیا، جہاں سے کچھ ہی دور اس کا چھوٹا سا ہٹ (گھر) تھا۔

”پتا نہیں کون ہے یہ..... کیا چاہتی تھی..... اور یہ کیا ہو گیا۔ اللہ خیر کرے.....“ وہ ہم کلامی کرتا ہوا اس کو بیڈ پر لٹا کر فرسٹ ایڈ بکس کھول رہا تھا۔ نہایت سرعت سے پٹی اور آیوڈین نکال لی تھی اور اس کا سر اپنے گھٹنوں پر رکھ کر کاشن سے صاف کرنے لگا۔

پھر چھوٹی قینچی لے کر اس نے تھوڑے سے بال کاٹ کر زخم صاف کیا تھا۔ خون رک چکا تھا۔ عبدالہادی نے اس بے ہوش لڑکی کو پٹی باندھ کر لٹا

دیا تھا اور پھر خود اپنی شرٹ اتار کر اپنے زخموں سے رستا خون صاف کرنے لگا۔

وہ تقریباً دو گھنٹے بعد ہوش میں آئی تھی۔ ”پانی پانی..... اس کے گلابی لبوں سے لفظوں کی صورت صرف اتنا ہی نکلا تھا۔ عبدالہادی نے پانی کا گلاس بھر کر اس کے پاس بیٹھ کر اس کو سہارا دے کر اٹھایا اور پانی کا گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

لڑکی نے بند آنکھیں بمشکل کھولنے کی کوشش کی تھی پر کامیاب نہ ہو سکی۔ عبدالہادی نے اس کو دوبارہ لٹا دیا اور خود کمرے سے باہر آ گیا ہو سکتا ہے اس لڑکی کے گھر والے اس طرف اس کا اتنا پتا لینے ضرور آئیں۔

وہ اپنے گھر سے نکل آیا مگر سڑک دور دور تک خالی تھی۔ یہ گھر عبدالہادی نے خود اپنی پسند سے مری کے خوبصورت پرفضا سنان سے علاقے میں خریدا تھا۔

سر سبز پہاڑ اور لمبی سڑک اور سڑک کے اس پار نیلی جھیل وہ ہفتے میں دو دن ادھر ہی گزارتا تھا۔ ہفتہ اور اتوار اس کا ویک اینڈ ادھر ہی گزارتا تھا۔

وہ کافی دیر ادھر ہی کھڑا رہا تھا اور پھر تھک کر واپس گھر آ گیا۔ کمرے میں وہی ماجول تھا۔ عبدالہادی زچ ہو کر اس لڑکی کے قریب آ گیا۔ ”سنو! اٹھ جاؤ آنکھیں کھولو!!“ وہ اپنی فطری نرم آواز لہجے میں بول رہا تھا۔ دیکھو تمہاری جان بچ گئی ہے۔“ وہ اس کا گال تھپتھپانے لگا۔ اس نے اس کے ہاتھ پکڑ کر ہلائے تو اس کے بے جان وجود میں جیسے کچھ جان سی آئی تھی۔ بند آنکھیں وا ہوئیں تھیں، ساکت ہونٹوں میں جنبش ہوئی تھی۔

”کون؟ تم کون ہو.....؟؟“ لڑکی عبدالہادی کو دیکھتے ہی پہلا سوال کر رہی تھی۔ ”میں جو کوئی

بھی ہوں تم اس بات کا شکر مناؤ کہ اللہ پاک نے میرے ذریعے تمہاری جان بچائی ہے تم کیوں ادھر پہاڑی کی طرف جا رہی تھیں.....؟؟؟ تم کیا پاگل ہو؟؟؟

عبدالہادی کو غصہ آنے لگا، وہ سختی سے بول رہا تھا اور پھر جیسے اس لڑکی کو سب کچھ یاد آ گیا وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو دیکھنے لگی اور پھر جھٹکے سے اٹھ بیٹھی ”تم کون؟ تم..... کیوں بچایا مجھے تم نے؟ کس نے حق دیا تمہیں مجھے بچانے کا؟ کیا سوچ کہ تم نے یہ ثواب کا کام کیا ہاں.....؟؟؟“

وہ پوری طاقت سے چلا کر بھری ہوئی شیرنی بن کر پوچھ رہی تھی۔ ”تم نے ثواب نہیں گناہ کا کام کیا ہے سبھی تم..... میں اپنی مرضی سے ختم کر رہی تھی اپنے آپ کو میں نجات دلارہی تھی۔ خود کو اس جہنم سے جس کا نام ”دنیا“ ہے۔ وہ عبدالہادی کا گریبان سختی سے پکڑ چکی تھی۔ وہ غصے میں تھی طیش میں تھی، کرب میں تاسف میں کیا کچھ نہیں تھا۔ اس کے ہر انداز میں عبدالہادی سناٹے میں چلا گیا۔

تم نے پھر مجھے اس بے رحم سفاک خود غرض دنیا کے ستم اٹھانے کے لیے بچا لیا..... کیوں؟ کیوں؟ وہ آپے سے باہر ہو رہی تھی۔ ”تم پاگل ہو کیا چھوڑو میرا گریبان۔“ عبدالہادی نے ہوش میں آتے ہوئے جھٹکے سے خود کو چھڑایا۔ ”اور بند کرو یہ رونا دھونا سمجھی تم۔“

”وہ پہلی بار اس قدر زور سے دھاڑا تھا۔ وہ ایک دم خاموش ہو گئی پر آنکھیں آنکھیں مسلسل آنسو بہا رہی تھیں۔ وہ عبدالہادی کو گھور رہی تھی۔“ دیکھو تم جو کوئی بھی ہو۔ تمہاری جو دکھ بھری کہانی ہے مجھے اس سے کوئی لینا دینا نہیں ہے۔“ وہ قدرے نرم ہو کر اس کے سامنے بیٹھا بول رہا تھا۔ ”خودکشی کرنا حرام ہے اور حرام یا غلط کام جہاں بھی ہوتے

ہوئے دیکھو اس کو روکنے کی کوشش کرو۔ صرف یہی بات سوچ کر میں نے تمہیں بچایا ہے۔ اللہ پاک کے غیض و غضب کا اندازہ نہیں ہے کیا تمہیں کیوں خود کو ناقابل معافی بنا رہی تھیں۔“

وہ بہت مدیرانہ اور ہمدردانہ طریقے سے بات کر رہا تھا۔ اس پر اس کے نام کا پورا پورا اثر تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو اچھی ہدایت دینے میں آگے رہتا تھا غلط اور حرام سے بہت دور۔

وہ اپنے ہاتھوں میں اپنا چہرہ چھپا کر زار و قطار رونے لگی۔ ”یہ لو پانی پیو۔“ عبدالہادی نے لمبی ٹھنڈی سانس بھری تھی اور اس کو پانی کا گلاس پکڑ آیا جو اس نے بلاچوں چاں پکڑ لیا۔

”مجھے اپنے گھر کا پتا بتاؤ، میں تمہیں چھوڑ کر آتا ہوں۔ وہ کچھ سوچ کر سنجیدگی سے بولا مجھے کتنا وقت ہوا ہے یہاں آئے۔“ وہ اس کا چہرہ تکتے لگی تقریباً چار گھنٹے۔ ”عبدالہادی متانت سے بولا۔

”کیا.....؟ وہ حیرت سے چلائی۔“ ”اسکول بس۔ اسکول بس تو یقیناً مجھے ڈھونڈ ڈھونڈ کر واپس جا چکی ہوگی۔ وہ حیرت و تشویش سے بولتی ہوئی اٹھ کھڑی ہوئی پر لڑکھڑا پر پھر بیٹھ گئی پاؤں پر بھی زخم تھا۔

تم کسی اسکول کے ساتھ ٹرپ پر آئیں تھیں؟؟ وہ پوچھنے لگا۔ ”جی میں ٹیچنگ کرتی ہوں پرائیویٹ اسکول میں۔“ وہ سر تھام کر بول رہی تھی۔

میں گاڑی نکالتا ہوں تم جس ہوٹل میں رکی اس کا مجھے پتا بتاؤ۔“ عبدالہادی تیزی سے اٹھا اور پھر وہ اس لڑکی کے بتائے ہوئے پتے کے مطابق اس ہوٹل لایا۔ اسکول کی پرنسپل اسی ٹینشن اور پریشانی کی وجہ سے نہایت غمگین ہو کر ابھی تک واپس نہیں گئی تھیں بلکہ گمشدہ (مس) لڑکی کی

ڈھونڈ بھر پور طریقے سے جاری تھی۔

”در شہوار! اس کو دیکھتے ہی وہ غصے سے چلا کر اٹھتے ہوئے بولی تھیں۔ پر اس کے ماتھے پر بندھی ہوئی پٹی اور خون دیکھ کر خود ہی نرم پڑ گئیں۔ عبدالہادی نے پہاڑی سے گرنے کا واقعہ اپنے لفظوں میں سنایا اور فوراً وہاں سے واپس لوٹ آیا پر جانے کیوں وہ اپنی کمپنی کا کارڈ لڑکی کو دے آیا تھا۔

”بڑے پاپا..... بڑی امی بڑے پاپا ادھر آئیں..... احمد بھائی..... امل چلا چلا کر سب کو اکھٹا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔

ایک قیامت صغریٰ تھی جو چوہدری ہاؤس پر ٹوٹ پڑی تھی۔ در شہوار چوہدری حماد کی دو بیٹیوں کے بعد اکلوتی بیٹی تھی پورے گھر کی لاڈلی۔

”لا ابالی..... ہنس مکھ..... نرم دل؟ فرما بردار نہایت پرکشش۔“ وہ کس حال میں پڑی تھی۔ آج پورے گھر پر سناٹا چھا گیا تھا۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ ہر لب دعا کر رہے تھے کہ کسی طرح در شہوار کی جان بچ جائے۔

چوہدری ہاؤس چار کنال پر پھیلا ہوا تھا۔ چوہدری حماد چوہدری جواد اور چوہدری حیدر تینوں بھائیوں پر حکمرانی چوہدری حماد کی ہی چلتی تھی۔ چوہدری ہاؤس بنا بھی تو ان کی ان تھک محنت سے ہی تھا۔ وہ اپنے بھائیوں کے بچوں کو بھی اپنے بچوں کی طرح ہی سمجھتے تھے اور چوہدری حیدر کا ایک بیٹا اور ایک ہی بیٹی امل تھی۔ جو کہ در شہوار کی ہم عمر تھی۔

در شہوار کے دو بھائی بڑے تھے احمد اور امجد۔ چوہدری جواد کے بیٹے اطہر اور رحم تھے اور بیٹیاں ام مریم اور ام ایمن تھیں۔

در شہوار سب سے الگ تھی۔ وہ پورے گھر میں

سانولی رنگت کی تھی۔ اس کے بال بھی کرلی تھے۔ اور کمر سے نیچے نہیں آتے تھے۔ چاہے وہ ان کو لمبا کرنے کی کتنی سعی کر لے۔ ناک اتنی ٹیکھی نہ تھی پر پھیلی ہوئی بھی نہ تھی۔ مناسب نقش تھے۔ پر آنکھیں مقناطیسی تھیں، کالی سیاہ گھور چمکدار آنکھیں کتابی چہرے پر جب مسکراہٹ کا ڈمپل پڑتا اور در شہوار کی شخصیت آفاقی لگنے لگتی۔

وہ اس وقت قابل رحم حالت کا شکار تھی۔ گھر کے نوکر چاکر درود یوار، پتے، درخت سب ہر چیز دعا گو تھے کہ وہ بچ جائے۔

دو دن ہی گزرے تھے اور وہ اس کے سامنے بھی ان دونوں کے درمیان اس کا سیل نمبر تو اس کے پاس ہی تھا پر نہ کوئی کال آئی تھی نہ ہی مسج پھر اچانک وہ لڑکی خود چل کر اس کے سامنے کیسے آ گئی تھی۔ اُسے اتنی آسانی سے اس کا آفس ڈھونڈ لیا تھا۔

وہ دم بخود تھا۔ سفید رنگ کے لیس کے پریٹڈ سوٹ میں اس کا اداس حسن قیامت ڈھا رہا تھا۔ ”آپ نے میری زندگی اور بھی دشوار کر دی۔“

وہ روہانسی ہو کر بولی۔ ”میں اس لیے نہیں آئی کہ آپ مجھ پر ترس کھاؤ.....“ وہ فوراً صفائی دینے لگی تھی۔ جسے عبدالہادی کی نظروں کے سوال پڑھ لیے ہوں۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ عبدالہادی متانت سے بولا وہ سامنے رکھی کرسی پر ٹک گئی۔

”کیا ہوا ہے میری وجہ سے..... اور آپ میرے پاس کیوں آئی ہیں؟“ وہ ہمدردانہ طریقے سے پوچھنے لگا۔ ”میری ساس میرے سر کسی بھی صورت یہ ماننے کو تیار نہیں ہیں کہ دو دن پہلے کوئی حادثہ ہوا تھا بلکہ وہ اس بات پر بضد ہیں کہ میں خود آپ کے ساتھ غائب ہوئی تھی اور میرے آپ

”ہے ہے یہ کس کو اندر گھسالی ہے اب یہ دن بھی دکھائے گی تو۔“

وہ پہلے تو ان دونوں کو دیکھ کر چونکی پھر چوکی سے اٹھتے ہوئے اپنی بدزبانی پر اتر آئی۔ اماں یہ وہی لڑکا ہے۔“ کون سا لڑکا؟

سنئے ہو.....؟ کدھر ہو باہر آؤ آپ کی بہو کا نیا ڈرامہ دیکھ لو.....“ وہ عورت سن ہی نہیں رہی تھی بلکہ شاید اپنے خاوند کو بلارہی تھی۔

برآمدے کے کونے میں جو کمرہ تھا وہاں سے ایک 60 کے لگ بھگ بوڑھا باہر نکلا تھا۔ ”کیا ہوا.....؟“ اس کے تیور کچھ اور ہی سخت تھے۔

”کون؟ کون ہے یہ۔“ وہ آ کر زور سے چلایا۔ ”اماں یہ لڑکی نئے نئے چاند چڑھاتی رہے گی اور تم چند ہزار کی نوکری کی خاطر اس کو برداشت کرنی رہنا۔“ ساتھ والے کمرے سے ایک شاطری لڑکی گود میں بچہ اٹھائے باہر آئی تھی۔ شاید وہ نندھی۔

یہاں تو ایک تماشا کھڑا ہو گیا تھا۔ ”اماں یہ وہی لڑکا ہے جو اس دن۔“ بکو اس بند کرو حرافہ ہماری عزت کے جنازے.....“

”کیا بکو اس ہے یہ سب..... کیا تماشا لگا لیا ہے آپ لوگوں نے بدزبانی اور الزام تراشی کی بھی ایک حد ہوتی ہے؟؟“

اس سارے وقت میں عبدالہادی پہلی بار ضبط توڑ کر بولا تھا اور اس قدر غصے اور غضب سے بولا تھا کہ ہر شخص سہم کر اس کو دیکھنے لگا۔

”یہ لڑکی ایک گھنٹے سے آپ کو کچھ بتانے کی کوشش کر رہی ہے اور آپ لوگ سن ہی نہیں رہے۔ وہ اس کے سر کے قریب آ کر دھاڑ رہا تھا“ میں اس کو نہیں جانتا آپ چاہیں تو قرآن پاک پر ہاتھ رکھو لیں کسی کے کردار کی گواہی اس

کے ساتھ کوئی پوشیدہ مراسم ہیں۔ وہ نظریں جھکائے نان اشاپ بولنے لگی تھی۔ ہر لفظ ایک دھماکہ تھا جو عبدالہادی کی سماعتوں پر ہو رہا تھا۔ ”شٹ اپ..... بس کرو۔“ وہ خفت سے سرخ ہو کر دھاڑا تھا۔

یہ تمہارا کوئی ڈرامہ تو نہیں.....؟؟“ عبدالہادی کچھ سوچتے ہوئے بولا۔ ”ڈرامہ.....؟؟“ وہ حیرت میں ڈوبی۔ ”ہاں ڈرامہ۔“ عبدالہادی نے توضیح کی۔ ”مجھے پتا ہے آپ یہی سب کہیں گے یہی سب سوچیں گے مگر صرف آپ کے پاس اس لیے آئی ہوں کہ آپ میرے ساتھ اک بار چل کر میرے ساس سر کو یقین دلا دیں کہ میں بدنصیب مرتے مرتے بچ گئی ہوں۔ آپ کا یہ احسان میں کبھی نہیں بھولوں گی۔

”وہ بے بس وہ کر نہایت منت بھرے انداز میں عبدالہادی سے کہنے لگی تھی عبدالہادی کا نرم دل کھلنے لگا۔ ”آپ کے ہر بینڈ کدھر ہیں؟“ وہ اپنی تسلی کر رہا تھا۔ ”ان کی چار سال پہلے ڈتھ ہو چکی ہے۔“ وہ تڑپ کر بولی ”او..... او کے سوری۔“

عبدالہادی کا دل بالکل موم ہو گیا کہاں ہے آپ کا گھر؟ دس منٹ ویٹ کریں چلتے ہیں۔“ وہ اپنی فائلز چیک کرنے لگا اور اگلے دس منٹ بعد وہ اس انجان لڑکی کے ساتھ اس کے گھر جا رہا تھا۔

یہ پنڈی کا ایک گنجان آباد علاقہ تھا۔ زیادہ تر آبادی غریب طبقے کی تھی۔ کچھ پختہ کچھ ٹوٹی پھوٹی گلیاں کر اس کرنے کے بعد وہ ایک زرد دروازے والے گھر کے سامنے تھے۔ گھر کی حالت نہ زیادہ اچھی تھی نہ بری وہ دونوں اندر آ گئے۔ ایک نہایت تیز طرار قسم کی عورت برآمدے میں رکھی ہوئی چوکی پر بیٹھی پان چبا رہی تھی۔

”عبدالہادی نے بنا سوچے سمجھے فوراً فیصلہ کیا تھا اور سنا بھی ڈالا تھا۔
میں ابھی مولوی کو بلاتا ہوں بوڑھا جلد بازی کا شکار ہوا۔

”کیا..... کیا ہو رہا ہے یہ سب.....“ وہ بوکھلا کر سب کو دیکھ رہی تھی اور دوہی گھنٹے گزرے تھے جو کل انجان تھی اس پل وہ اس کی ملکیت اس کی منکوحہ اس کی بیوی اس کی شریک حیات بن گئی تھی۔

واپس جانے کے لیے وہ گاڑی میں بیٹھے تو عبدالہادی نے اس کا نام دہرایا تھا۔ ”ام ایمن“ یہی نام ہے نا تمہارا.....؟؟“ وہ گاڑی چلاتا ہوا کہیں بہت دور سے بول رہا تھا۔ مسلسل روٹی ہوئی ام ایمن نے اثبات میں گردن ہلا دی تھی۔ عبدالہادی نے گاڑی اشارٹ کر دی اور اس کا دل دماغ جسے کسی بہت دور سفر پر نکل گیا تھا۔

☆.....☆.....☆

در شہوار کو نئی زندگی ملی تھی۔ وہ موت کے منہ سے واپس آئی تھی وہ موت کے منہ سے واپس آئی تھی۔ ہر شخص خوش تھا ہر دل شاد تھا۔ اس نے ہو سہل میں آنکھیں کھولیں تو سب ہی اس کے ارد گرد موجود تھے۔ وہ چاروں طرف دیکھنے لگی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔

”بابا اس نے چوہدری حماد کو پکارا تھا جی میری جان! میرے بچے اتنی بڑی اتنی ظالمانہ حرکت کیوں کی اپنے ساتھ وہ اس کا ہاتھ پیار سے تھام کر بولے تھے۔

”بابا عبدالہادی کہاں ہے..... بابا آپ نے عبدالہادی کو یہاں سے جانے کو کہا تھا بابا آپ نے عبدالہادی کو بھیجا ہے نا؟؟“

سے بڑھ کر کیا دے سکتا ہوں میں۔
میرے اور اس لڑکی کے درمیان کسی بھی قسم کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس دن جانے کیوں یہ خودکشی کہ ارادے سے پہاڑی سے چھلانگ لگا رہی تھی میں نے بچا لیا اور میں.....“ وہ ہر لفظ پر زور دے کر بول رہا تھا اور پوری بات بیان کر دی۔ وہاں موجود لوگ جیسے خودکشی کا سن کر تھوڑا سا گھبرا کر خفت کا شکار ہوئے تھے پر فوراً ڈھٹائی اور کمینگی پر اتر آئے اب یہ اسٹوری ہم کس کس کو سنائیں پورا محلہ ہم پر باتیں بناتا ہے۔ اس نے پورے شہر میں منہ دکھائے کے قابل نہیں چھوڑا۔ پہلے ہمارے بیٹے کو کھا گئی اور اب عزت مگر ہم اب اس کا بوجھ مزید برداشت نہیں اٹھا سکتے۔

وہ تیز طراری بڑھیا نہایت بے دردی اور ظالمانہ انداز سے شعلہ بیانی کر رہی تھی۔ ”کیوں..... آپ مجھے اس گھر سے نکالنے پر تلی ہوئی ہیں۔“ وہ سر تھام کر رونے لگی۔ ”کیوں بی بی جبیز میں لائیں بھی کیا جو اس گھر پر ایسے حق جتانی ہو.....؟؟“ تند نے اپنا حصہ ڈالنا ضروری سمجھا۔

عبدالہادی پوری صورتحال اچھی طرح سمجھ چکا تھا وہ سب اب اس لڑکی کا وجود کسی بھی صورت برداشت نہیں کرنا چاہ رہے تھے۔

”آپ سب کیا چاہتے ہیں اب آپ کی عزت کا جنازہ نکل گیا۔ آپ کا سر جھک گیا اب آپ لوگ کیا چاہتے ہیں.....؟؟“ وہ ایک بار پھر تیز آواز میں بولا تھا۔ اگر یہ تمہیں اتنی با کردار لگتی ہے تو تم اس سے نکاح کر لو اور اس کو پہاں سے لے جاؤ۔“ وہ بوڑھا تو جیسے کسی ایسے شخص کے انتظار میں تھا جو ان کے گھر کے بوجھ کو لے جائے۔ ”ٹھیک ہے میں ابھی ابھی نکاح کرنے کو تیار ہوں۔

وہ حواس میں آتے ہی وہی سوال کر رہی تھی جس کا ڈر چوہدری ہی نہیں پورے گھر کو تھا۔ مسز حماد پیار سے اس کا ماتھا چومنے لگیں۔ ”کیا ہو گیا ہے؟“

درشہوار یہ تمہارے بابا ہیں ان سے کیسی باتیں کر رہی ہو؟؟ ان کو اپنی تربیت اور اپنی بیٹی دونوں پر یقین نہیں آ رہا تھا پر اس کا پور پور عشق میں ڈوبا تھا۔

وہ فنا ہو چکی تھی جتنا خون بہا تھا اتنی عبدالبہادی کی محبت اور بھر گئی تھی۔ اس کی رگوں میں بھر گئی تھی۔ بابا مجھے عبدالبہادی چاہیے ورنہ میں واقعی زندہ نہیں رہوں گی۔

بابا مجھے عبدالبہادی کے پاس جانا ہے۔ یہ ظلم مت کریں مجھے عبدالبہادی سے الگ مت کریں۔ وہ زبردستی اٹھ کر بیٹھ گئی اور چوہدری حماد کے ہاتھ پکڑ کر سب کے سامنے منت سماجت کر رہی تھی ضد کر رہی تھی۔

چوہدری حماد کا جھکا سر مزید جھکتا جا رہا تھا اور آنکھوں سے بے تحاشا آنسو بہ رہے تھے۔ وہ کچھ فیصلہ کر چکے تھے پر اس وقت بولنے کی ہمت نہیں تھی ساتھ کھڑے بھائی کو بے بسی اور ندامت سے دیکھا اور تیزی سے وہاں سے چلے گئے۔

”درشہوار بیٹا! عبدالبہادی آجائے گا واپس..... میں بلاؤں گا اُس کو۔“ چوہدری جواد نے حسب عادت بہت ہی نرمی سے کہا اور شفقت سے درشہوار کو بیڈ پر دوبارہ لٹانے لگا۔

”اب سب چلو یہاں سے اس کو آرام کی سخت ضرورت ہے۔ وہ سب کو باہر جانے کا اشارہ کر رہے تھے۔

چاچو میں رُک جاؤں درشہوار کے پاس.....؟ اہل تڑپ کر پوچھ رہی تھی۔

نہیں درشہوار کی اُمی رُک رہی ہیں تم گھر چلو۔“ وہ متانت سے کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئے۔ اہل نے پیار سے بند آنکھیں کیے کیٹی درشہوار کا ماتھا چوما اور خود بھی سب کے ساتھ باہر آ گئی۔ باہر آتے ہی اس نے دل سے اللہ کا شکر ادا کیا۔

املناس، کچنار، مورنیکھ آم، مالٹا، انار، شہتوت، امرود اور بیری کے ساتھ ساتھ اس نے انجیر کا بھی درخت اپنے باغ میں لگا رکھا تھا۔ اس کو گارڈنگ کا کریز تھا ہر رنگ اور ہر قسم کا پھول اس خوبصورتی سے باغ میں مہکتا تھا جیسے ساری پیار صرف چوہدری ہاؤس کا ہی حصہ ہے۔ اور یہ سب کچھ درشہوار کی محنت و لگن کا نتیجہ تھا۔ ورنہ تو اُم ایمن کے جانے کے بعد یہ باغ کب کا اجڑ چکا ہوتا۔

وہ ٹوکری میں موٹے موٹے بیر ٹوکری اور شہتوت توڑ کر ڈالے املناس کے درخت پر چڑھ کر بیٹھ گئی۔ ہلکی ہلکی دھوپ اس کو بہت مزہ دے رہی تھی ساتھ ساتھ بیٹھے پھل وہ گھنٹوں یہاں گزارا کرتی تھی۔ جب تک اہل لڑ جھگڑ کر تھک کر اس کو یہاں سے نہ لاجائے۔

آج اہل اپنے فزکس کے ٹیسٹ کی تیاری میں مصروف تھی چنانچہ وہ گھنٹوں کا پلان کر کے آئی تھی۔ اچانک ایک نو وارد نے اس کے باغ کی حد پار کی تھی۔ وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کو گھورنے لگی وہ مسلسل آگے بڑھ رہا تھا اس کا رخ املناس کے گھنے درخت کی ہی طرف تھا۔ معا بہت سارے موٹے موٹے بیروں سے اس پر حملہ کر دیا گیا۔ وہ بے ساختہ چلایا تھا اور اپنے دونوں بازو اپنے منہ پر رکھ کر اپنا دفاع کر رہا تھا۔

”کون ہو..... تم..... اور یہاں کیسے آئے

ہو.....؟؟؟“ وہ پھرتی سے درخت سے اتری تھی اور دھم سے اس کے سامنے آکھڑی ہوئی۔

بیروں کے نشانے سے چکراتے سرکواب اس نے سنبھالا اور سامنے کھڑی انسپکٹر بنی لڑکی کو دیکھنے لگا۔

”اب یہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کیا دیکھ رہے ہو.....؟ بتاؤ کون ہو.....؟؟؟“

وہ رعب سے اور بھی چلا کر بولی تھی۔ ”میرا نام عبدالہادی ہے۔“ عبدالہادی زیر لب مسکرا کر مہابت مودبانہ انداز سے بولا تھا۔

”کون عبدالہادی“ وہ سوچتے ہوئے بولی ”میرا کوئی رشتے دار اس نام کا نہیں ہے.....“ وہ ایک بار پھر پچھلے انداز میں آگئی۔ ”تم جو کوئی بھی ہو تم نے بلا اجازت چوہدری ہاؤس کے اندر آنے کی گستاخی کی ہے تمہیں اس کی سزا ضرور ملے گی۔“ وہ کسی ظالم شہزادی کی طرح دو ٹوک انداز میں کہہ کر گویا عبدالہادی کو ڈر رہی تھی۔ جو حکم ملکہ عالیہ خادم کو ہر سزا منظور ہے۔“ عبدالہادی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر سرخم کیا تھا۔

”کیا تم مذاق اڑا رہے ہو؟“ وہ خود ہی اس انداز کو تمسخر سمجھ کر دونوں ہاتھ کمر پر باندھ کر چلائی تو بے ساختہ عبدالہادی کی ہنسی نکل گئی۔ وہ بہت دنوں بعد اتنا ہنس رہا تھا۔ ”تمہیں سزا بادیس گے اور ضرور دیں گے۔“ وہ بہت طیش میں آگئی تھی۔ ”بابا..... بابا وہ اندر کی طرف بڑھ رہی تھی۔

”بابا باہر آئیں وہ بہت چلا رہی تھی۔ کان کے پردے پھاڑ دیتی تھی۔ عبدالہادی ہنستا رہا۔“ کیا ہوا ہے در شہوار.....“ کچھ ہی دیر بعد چوہدری حماد اس کی طرف تیزی سے بڑھ رہے تھے۔ ”کیا ہوا ہے میرے بچے.....؟؟؟“ چوہدری حماد قریب آچکے تھے۔

”بابا! یہ بتا نہیں کون ہے اور ادھر ہمارے گھر میں بلا اجازت گھس آیا ہے۔“ وہ عبدالہادی کی طرف شکایتی انداز سے اشارہ کر رہی تھی۔

”السلام وعلیکم انکل.....“ عبدالہادی نے مسکراتے ہوئے سلام جھاڑا تھا۔ وعلیکم السلام! ہادی بیٹا تم نے در شہوار کو بتایا کیوں نہیں کہ تم تو پچھلے تین دن سے اس گھر میں رہ رہے ہو.....؟؟؟“ چوہدری حماد مسکرا کر خوشگوار انداز انداز سے پوچھ رہے تھے اور در شہوار تو جیسے حیرت و شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی۔

”کیا مطلب بابا۔“ وہ سر جھٹک کر جھنجھلائی تھی ”وہ جو سامنے گیٹ ہاؤس ہے میں ادھر ہی رہتا ہوں آئی تھنک یہ چوہدری ہاؤس کا ہی حصہ ہے..... ہا ہا..... ہا۔“ دائیں طرف بنے خوبصورت سے گیٹ ہاؤس کی طرف اشارہ کر کے عبدالہادی نے قہقہہ لگایا تھا اور چوہدری حماد بھی زور سے ہنس پڑے۔

خفت سے سرخ چہرہ لیے در شہوار اندر چلی گئی تھی۔

چمکیلی دھوپ کی روشن صبح وہ نرم نرم کرنوں کو اپنے وجود کے اندر اتارتی ٹیرس پر کھڑی نیلی ٹائلز والا حوض دیکھ رہی تھی جس پر سفید زرد اور سرخ پھول اس طرح پانی میں تیر رہے تھے جیسے مور کے پر ہوں یا کسی بہت ہی خوبصورت پرندے کے پر ٹوٹ ٹوٹ کر پانی پر بکھر گئے ہوں وہ ٹیرس سے اسی طرح نیچے حوض کو دیکھتی تھی ہمیشہ۔“

”ہائے۔“ حوض کے کنارے بیٹھے عبدالہادی نے خوشدلی سے اس کو ہاتھ ہلا کر اشارہ کیا تھا۔ ”ارخ..... در شہوار کا سارا مزہ کر کرہ ہو گیا۔“ ”کیا ہے.....؟؟؟“ وہ بد لحاظی سے بولی۔ ”بور ہو رہا ہوں۔“ عبدالہادی نے صاف

گوئی سے کہا۔ ”تو اس ٹھنڈے پانی میں نہا لو۔
درشہوار کو اس کی بات سخت ناگوار گزری
تھی۔ ”بابا..... یہ کوئی حل تو نہیں ہے۔ اور سردی
بھی بہت ہے۔ وہ ہنسا اور پھر متانت سے بولا۔

”تو میں کیا کروں.....؟“ وہ جل کر بولی۔
”اتنا جلو تو مت۔ پہلے ہی دھان پان سی
ہو۔“ عبدالہادی اس کے نازک سراپے کو غور سے
دیکھنے لگا اور اس کی نگاہیں خود پر مرکوز دیکھ کر وہ
تیزی سے ٹیرس سے پیچھے ہٹ گئی۔

یہ عبداللہ بٹ کے بیٹے ہیں درشہوار آپ ان
سے اتنا جھگڑا کیوں کرتی ہو۔“

ہفتے ہی رات وہ تو ان سب کے ساتھ ڈنر ٹیبل
پر ہی موجود تھا۔ جہاں چوہدری حماد نے آ کر اس کا
ناگوار اور سخت رویہ دیکھ کر اس کو ٹوک ہی ڈالا تھا پتا
نہیں کیوں پہلے دن ہی درشہوار کو عبدالہادی سے
چڑ ہو گئی تھی۔ شاید وہ سمجھ رہی تھی عبدالہادی نے
اس کا مذاق اڑایا ہے۔

عبدالہادی بٹ اس کے بابا کے دوستوں میں
ایک بہترین دوست تھے۔ جو اس کو بھی بہت پسند
تھے ایک بہت امیر گھرانے کے بہت نرم دل اور
ہمدرد قسم کے انسان ان کا چند سال پہلے انتقال
ہو گیا تھا جبکہ ان کی بیوی اور اکلوتا بیٹا امریکہ میں
مقیم تھے پر وہ اس بات سے قطعی لاعلم تھی کہ
عبدالہادی عبداللہ بٹ کا بیٹا ہے۔

”جی۔“ عبدالہادی نے بتایا تھا۔
سوری.....!!“ وہ شرمندہ ہوئی تھی آئندہ درشہوار
بدتمیزی نہیں کرے گی۔“ ساتھ بیٹھی امل نے کیسے
صفائی دی تھی۔

”بھینکس.....“ وہ کھل کر مسکرا دیا۔
”آئس کریم کھانی ہے؟“ ڈنر کے بعد وہ
لان میں چہل قدمی کر رہی تھی۔ امل بھی ساتھ ہی

تھی عبدالہادی ان کی طرف بڑھ آیا۔ ”جی جی
ضرور.....“ امل فوراً بولی۔ بابا سے اجازت لیں ہم
گھر نہیں باہر جا کر کھائیں گے۔“

درشہوار نے جیسے حکم دیا تھا وہ مسکرا دیا اور پھر
تھوڑی ہی دیر بعد چوہدری حماد کی اجازت سے وہ
ان دونوں کو ایک آئس کریم پارلر لے آیا۔ میں
آشا بری فلیور لوں گی۔ امل بے صبری ہو رہی تھی۔
”میں ڈبل چاکلیٹ۔“ وہ نارٹی کہہ کر ادھر ادھر
دیکھنے لگی۔ ”اتنی چاکلیٹ کیوں.....؟“ وہ دانستہ
بولا۔ ”کیوں.....؟“

وہ حیرت سے بولی۔ ”کہیں آپ یہ تو نہیں سمجھ
رہے کہ میں کالی ہوں اس لیے کالی چیزیں پسند ہیں
مجھے.....؟؟“ وہ ہمیشہ کی طرح خود ہی اندازے لگا
کر غلط بات کر رہی تھی۔ ”کیا..... میں ایسا کیوں
سوچوں گا اور آپ کب کالی ہیں.....؟“ مجھے نے
حیرت کے سمندر میں ڈبکی لگائی۔

کتنا خوبصورت سانولا رنگ تھا اس کا۔ ”ہادی
بھائی ڈونٹ وری اس کا تو دماغ ہی خراب ہے۔“
امل نے آئس کریم کپ اپنے سامنے رکھتے ہوئے
ہادی کو کہا تو وہ سکھ کا سانس لے کر آئس کریم
کھانے لگا۔

وہ ایسی تھی جلدی سے کسی سے فری نہ ہونے
والی اور اگلے تین چار دن اسی طرح گزر گئے پر اس
دن جب وہ کچن میں اپنے لیے کافی بنا رہی تھی تب
ہادی کچن میں آ گیا۔ ”درشہوار آپ چائے بنا رہی
ہیں.....؟؟“

”جی۔“ مجھے بھی بنا دیں گی میرا سر بہت درد کر
رہا ہے۔“

وہ درد سے چور تھا اور کہہ کر ڈانگ ٹیبل کی
چیئر پر ہی بیٹھ گیا تھا۔ درشہوار نے چونک کر اس کی
طرف دیکھا سفید رنگت ہلکی سرخ ہو رہی تھی۔ گہری

سبز بھوری کالج سی آنکھیں درد سے بوجھل اور تھکی ہوئی دکھ رہی تھیں۔

”کیا ہوا آپ کو.....؟“ چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ کر وہ کرسی پر بیٹھتے ہوئے پوچھنے لگی انداز بہت نرم تھا۔ ”مجھے.....؟“ مجھے کی آواز میں نمی تھی پتا نہیں کتنے دنوں بعد کسی نے یہ سوال پوچھا تھا کہ ”کیا ہوا آپ کو؟“ اس لمحے وہ اتنا اکیلا محسوس کر رہا تھا کہ شاید اس سے کوئی بے جان چیز بھی اس کے دل کا حال بائنتی تو وہ اس کو بھی اپنا ہمزاد اپنا دوست اپنا غمگسار بنا لیتا۔

”جی آپ کو کیا ہوا ہے.....؟؟“ یہ حالت پہلی بار دیکھ رہی تھی در شہوار۔ ”مجھے اپنے بابا اور اپنی امی دونوں یاد آ رہے ہیں۔ وہ پر حزن لہجے میں کہہ کر اپنے ماتھے پر دائیں ہاتھ سے ہلکے ہلکے پیچ مارنے لگا آنکھیں سختی سے پتھینچ لیں تھیں۔ پر در شہوار دیکھ سکتی تھی کہ وہ رو رہا ہے

وہ اتنا مضبوط اتنا کڑیل جوان کیسے بے بس دکھ رہا تھا۔ ”زندگی تو اللہ پاک کی امانت ہے۔“ در شہوار نے بے ساختہ اس کا ماتھے کی طرف جاتا دایاں ہاتھ پکڑ کر روکا تھا۔ ”جانتا ہوں۔ وہ کرب سے بولا۔“ تو اتنا اس کیوں ہیں.....؟“ انسان ہوں نا اکیلے پن سے اکتا جانا..... خوف آنا..... بیزار ہو جانا فطرت ہے اور پھر ماں باپ۔ ماں باپ جیسے رستے کھو کر بیٹھا ہوں۔

پھر جھٹکے سے اٹھ کر چلا گیا در شہوار وہاں ساکت بیٹھی رہ گئی۔

☆.....☆.....☆

وہ صبح و شام گیٹ ہاؤس کے چکر لگا رہی تھی عبدالہادی کے لیے چائے خود بناتی اور کھانے کا جا کر پوچھتی کپڑے پر لیس کروانے کا پوچھتی جیسے اس نے ہادی کا ہر کام کرنے کا ذمہ خود لے لیا ہو۔

اس وقت بھی وہ اس کا کمرہ صاف کر ہی تھی جب وہ باہر سے آ گیا۔ در شہوار مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔“ وہ اپنے شوز اتارتا ہوا بولا۔ جی کریں وہ ڈانگ ٹیبل کی چیزیں سمیٹ رہی تھی۔ ”گیٹ ہاؤس میں تو ماسی بھی صبح و شام آتی ہے پھر آپ اتنا کیوں آتی ہیں۔ وہ جرابیں اتارتا ہوا پوچھ رہا تھا۔

در شہوار کے ہاتھ وہیں رک گئے۔ ”آپ کو مجھ سے ہمدردی ہے بہت زیادہ ہمدردی اور میں بہت شرمندہ ہوں اس (رات دن) میں اتنا کمزور پڑ گیا تھا آپ کے سامنے کیا کچھ بودیا۔ مگر پلیز مجھے ہمدردی سے سخت چڑ ہے۔“ وہ نان اسٹاپ بولتا بولتا اس کے قریب آ رہا تھا اور در شہوار کا دل وہیں رک گیا۔

وہ اتنا فہیم اتنا زریک تھا یہ تو وہ سوچ ہی نہ پائی تھی وہ شرمندہ ہو گئی۔ ہمدردی ہی تو ہو گئی تھی اس کو عبدالہادی سے۔ ”مگر مجھے دوستی سے بالکل چڑ نہیں ہے۔ اور وہ بھی تم جیسی کیوٹ لڑکی کی دوستی سے۔“

عبدالہادی یکدم نہایت شوخی سے بولا تو در شہوار کا سرخ چہرہ یکدم پیاری سی مسکراہٹ سے کھل اٹھا۔ تو جناب یہ ہمدردیاں چھوڑو۔ آج سے ہم دوست ہیں۔“

وہ برملا اس کا ہاتھ تھام کر کہہ رہا تھا۔

”جی۔“ در شہوار نے اثبات میں گردن ہلائی پر وہاں نہیں رُکی اور فوراً اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔

کب آؤ گی پھر۔“ وہ پکار رہا تھا۔ ”آپ آنا ڈنر۔“ وہ رُکی نہیں تھی۔

پچھتیس مجھے بالکل بھی پسند نہیں تھا بس بابا کی پسند تھی تو رکھ لیا۔ وہ جلے کتے انداز میں اس کے

سامنے اپنے بیگ سے بکس نکالتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

سز چوہدری حماد نے اہل اور در شہوار دونوں کو ایک ایک گھنٹہ عبدالہادی سے ٹیوشن لینے کا کہا تھا، آخر وہ آکیفورڈ سے ایم بی اے کر کے آیا تھا۔ ”اب تم باتیں کم کرنا مجھے ٹیسٹ کی تیاری کرنے دو۔“ اہل نے ڈسٹرب ہوتے ہوئے تنگ آ کر کہا عبدالہادی مسکرا کر دونوں کو دیکھ رہا تھا۔ میں جب آپ کو میٹھس کے فارمولے سمجھاؤں گا تو آپ کو بہت ایزی لگے گا۔ جب دوستی ہوگئی ہے تو یہ آپ کا تکلف کیوں.....؟“ در شہوار نے عبدالہادی کی طرف جھک کر سرگوشی میں کہا تو وہ گردن جھٹک کر ہنس دیا۔ ”یہ تو ہے..... چلو پھر جلدی سے رجسٹر دو تم مجھے۔“ وہ جتا کر بولا تھا۔

وہ ایک گھنٹہ کیسے گزرتا پتا ہی نہ چلتا واقعی در شہوار کے لیے BSC کا میٹھس بہت آسان ہوتا جا رہا تھا۔ اس دن اہل اپنی دوست کے ہاں گئی ہوئی تھی وہ اکیلی ہی ٹیوشن لینے آئی تھی پر پڑھنے کو بالکل بھی دل نہیں چاہ رہا تھا۔ آپ کو تقریباً یہاں کتنے دن ہو گئے ہیں۔ وہ کافی پھینٹتے ہوئے عبدالہادی سے بولی۔ ”مجھے انیس دن..... اور یہ آپ کس کو کہا.....؟“ وہ کافی بنانے لگا۔ ”او..... ہاں آپ تو کہنا ہی نہیں.....“ وہ ہنسی۔

اچھا اب تمہارا کام ہو گیا جو کرنے آئے ہو.....؟“ ہاں تقریباً حماد انکل نے بہت ساتھ دیا ہے۔“ کام کیا تھا.....؟“ دراصل میرے ابو کے لاپچی اور جھوٹے بھائی مجھے اور میری امی کو ہمارا حصہ دینے سے مکر گئے تھے اور جعلی کاغذات بھی تیار کروا لیے تھے۔“ اوہ..... وہ حیرت و تشویش کا شکار ہوئی۔ ”بات دولت، جائیداد حصے کی نہیں ہے، پر یہ میرے باپ کی محبت کی کمائی ہے ان کا

حق ہے..... جو کہ اتنے ظالم جھوٹے اور مکار قسم کے لوگوں کے حوالے نہیں کر سکتا۔ جو کہ زمین کے ٹکڑوں کی بدلت اپنے ہی خون کے دشمن ہو گئے ہیں اگر حماد انکل مجھے سپارا اور تحفظ نہ دیتے تو میں پاکستان آتے ہی کب کا قتل ہو چکا ہوتا۔“ وہ نہایت غمزہ دکھ رہا تھا۔

”آپ کی امی کا انتقال کب ہوا۔“ وہ بچھ کر پوچھنے لگی۔ ”دو سال پہلے ہارٹ اٹیک ہوا تھا ان کو۔“ وہ کافی کاگ اس کو پکڑاتے ہوئے بولا۔ میری امی بہت بہادر تھیں۔ بہت خوبصورت بہت ذہین۔“ وہ بہت خوش ہو کر بتا رہا تھا۔ ”مجھے لگتا ہے آپ اپنی امی پر گئے ہیں۔“ وہ ان ڈائریکٹ تعریف کر رہی تھی۔ ”ہا ہا ہا وہ بے ساختہ ہنسا“ کلیور۔“ وہ تو میں ہوں۔ وہ صوفے پر پھیل کر بیٹھ گئی۔

او میڈم پڑھنا نہیں ہے کیا اٹھو اور کتابیں کھولو۔“ وہ استاد بنا آج میرا موڈ نہیں ہے پلیز!“ وہ منت بھرے انداز سے بولی۔ تو کیا کرنا ہے آج؟“ وہ حیران ہوا آج ہم باتیں کریں گے۔ بہت ساری باتیں۔“ وہ فیصلہ بھی کر کے آچکی تھی کہ آج کیا کرنا ہے۔

”بور ہو جاؤں گی تم میری باتوں سے۔“ وہ وارننگ دینے لگا۔ قطعاً نہیں، وہ بھی پکی تھی اچھا تمہیں پتا ہے پہلے مجھے کون پڑھاتا تھا۔“ وہ اشارت ہو چکی تھی۔ ام ایمن آپنی!“ وہ کون تھیں؟“ وہ میری آئیڈیل تھیں ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔“ وہ جذباتی ہو کر بولی۔

لیکن ام ایمن ہیں کون اور کہاں ہیں؟“ عبدالہادی زچ ہوا۔

آپ کی عمر کتنی ہے؟؟ وہ کب جواب دینے والی تھی ”26“ سال۔ کیا؟ واقعی ام ایمن آپنی کی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

بھی 26 سا ہی ہے۔ وہ مجھ سے سات سال بڑی ہیں۔

درشہوار کا من پسند ٹاپک شروع ہو چکا تھا اور اب وہ یہاں سے کہاں اٹھنے والی تھی۔ مجھے چائے بنانا، پڑھنا، بال بنانا، کپڑے پہننا کا سلیقہ اچھے برے میں تمیز بڑوں کی عزت سب ام ایمن آپنی نے سکھایا ہے۔

اس گھر میں سب پیار کرتے ہیں پر جب سیکھنے سکھانے کی بات آتی ہے تو مجھے ام ایمن آپنی یاد آتی ہیں۔

”اس کی پلکوں کے کونے بھیگنے لگے۔

مجھے کچھ بتاؤ تو کہی وہ کہاں ہیں؟ عبدالہادی خفگی سے پوچھ رہا تھا۔ ”ہادی وہ چلی گئیں مجھے چھوڑ کر سب کو چھوڑ کر بس انہوں نے یہی غلطی کی ہے۔

درشہوار کا چہرہ سرخ ہونے لگا عجب رنگ آئے تھے لہجہ بھیگ رہا تھا ”پر کہاں.....؟“ یہ گتھی عبدالہادی سے سلجھ نہیں رہی تھی۔ ”گل میرے ساتھ ہم سے بہت دور۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھر کر بولی تھی۔

”ان کو محبت ہوگئی تھی اور چوہدری باؤس میں محبت کرنا بہت بڑا جرم ہے۔ یہاں پسند کی شادی کرنا ایسی غلطی ہے جس کا نتیجہ سفاکانہ سزا ہے یا موت یا در بدری۔

”آپنی کو محبت نہیں کرنی چاہیے تھی۔“ وہ دکھی لہجے میں اپنی رائے دے رہی تھی۔

محبت میں اگر سوچنے سمجھنے کا عنصر شامل ہو جائے تو پھر وہ شاید محبت محبت ہی نہ رہے۔“ عبدالہادی نے متانت سے بے ساختہ کہا۔ ”محبت ایک ایسا جذبہ ہے شہوار جو گیدڑ کو بھی شیر بنا دیتا ہے۔ بھر بھری دیوار کو چٹان میں بدل دیتا ہے۔

ہم سوچ ہی کب پاتے ہیں.....؟ ہم کچھ سمجھ ہی کب پاتے ہیں بس ہم اس امر میں لپٹے چلے جاتے ہیں۔ آنکھوں کا سمندر بہا کر کسی تنگے کی طرح بہت بہت آگے لے جاتا ہے۔

وہ درشہوار کے معصوم چہرے کو اپنی پُر شوق نگاہوں کے حصار میں لیے محبت کی واضح تشریح کر رہا تھا۔

درشہوار کسی چھوٹے بچے کی طرح اس کا لفظ لفظ بہت غور سے سن رہی تھی۔ پر وہ اتنا کچھ محبت کے بارے میں کیسے جانتا تھا۔ اس کا دل اس سے سوال کر رہا تھا کیا وہ اس جزبے سے آشنا ہو چکا ہے۔ دل کا سکون آنکھوں کی ٹھنڈک اور روح کی تازگی محسوس ہو رہی تھی عبدالہادی بری طرح چونکا۔

”در شہوار۔“ وہ نظریں چرا چرا کر بولا۔ ”جی..... اور بتائیں نا محبت کیا ہوتی ہے۔“ وہ اس کے رک جانے پر خفا ہوئی تھی۔ ”تم جاو مجھے کچھ کام یاد آ گئے ہیں پلیز۔“

”وہ یکدم لہجہ بدل کر بولا۔ تو کر لیں!!“ وہ جانے پر آمادہ نہیں ہوئی۔ ”نہیں پلیز تم جاو..... پلیز تم جاو!!“ وہ اپنے جذبوں کو سمیٹ رہا تھا جو کسی نغمے کے سروں کی طرح بکھرتے جا رہے تھے کسی خوشبو کی طرح پھیلتے جا رہے تھے۔

وہ آنکھیں موند کر صوفے سے ٹیل لگا کر بیٹھ گیا۔“ اوکے جا رہی ہوں میں۔“ وہ خفا ہو کر جا رہی تھی عبدالہادی نے اس کو نہیں روکا ایک آواز بھی نہ دی۔

☆.....☆.....☆

ہادی بھائی! ہادی بھائی امل اس کو زور سے پکارتی ہوئی ٹیرس پر آئی تھی وہ علی کے ساتھ کھرا باتیں کر رہا تھا موسم نہایت خوشگوار تھا کالے سیاہ

سے کوئی بات کر رہی تھی پر وہ صرف تک رہا تھا ساکت بے خود وہ ہنس رہی تھی۔ امل کے پیچھے بھاگ رہی تھی اس کو پکڑ رہی تھی۔

محبت اس کے لفظ اسی کو یاد آ رہے تھے۔ ”محبت کب کہاں کس سے ہو جائے کس کو خبر۔“ وقت کی کوئی قید نہیں کبھی اک لمحہ کبھی ایک صدی۔

امل شاید اندر آ گئی تھی وہ اکیلی تھی۔ بارش رک چکی تھی وہ شتوت کا درخت ہلا کر پانی جھاڑ رہی تھی۔ ہنس رہی تھی مزہ لے رہی تھی اور پھر جیسے یکدم چونکی ایک حیرت بھری نگاہ اوپر ٹیرس پردالی تھی عبدالہادی نے نگاہیں نہیں ہٹائیں۔ وہ ہٹا ہی نہیں پایا۔ درشہوار نے تیزی سے دوپٹہ پھیلا کر

اوڑھا اور خود کو ڈھانپ لیا تھا۔ پر دوسرے ہی پل نگاہیں اٹھا کر اوپر دیکھا تھا وہ جما کھڑا تھا مکمل طور پر بھیکا ہوا بارش کے پانی اور شہوار کی محبت میں۔

ایک پل۔ ”ایک پل میں دل بدل جاتے ہیں۔ ایک پل میں اپنا آپ پرایا ہو جاتا ہے کبھی کبھی ایک پل میں آگاہی ہوتی ہے کسی بہت ہی پیارے جذبے سے۔“ کیا وہ یہی پل ہے۔

درشہوار معصومیت سے دیکھے جا رہی تھی عبدالہادی رکا نہیں تیزی سے ٹیرس خالی کر گیا۔ درشہوار کا دل دھڑک رہا تھا بہت زور زور سے۔

☆.....☆.....☆

”پلیز پلیز ہادی! یہ ٹیڈی بیئر اپنے روم میں رکھ لیں۔ وہ صبح صبح اس کے کمرے میں موجود تھی۔“ کیوں کیا ہوا ہے؟“ وہ آنکھیں مسلتا ہوا حیرت سے بولا۔

”امی میرے تمام Toys کے پیچھے پڑ گئی ہیں اٹھا کر شنو (نوکرانی) کی بیٹی کو دے رہی ہیں کہ اب میں بڑی ہو گئی ہوں پر یہ ٹیڈی بیئر مجھے ام

بادل چھائے ہوئے تھے۔“ شکر ہے علی بھی ادھر ہی ہے یہ لیس میں نا موسم کی مناسبت سے پکوڑے بنائے ہیں خود.....“ اس نے پکوڑوں سے بھری ٹرے ان کے سامنے رکھی ٹیبل پر رکھ دی۔ ساتھ میں امل کی چٹنی بھی ہے۔“ وہ داد لینے کو تیار کھڑی تھی۔

”گڈ گرل! شاباش“ علی نے پیار سے بہن کو کہا ”تمہیں کیسے پتا چلا کہ اس وقت میرا دل پکوڑے کھانے کو کر رہا ہے۔“ عبدالہادی نے پکوڑا اٹھاتے ہوئے کہا۔ ”دیکھ لیں۔“ وہ اتر کر بولی۔ ”امل آ جاؤ اب واپس نیچے سے درشہوار کی آواز آ رہی تھی۔ آتی ہوں۔“

”ہاں ہاں جاؤ اور اس کو بھی تھوڑی سی کوکنگ سکھا دو۔“ علی نے ہنس کر طنز یہ انداز سے چلا کر شہوار کو سنانے کے لیے کہا۔

اس دن کے بعد سے عبدالہادی قصداً شہوار سے فاصلہ رکھ رہا تھا نہ زیادہ بولتا نہ قریب جاتا پر اس رویے پر وہ خفا ہو چکی ہے پر وہ منا نہیں رہا تھا اس کو۔

علی کو اس کی امی نے نیچے بلایا تو وہ بھی چلا گیا اور پانچ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ تیز بارش اشارت ہو گئی۔

بہار کے موسم میں بارش کتنا خوشگوار تھا وہ دن وہ ٹیرس سے نیچے برے لان میں بارش میں دھلتے سبز پودوں اور رنگ برنگے پھولوں کو دیکھنے لگا اور یہ کون سا نایاب پھول تھا.....؟ یہ کون سا خوبصورت رنگ تھا۔ یہ وجود یا کوئی پاکیزہ موتی۔“ وہ مبہوت ہو کر رہ گیا۔

بلکے نیلے رنگ کے ٹخنوں تک کے ریشمی فرائک میں درشہوار بارش میں بھیگ رہی تھی۔ گھنے بال بکھر کر شانوں پر پھیلے ہوئے تھے۔ وہ مسکرا کر امل

آج پتا ہے ناشتے میں نہاری اور پائے ہیں۔“
جلدی سے تیار ہو کر ادھر ہی آ جاؤ اکٹھے ناشتا
کرتے ہیں۔“

وہ ناشتے کا سوچ کر فوراً اٹھی اور تیزی سے کہہ
کر بھاگ گئی۔

عبدالہادی میں واش روم میں گھس گیا اتوار کا
دن تھا اس کا جو مقدمہ چل رہا تھا کل اس کی بہت
اہم پیشی تھی اسی حوالے سے آج اس کو بہت کام
کرنا تھا۔

”احمد بھائی نہیں آئے آج!“ وہ دونوں کالج
سے باہر آئیں تو گاڑی لیے عبدالہادی کھڑا تھا۔“
ہاں احمد کو کچھ کام تھا میں اسی طرف آ رہا تھا تو سوچا
دو چڑیلوں کو گھر پہنچا دوں گا۔“

وہ دونوں گاڑی میں بیٹھ گئیں۔ درشہوار نے
سیٹ سے ٹیک لگائی تھی۔ گاڑی میں عبدالہادی کی
مخصوص پرفیوم کی مہک پھیلی ہوئی تھی۔ وہ اہل سے
باتیں کر رہا تھا۔ درشہوار اس کی آواز کو جیسے اپنے
اندرا تار رہی تھی۔ عبدالہادی نے نا چاہتے ہوئے
بھی بیک مرر سے اس کو دیکھا تھا۔

وہ آنکھیں بند کیے بیٹھی تھی وائٹ یونیفارم
میں کتنی کیوٹ لگ رہی تھی۔ ”کاش“ وہ ابھی ابھی
اس کی ہو جائے اس کی ملکیت اس کی شریک سفر
اس کا سب کچھ اس کا حق بن جائے وہ دل سے دعا
مانگ رہا تھا۔

درشہوار نے دھیرے سے آنکھیں کھولیں اور
بیک مرر میں دیکھا جیسے وہ اس کے دل کی آواز سن
گئی ہو۔ گہری سبز و بھوری آنکھیں چمکیلے کانچ وہ
صرف آنکھیں تو نہیں تھیں وہ تو ایک جہان تھیں
ایک دنیا ایک کائنات درشہوار کی کائنات۔

درشہوار نے دوبارہ آنکھیں موند لیں تھیں۔
آج وہ گھر آ کر بھی چہکتی پھر رہی تھی۔ معمول

ایمن آپی نے دیا تھا۔ پلیز اپ کچھ دیر یہاں رکھ لو
پھر میں لے جاؤنگی۔“ وہ روہانسی ہو کر کہہ رہی
تھی۔ ”اچھا پریشان کیوں ہوئی ہو لاؤ ادھر دو۔“
وہ پیار سے بیڈ سے کہتا ہوا اٹھا اور ٹیڈی لے کر بیڈ
پر رکھ دیا۔“

بیٹھ جاؤ۔“ وہی دھیما نہ انداز شہوار صوفے پر
بیٹھ گئی۔ امی کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے میرے پیچھے پڑ
گئی ہیں مجھے کہتی ہیں کہ میں اب بڑی ہو گئی ہوں
اپنی عادتیں بدل لوں۔ کچن کا کام سیکھوں۔ دوپٹہ
ٹھیک سے لیا کروں اور تو اور..... آپ کے پاس
بھی کم کم آیا کروں۔“ وہ معصومیت سے ہر بات بتا
رہی تھی۔

وہ مسکراتا مسکراتا چونک گیا کہیں اس کی
آنکھوں کی چمک اس کے چہرے سے عیاں ہر
جذبہ اس گھر کے مکینوں نے تو نہیں پڑھ لیا تھا۔

اپنے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگا کیا
ہوا.....؟“ شہوار نے اس کا چہرہ دیکھتے ہوئے فکر
مندی سے پوچھا۔ ”کچھ بھی نہیں..... شہوار دیکھو تم
واقعی بڑی ہو گئی ہو آنٹی ٹھیک روک ٹوک کر رہی
ہیں۔ تمہیں کچن کا کام بھی آنا چاہیے زندگی
گزارنے کا ڈھنگ اور جوان و خوبصورت لڑکوں
سے گریز بھی۔

آخری جملے پر وہ بہت بہت شوخ ہو گیا
تھا۔ ”باہا جوان اور خوبصورت۔“ وہ طنزیہ ہنسی
تھی۔ ”آپ سے زیادہ خوبصورت ہوں میں۔ وہ
اپنے بالوں کو جھٹکا دے کر اتر اہٹ سے بول رہی
تھی۔ ”جی جی بالکل۔“ عبدالہادی نے تسلیم
کرتے ہوئے کہا۔ ”مذاق اڑا رہے ہیں نا۔“ وہ
خفا ہونے لگی عبدالہادی بے ساختہ ہنستا چلا گیا۔

”عجیب ہو تم تعریف نہ کرو تب ناراض اور کر
دو جب بھی ناراض۔“ وہ زور دے کر بولا۔ ”اچھا

مضطرب ہو کر کمرے میں ٹہلنے لگا ایک ایک پل گزارنا مشکل ہو رہا تھا۔

کیا شہوار مجھ سے واقعی ناراض ہو گئی؟“ وہ بے چینی سے گیٹ ہاؤس سے باہر نکل آیا برآمدہ پارکر کے وہ بڑے سے لان کے اندر چلا آیا تھا۔ جس کو شہوار اپنا باغ کہتی تھی۔ وہ وہاں لگے ایک ایک پودے کو محبت سے دیکھ رہا تھا۔ کیونکہ شہوار ان سے محبت کرتی تھی۔ شہوار کو سبزہ پسند تھا نیلا پانی پسند تھا وہ شدت سے اس کی کمی محسوس کر رہا تھا معا ٹھنک کر رک گیا۔

اتنی رات کو اتنی ٹھنڈ میں وہ آم کے پیڑ کے نیچے وہ گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی تھی در شہوار کیا ہوا؟“ وہ تڑپ کر اس کے قریب جا پہنچا۔ ”در شہوار یہاں اس ٹھنڈ اور تاریکی میں کیوں بیٹھی ہو وہ حیران سا اس بے وقوف لڑکی کو دیکھ رہا تھا جو بنا آواز رو رہی تھی۔

چہرہ سرخ آنکھیں سرخ عبدالہادی کا دل مٹھی میں بند ہونے لگا۔ ”کیوں رو رہی ہو.....؟“ وہ تڑپ رہا تھا۔ ”آپ اگلے ہفتے کیا یہاں نہیں ہوں گے.....؟“ وہ معصومیت سے پوچھ رہی تھی۔

اس کے لہجے میں اتنی تڑپ تھی کہ عبدالہادی بوکھلا کر رہ گیا۔ ”میں..... کیوں پتا نہیں۔“ وہ کچھ دور ہٹ گیا۔ عبدالہادی مجھے ام ایمن آپی یاد آ رہی ہیں۔“ وہ رو رہی تھی کیوں وہ کیوں.....؟“ وہ حیران ہوا۔ وہ میری ہر مشکل کا حل نکال دیتی تھیں۔

شہوار اب درخت سے ٹیک لگا کر کھڑی ہو گئی۔ ”میں آج تک سمجھتی تھی انہوں نے محبت کر کے بہت بڑی غلطی کی ان کو محبت نہیں کرنی چاہیے تھی پر آج مجھے اندازہ ہو گیا ہے کہ محبت کیا ہوتی ہے اور اس میں ہماری مرضی کتنی شامل ہوتی ہے۔

سے زیادہ خوش تھی۔ آنٹی مجھے بہت ساری ڈشز بنانے آتی ہیں وہ اپنی تعریفیں سننا چاہ رہا تھا۔

”آج عبدالہادی نے سب لوگوں کے لیے ڈنر میں پاستا ریڈی کیا تھا اور وہ اس وقت اپنا فیورٹ ڈرامہ دیکھ رہی تھی۔

ہاں تو ماشاء اللہ بیٹا تم نے سیکھا تب ہی آیا نا۔“ اگر کوئی سیکھنا نہ چاہے تو کیسے آسکتا ہے۔ اہل کو دیکھ لو سب کچھ سیکھتی جا رہی ہے۔“ ان کا اشارہ اب در شہوار کی طرف تھا۔ امی بس آپ کو موقع مل گیا۔ ”شہوار جل کر بولی۔“

ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں شہوار۔“ عبدالہادی نے قہقہہ لگایا آپ تو ہنس لیں بس۔“ وہ منہ بسور کر بیٹھ گئی۔

”ہادی بیٹا بس مجھے لگتا ہے ایک ہفتہ ہی رہ گیا ہے تمہارا سارا کام فائنل ہو جائے گا“ چوہدری حماد نے ہادی کو مخاطب کیا۔ ”جی بالکل انکل۔“ وہ موذبانہ بولا۔

”بس ایک ہفتہ پھر ہادی یہاں سے چلا جائے گا.....؟“ شہوار کا دل رکنے لگا۔ وہ کھانا چھوڑ کر انھی اور اندر چلی گئی۔ سب ہی نے چونک کر اس کو دیکھا تھا۔

”کیا آپ ایک ہفتے کے بعد یہاں سے چلے جائیں گے۔“ وہ رات کو بیڈ پر لیٹا تو شہوار کا سیل پر ٹیکس آ گیا وہ بے ساختہ مسکرا رہا تھا جیسے یہی پڑھنا ہی سننا چاہ رہا ہو دل کو کتنا سکون محسوس ہو رہا تھا۔ ”ہاں.....“ اس نے جان بوجھ کر ٹیکس کا جواب ہاں دیا تھا پر یہ کیا دس منٹ میں منٹ آدھا گھنٹہ پورا گھنٹہ گزر گیا پر مزید کوئی ٹیکس نہیں آیا۔ وہ خود سے ٹیکس کرنے پر گریز کر رہا تھا پر دل میں ایک ہلچل مچ گئی تھی کیا ہوا کیوں جواب نہیں آیا.....؟ سو گئی ہوگی اس کا دماغ سو سو سوال سوچ رہا تھا۔ وہ

بے ساختہ اور خود ساختہ کا فرق سمجھ گئی ہوں
میں ہادی۔ وہ چونک کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ
آج جیسے بیاں کرنے کے موڈ میں تھی۔ آج جیسے وہ
سب راز کھولنا چاہتی تھی۔

جانے کیسا خوف تھا جو عبدالبہادی کو قدم پیچھے
ہٹانے پر مجبور کر رہا تھا۔ تم اندر جاؤ وہ بات بدل کر
بولتا۔ ”اب کہیں جانے کا راستہ ہی نہیں ہے۔ وہ ہم
کلامی کے انداز میں بولی۔ ”چلو نا اندر عبدالبہادی
نے نرمی سے اس کا ہاتھ پکڑے اور تیزی سے اندر
کی طرف بڑھ گیا۔

شہوار کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا وہ اس کا
لمس روح تک محسوس کر رہی تھی۔ چوہدری حیدر
کے کمرے کی بہت دیر سے کھلی کھڑکی جھٹکے سے بند
ہوئی تھی۔

وہ دونوں اندر جا چکے تھے۔ ”بھائی مجھے آپ
سے بہت ضروری بات کرنی ہے۔ حماد چوہدری
آفس میں موجود تھے۔ جب اچانک چوہدری حیدر
نے آ کر کہا تھا وہ متوجہ ہو گئے۔
بیٹھو حیدر کہو۔ ”بھائی آپ کو یاد ہو ام ایمن کا
معاملہ.....“ چوہدری حیدر ہے سچ یادوں کا دریچہ وا
کرنے کی سعی کی۔

”ہاں یاد ہے۔“ کیوں.....؟“ چوہدری حماد
کے چہرے کے تاثرات سخت ہوئے۔ ”بھائی ام
مریم کی شادی اپنوں میں ہو گئی اہل کارشتہ اپنوں
میں ہی طے ہے۔ ام ایمن نے جو بھی کیا..... مگر
اس معاملے پر سب راضی تھے آپ کے سوا۔“

”چوہدری حماد کا انداز عجیب سا تھا۔“ ہاں
میں جانتا ہوں جو ہوا میری ضد اور انا کی وجہ سے ہوا
تم اصل بات کرو۔

چوہدری حماد نے فطری سختی اور غصے کا مظاہرہ
کیا۔ ”بھائی برہم نہ ہوں..... دراصل عبدالبہادی

بے شک بہت ہی معزز خاندان کی اولاد ہے پڑھا
لکھا ہے، خوب رو ہے پر در شہوار سے اس کی یہ بے
تکلف دوستی۔“

”بس چپ کر جاؤ حیدر..... تم نے کچھ دیکھا
ہے کیا۔“

چوہدری حماد نے بات مکمل ہی نہ ہونے دی
سخت برہم ہوئے ہاتھ کے اشارے سے بھائی کو
روک دیا۔ ”میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر آپ کی مرضی
ہو تو در شہوار کی شادی میرے علی سے کر دی جائے
تا کہ گھر کی بچی گھر میں ہی رہ جائے اور کچھ غلط نہیں
نہ ہو۔“

چوہدری حماد نے نہایت مناسبت کے ساتھ
اپنا مطمع پیش کر ڈالا تھا۔ چوہدری حماد کو کیا اعتراض
ہو سکتا تھا جبکہ چوہدری حیدر ان کے دل میں شک و
خوف کا بیج بھی اگا چکا تھا۔

پنک کلر کی نہایت خوبصورت گھیر دار شلوار جس
کے گلے پر آگے سفید موتیوں کا کام تھا۔ پنک چنا
ہوا دوپٹہ بازوؤں پر لپٹے گھنے بالوں کو فراک کی
مناسبت سے جوڑے کی صورت میں قید کیے سلور کلر
کی ہائی ہیل نازک پیروں میں پہنے وہ مسز حماد کے
ساتھ کھڑی تھی۔

عبدالبہادی بیٹا نہ احمد ہے نا علی..... اہل اہل
ٹیسٹوں کی تیاری کر رہی ہے در شہوار نے اپنی سہیلی
کے گھر جانا ہے تم لے جاؤ بیٹا۔

وہ ٹی وی دیکھ رہا تھا مسز حماد نے کہا تو وہ فوراً
اٹھ گیا کچھ ہی دیر میں وہ دونوں گاڑی میں موجود
تھے۔

در شہوار غیر معمولی طور پر چپ تھی۔ کالی سیاہ
آنکھوں میں گہرا کاجل جیسے دو مقدس موتی ہوں
نازک سے ہونٹوں پر ہلکی پنک لپ اسٹک
عبدالبہادی کو لگ رہا تھا جیسے یہ کوئی ماروائی مخلوق

کبھی کبھی انسان منزل کے بہت پاس ہوتا ہے اور اچانک سے اس کی آنکھ کھل جاتی ہے جب وہ نیند سے بیدار ہوتا ہے تو منزل بہت بہت دور ہوتی ہے اتنی جیسے پہنچنا ناممکن ہو۔ یہی سب عبدالہادی کے ساتھ ہوا تھا جب سے وہ درشہوار کو چاہنے لگا تھا۔

اس نے تو سوچا ہی نہیں تھا کہ درشہوار کو حاصل کرنا اتنا آسان نہیں ہے جتنا وہ سمجھ رہا ہے وہ تو بس درشہوار کی ہنسی اور مسکراہٹ کو دیکھ کر سمجھتا تھا کہ زندگی حسین ہے اور حسین ہی رہے گی خاردار راستوں نے منزل راہوں کا تو اس نے تصور ہی نہیں رکھا تھا۔

مگر آج وہی سب ہو رہا تھا جو پرانے قصے کہانیوں میں پڑھتا آیا تھا جن کا وہ مذاق اڑاتا تھا کیا کوئی اتنا بے بس بھی ہو جاتا ہے کہ جس شخص کو بہت بہت پیار کرتا ہو اس کو ہی چھوڑ کر چلا جائے۔

وہ رومانوی ناول پڑھ کر خوب ہنسا کرتا تھا پر یہ آج کیا ہو گیا تھا۔ ”انگل حماد اس کو ایک دن کے اندر اندر گھر سے جانے کا کہہ چکے تھے اور ساتھ میں یہ بھی بتا چکے تھے کہ اگلے ہفتے علی حیدر کے ساتھ درشہوار کی شادی ہے چاہے تو اٹینڈ کر سکتا ہے۔

آج وہ ایسے بلک بلک کر رو رہا تھا۔ جیسے دو دن کا بچہ ہو خالی ہاتھ ٹوٹا دل یہ سب کیا ہو گیا تھا اس میں کس چیز کی کمی ہے دولت عزت خوبصورتی تعلیم..... وہ اپنے آپ سے سوال کر رہا تھا۔

معاذ روزہ بجا وہ خود کو نزل کر کے دوازہ کھول کر ہٹ گیا۔ ”ہادی مجھے آپ سے بات کرنی ہے۔“ شکست خوردہ آواز میں وہ شہوار ہی تھی۔ وہ

ہے وہ۔“
”گاڑی درشہوار کی سہیلی کے گھری طرف رواں دواں تھی معاذ درشہوار چلا کر بولی۔“ گاڑی روکیں۔“ وہ حیران رہ گیا سنان سڑک تھی۔“ کیوں.....؟“ ”روکیں نہ روکیں گاڑی.....“ اس کا انداز عجیب نذبذب کا شکار تھا عبدالہادی نے گاڑی روک دی۔

”کیا ہوا گاڑی کیوں رکوائی.....؟“ مجھے کہیں نہیں جانا۔“ وہ اپنی کلانی سے نازک پنک کانچ کی چوڑیاں اتار کر سامنے ڈیش بورڈ پر رکھ رہی تھی ”پر کیوں.....؟“

مجھے جانا ہی نہیں تھا امی نے زبردستی تیار کروا کر بھیجا ہے پر مجھے نہیں جانا۔“ وہ کانوں سے سفید خوبصورت موتیوں کے ٹاپس اتار رہی تھی۔ ”پر درشہوار ہوا کیا ہے.....؟“ وہ خفگی سے بولا درشہوار ڈیش بورڈ پر انگلی سے رنگ اتار کر ڈال رہی تھی۔

”آپ نے علی کو دیکھا ہے۔“ وہ سرخ نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ ”ہاں“ اس نے زور دے کر بتایا۔ ”مجھے امل بتا رہی تھی کہ اس سے میرا رشتہ طے کیا جا رہا ہے۔“ روہانسی آواز میں وہ عبدالہادی کے کانوں پر کوئی دھماکہ کر رہی تھی۔

”کیا.....؟“ کچھ دیر بہت حیرانگی کے بعد وہ بجھی بجھی آواز سے بولا۔ ہاں اور وہ مجھے بھی بالکل پسند نہیں ہے۔“ وہ اس کو غور سے دیکھتے ہوئے کہہ رہی تھی

اچھا عبدالہادی کی سانس رُک رہی تھی۔ ”اب تم نے جانا ہے یا نہیں۔“ وہ مشکل سے خود کو کنٹرول کر رہا تھا۔ ”نہیں۔“ وہ سختی سے بولی عبدالہادی نے گاڑی واپسی کی طرف موڑ دی۔

آج الفاظ کتنے کم ہو گئے تھے نہ درشہوار کو مل رہے تھے نہ عبدالہادی کے پاس تھے۔

تڑپ کر پلٹا وہ سرخ سرخ چہرہ سرخ نگاہیں لیے کھڑی تھی۔

”کیا ہوا ہے؟“ وہ پاس آ کر پیار سے بولا۔ ”ہادی میں آپ سے بہت بہت پیار کرتی ہوں میں آپ سے شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے امی کو بتا دیا ہے مگر امی کہتی ہیں ہمارے ہاں خاندان سے باہر شادیاں نہیں ہوتیں۔“ وہ ہادی کے گلے لگ گئی تھی بے تحاشا روتے ہوئے وہ تڑپ تڑپ کر بتا رہی تھی۔

عبدالہادی آنکھیں پھاڑے اس نازک سے وجود کو دیکھ رہا تھا دل چاہ رہا تھا ابھی ابھی وہ آنکھیں بند کرے اور کسی جادوگر کی طرح در شہوار کو ساتھ لے کر کسی اور دنیا میں پہنچ جائے جہاں وہ دونوں ہوں صرف اور ہر طرف پیار ہی پیار۔

عبدالہادی آپ بھی مجھے پیار کرتے ہونا۔“ وہ بے تابی سے پیچھے ہٹ کر اس کا ہاتھ تھام کر پوچھ رہی تھی۔

”بتائیں نا۔“ ہاں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ کیا بولا ہے وہ تو خواب دیکھ رہا تھا بس۔ ”تو آپ کو بابا کو بتانا پلیز بتانا کہ اسلام میں لڑکا لڑکی سے ان کی مرضی پوچھ لینا جائز ہے۔“ اسلام میں کسی بھی خاندان پر پابندی نہیں بس نیک مسلمان حلال حرام کی تمیز کرنے والا اسلامی تعلیمات کی پابند کرنے والا خوش اخلاق!..... اور اور آپ میں تو سب کچھ ہے سب کچھ۔

وہ عبدالہادی سے امید بھرے انداز میں کہہ رہی تھی جیسے وہ یہ سب کچھ کہے گا اور چوہدری حماد مان جائیں گے۔“

در شہوار بچوں کی طرح کیوں ری ایکٹ کر رہی ہو۔ ہمت کرو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اور اگر تمہیں کسی نے یہاں دیکھ لیا تو بات بہت

بڑی بن جائے گی۔“ وہ پیار سے اس کا ہاتھ تھام کر متانت سے سمجھا رہا تھا۔

”سب ٹھیک ہو جائے گا نا.....“ وہ خوفزدہ سی پوچھ رہی تھی۔ ”انشاء اللہ۔“ عبدالہادی نے پر یقین ہو کر کہا اور در شہوار کے جاتے ہی دروازہ بند کر لیا اور وہ اپنی پیکنگ کر رہا تھا۔

Downloaded
From
Paksociety.com

☆.....☆.....☆

چھوٹا سا سادہ سا گھر تھا۔ مگر زندگی گزارنے کی ہر آسائش موجود تھی۔ عبدالہادی نے اس کو ایک کمرہ دکھایا تھا جو گھر میں کچھ سائیڈ پر ہی تھا۔ آپ یہاں آرام سے رہ سکتی ہیں۔ بہت سادہ سا انداز تھا اس کا پر جاتے جاتے وہ شکی انداز سے پوچھ رہا تھا۔

ام ایمن آپ کے والد کا کیا نام ہے؟ اس وقت میں غور نہیں کر پایا.....!“ جھکی جھکی پلکوں کے ساتھ جواب ملا۔

عبدالہادی نے بمشکل اپنی حیرت پر قابو پایا ایک نام جو اس کو پوری طرح اندر سے ہلا چکا تھا۔ ”کراچی کے رہنے والے ہیں کیا.....؟“

وہ تصدیق چاہ رہا تھا۔ ”جی.....“ بھیگا بھیگا لہجہ ”اوکے۔“ وہ تیزی سے کہہ کر گھر سے چلا گیا۔ ایک چال چلی تھی زندگی نے اس کے ساتھ ابھی تو چھ ماہ ہی گزرے تھے کہ اس خاندان کا ایک ایسا شخص جو ان کی عزت پر حرف لا کر ان کو چھوڑ کر جا چکا تھا۔ وہ اس کی زندگی کا حصہ بن گیا تھا مجبوری ہی سہی پر حقیقت تو تھی نہ کہ وہ نکاح کر چکا ہے۔

وہ رات کو آفس ہی آ گیا تھا اور اس وقت بیٹھا خود کو کوس رہا تھا کہ اس نے ایسا کیوں کیا؟

وہ در شہوار کی محبت یادوں وفا کسی بھی چیز کے ساتھ خیانت یا بے وفائی ہر گز نہیں کر سکتا تھا اور اس کی زندگی میں آیا بھی تو کون ام ایمن کو در شہوار کی

آئیڈیل تھی۔ درشہوار اس کو بہت پیار کرتی تھی اس کے لیے بے پناہ دعائیں کرتی تھی کہ وہ جہاں رہے خوش ہو۔

پر یہ پورے خاندان کی عزت تباہ کر کے آگئی تھی۔ اسی لیے اس کو یہ سب سزائیں مل رہی ہیں۔ ”کبھی ہمدردی اور کبھی نفرت عبدالہادی ام ایمن کی طرف سے عجیب جذبات کا شکار ہو رہا تھا۔ پر آخر میں ہمدردی اور انسیت کا جذبہ ہی غالب آیا کیوں کہ درشہوار کو ام ایمن سے بہت محبت تھی۔

☆.....☆.....☆

”آخر کب تک شہوار.....! کب تک..... تم اپنا یہی حال بنائے رکھو گی کب تک اپنی زندگی کے حسین دن پرانی یادوں کے ویران رستوں پر چل کر برباد کرو تم بناؤ.....“

وہ ٹھنڈے پانی کے حوض میں ننگے پاؤں دے کر بیٹھی تھی اہل اس کے پاس آ کر خفگی سے پوچھنے لگی درشہوار نے کوئی بھی جواب نہیں دیا۔ اس کی نگاہیں غیر مرئی نقطے پر مرکوز تھیں ”اہل.....!“ ہاں بولو.....؟“ کچھ نہیں

وہ ایسے ہی کرتی تھی مخاطب کرتی اور پھر چپ کر جاتی ”حد ہے درشہوار.....! سال ہونے کے قریب ہے اس نے پلٹ کر آنا ہوتا تو ضرور آ جاتا مجھے لگا ہے وہ تم سے واقعی محبت نہیں کرتا تھا.....“ بہت درستی اور خفگی سے اٹھتے ہوئے اس نے پانی کے چھینٹے اڑائے اور بہت تیزی سے اندر چلی گئی۔

”میزی بات سنو تم۔“ اہل اس کے پیچھے گئی تھی۔ چوہدری حماد نے اپنی اکلوتی بیٹی کے آگے چاروں شانے چت ہو گئے تھے۔ چوہدری جواد فطرتاً نرم دل انسان تھے انہوں نے خود بڑے

بھائی کو کہا تھا کہ آپ ام ایمن کا واقعہ بھول کر درشہوار کی شادی عبدالہادی سے کروائیں مگر دور دور تک عبدالہادی کا کوئی نام نشان نہیں ملا اس کے تمام کونٹیکٹ بند تھے۔

جس شخص سے بھی ہادی کے بارے میں پوچھا گیا لاعلمی کا اظہار ہی کیا گیا۔

وہ کیا کرتے اپنی اس لاڈلی بیٹی کا جس کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ دیکھ کر مسز حماد چوہدری خود بیمار رہنے لگیں۔ پورا گھر بے رونق اور افسردہ رہنے لگا تھا۔

ام مریم امریکہ سے خاص طور پر شہوار سے ملنے آئی ہوئی تھی۔

شہوار کے بڑے بھائی کے ساتھ ساتھ علی کی شادی بھی ہو چکی تھی۔ ماحول تبدیل ہو چکا تھا پر درشہوار کے لیے جیسے زندگی تھم سی گئی تھی۔ پر وہ یہ وقت گم صم دروازے کو تکتی رہتی کہ عبدالہادی کہیں کسی پل تو مل جائے حتیٰ کہ وہ لڑکی جو باقاعدگی سے نماز بھی نہ پڑھتی تھی تہجد پڑھنے لگی تھی کب دعائیں قبول ہوں گی کب خواب روشن ہوں گے کبھی تو تمام سوچیں پوری ہوں گی کبھی تو امید بر لائیں گی۔

وہ پوری پوری رات جاگ کر گزار دیتی تھی۔ BCS تو جیسے تیسے کر ہی لیا۔ آگے پڑھنے سے خود ہی انکار کر دیا تھا۔

☆.....☆.....☆

”آپ ویکنڈ مری میں گزارتے ہیں.....؟“ ام ایمن نے چائے کا کپ عبدالہادی کے سامنے رکھا۔ ”جی“ مختصر جواب۔

”پوچھ سکتی ہوں کیوں.....؟“ ڈرتے ڈرتے پوچھا گیا۔

میں جب بھی فرصت ہوتی ہے تو زندگی گزارنا

بہت مشکل ہو جاتے ہیں اس لیے میں مری چلا جاتا ہوں۔

”میری اپنی ایک دنیا ہے ام ایمن۔“ اور وہ دنیا مجھے تب ہی اچھی لگتی ہے جب یہ دنیا اس میں شامل نہیں ہوتی۔“ وہ کھوئے کھوئے انداز سے بتا رہا تھا۔ ام ایمن کو اشارہ مل گیا تھا۔ ”اچھا میں ڈنر تیار رکھ لوں۔“ وہ متانت سے کہہ کر کچن میں چلی گئی۔

اس کو پورا ایک ماہ ہو گیا تھا اس میچا جیسے شخص کے ساتھ رہتے رہتے اور حیرت کی انتہا تھی کہ اس نے ایک بار بھی ام ایمن کے حسن کی طرف ایک نگاہ غلط بھی نہیں ڈالی تھی۔ جب کہ اس کا حق تھا اور اگر اس کی طرف مائل بھی ہوتا تو وہ کیا کر سکتی تھی جبکہ یہ زندگی اس کے توسط سے مل تھی۔

آپ نے سب کو بتا دیا کہ میں آپ کی سز ہوں آپ کے لیے کوئی مسئلہ نہ بن جائے۔“ ام ایمن حیرت و تشویش سے رات لے کھانے پر اس کو کہہ رہی تھی۔

”میں نیکی کرتے وقت کسی سے ڈرتا نہیں ہوں۔“ وہ جتا رہا تھا۔ ”اچھا..... اللہ پاک ویسے آپ سے سچ میں بہت خوش ہوں گے بہت۔“ وہ ہمیشہ کی طرح دعادینے لگی۔

ایک بات پوچھوں.....؟ ”جی.....“ تم نے گھر سے بھاگ کر شادی کیوں کی تھی.....؟“ وہ نخوت سے پوچھ رہا تھا ام ایمن کا سر ندامت سے جھکتا چلا گیا۔

”بتاؤ۔“ انداز سخت تھا۔ ”محبت سب کچھ کر دیتی ہے۔“ نہایت ٹوٹے ہوئے لہجے میں جواب دیا گیا۔ اور ماں باپ کی عزت.....؟“ چھبنا ہوا سوال۔ ”بہت منایا تھا پیرٹس کو بہت..... کاش!“ تڑپ بہت تھی۔ ”تمہیں معلوم ہے ان سب پر کیا

گزر رہی ہوگی.....؟“ اندازہ تھا.....“ وہ اعتراف جرم کرنے لگی۔

”عبدالہادی اگر آپ کو کسی سے محبت ہوتی تو آپ کے لہجے میں میرے لیے کم از کم اتنی نفرت نہ ہوتی۔“ ام ایمن منہ چھپا کر رونے لگی۔

”محبت.....“ وہ استہزائیہ ہنسا محبت ندامت اور رسوائی کا نام نہیں۔“ بے شک پھر..... تم..... جو کچھ بھی ہو غلط ہو اسب سے بڑا تھپڑ میرے منہ پر میرے نصیب نے مارا مرتضیٰ خان سے شادی کرنے کے بعد میں خود کو اس دنیا کی شہزادی سمجھ رہی تھی۔ مجھے خود پر اتنا غرور ہونے لگا تھا کہ میں ہواؤں میں اڑتی تھی دن رات۔

ماضی کی بھول بھکیوں میں الجھنے لگی تھی۔“ پتا ہے میرا فخر میرا غرور ایک سال بھی سلامت نہیں رہا میرے نصیب نے شادی کے دسویں ماہ ہی مرتضیٰ کو مجھ سے چھین لیا وہ بے آواز ہو رہی تھی۔“

مرتضیٰ نے مجھے اتنا پیار دیا کہ اب پیار کی حسرت ہی نہیں ہے اس دل میں..... میں پلٹ کر گھر والوں کی طرف نہیں گئی کیسے جاتی.....؟؟ وہ جیسے اپنے آپ سے سوال کر رہی تھی۔ ”وہ مجھے کبھی قبول نہ کرتے دوبارہ اور مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ اپنی بے بسی اور بد قسمتی کی کہانی ہر کسی کو سنا کر اپنے گناہ معاف کرواتی۔“

”مرتضیٰ کے ماں باپ بھی تو ظلم کر رہے تھے وہ کیوں سہتی رہی تم.....؟“ وہ آج سب کچھ پوچھ رہا تھا۔ ”وہ لوگ..... ظلم تو نہیں کر رہے تھے۔“ جواب پر وہ حیران رہ گیا جنہوں نے اپنی زندگی کا تمام سرمایہ ساری جمع پونجی لگا کر اپنے بیٹے کو کسی قابل بنایا ہو اس سے دن رات خواب دیکھے ہوں ایک انجان لڑکی کی نحوست کی وجہ سے وہ اس دنیا سے ہی چلا جائے تو ان لوگوں کی کیا حالت ہوگی

بتائیے۔“

احساس کمتری یا یست اور احساس محرومی اس کے اندر جیسے اس کی رگوں میں دوڑ رہی تھی۔ ”ام ایمن۔“ عبدالبہادی نے لمبی سانس خارج کی۔ ”کس حال میں کس طرح زندگی گزاری ہے اس لڑکی ہے جو ایک معزز ترین امیر اور ایجوکیٹڈ فیملی کا حلقہ ہے اور سب سے بڑھ کر درشہوار کی آئیڈیل ہے۔“

تم جا ب کر وگی میرے آفس میں..... اس کے اندر کے خالی پن کو دور کرنے کے لیے اس کا دھیان بٹانا ضروری تھا۔

”واقعی۔“ وہ بہت خوش بھی ہوئی اور حیران بھی۔ ”جی بالکل ضرور کروں گی۔“ وہ بے تحاشا خوش تھی کل میرے آفس چلنا ٹھیک ہے۔

”ہادی اس کو مزید خوش کر یک کھانے کی ٹیبل سے اٹھ چکا تھا۔“

وہ عبدالبہادی سے ایک بار بھی پوچھ نہیں پائی تھی کہ آخر اس کی زندگی میں کون ہے ایسا جو اس کو کسی طرف متوجہ ہونے ہی نہیں دیتا۔ ام ایمن لاکھ حسین سہی پر شاید واقع کوئی ایسا ہے جو عبدالبہادی کے لیے اس کی زندگی اور اس کی پوری دنیا ہے اور عبدالبہادی سبج کے مقدس دانوں کی طرح اس شخص کی یادوں کی حفاظت کرتا تھا، عزت کرتا تھا، قدر کرتا تھا وہ رات کو جب اپنے کمرے میں بند ہوتا تو اس کی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ دروازہ بجائے، ویک اینڈ پر مری جاتا تو اس کی ہمت نہ ہوتی کہ اس کو جانے سے روک لے۔

پورے آفس میں پورے محلے میں وہ عبدالبہادی کی مسز کے طور پر جانی جانے لگی تھی۔ وہ اس کی پہچان بن گیا تھا۔

صرف وہ جانتی تھی کہ عبدالبہادی کو جس کی

یادوں کے سہارے سانس آتی ہے وہ کوئی اور ہے اور وہ اس کا نام تک نہیں جانتی۔ ”محبت تو مرضی کی امانت تھی۔ پر کچھ اور تھا دل میں جو اب عبدالبہادی کے لیے پیدا ہو چکا تھا۔ اسے بحس تھا کہ آخر کون ہے وہ خوش نصیب جو ہادی کی پسند ہے اور پھر سوچتی کہ آخر کون ہے وہ بد نصیب جسے ہادی نہیں ملا۔

اچانک موسم کے بدلاؤ کی وجہ سے وہ سخت بیمار پڑ گئی۔ ڈاکٹر نے پانی اور ہوا بدلنے کا کہا تو اس ویک اینڈ عبدالبہادی اس کو بھی اپنے ساتھ لے آیا۔ وہ اپنے بیمار ہونے پر خوش ہو گئی چلو اس بہانے عبدالبہادی کا قرب تو نصیب ہوا۔

عبدالبہادی اور اس میں اچھی دوستی قائم ہو چکی وقت بہت اچھا گزر جاتا ہے اس وقت بھی دونوں آتش دان میں آگ جلانے اپنے کالج لائف کے قصے ایک دوسرے کو سنا رہے تھے۔ ”آپ کو پتا ہے میری ایک کزن ہے درشہوار.....“ وہ مجھے بہت بہت یاد آتی ہے سچ وہ بہت پیاری ہے پتا نہیں اب کیسی ہوگی وہ پورے چھ سال گزر گئے ہیں جب میں گھر سے آئی تھی اس وقت 14 سال کی تھی وہ۔ گھر کا ذکر آیا تو معاً درشہوار کا ذکر ام ایمن کے ہونٹوں پر آ گیا۔

عبدالبہادی نے چائے کا کپ نیچے کارپٹ پر رکھ دیا اور خود دیوار سے ٹیل لگائی۔ وہ دونوں آتش دان کے پاس نیچے کارپٹ پر ہی بیٹھے تھے۔ ”پڑھتی تھی وہ ”جی اسکول میں 9th گریڈ کی اسٹوڈنٹ تھی۔ مجھے بچپن ہی سے اس سے بہت پیار ہے جیسے میری سگی بہن ہو۔“

وہ پیار سے بتا رہی تھی۔ ”اچھا گڈ ٹائٹ۔“ عبدالبہادی کا دل بے تاب ہو رہا تھا۔ محرومی کا احساس آنکھوں میں اتر آیا تھا۔ وہ فوراً اٹھ کر اپنے کمرے میں آ گیا اور دروازہ اندر

سے بند کر لیا۔ ام ایمن حیران رہ گئی تھی۔
تا حد نظر سبزہ ہی سبزہ اور دور تک پھیلی سنسان
پتھریلی سڑک وہ ہوٹل کے ٹیرس پر اکیلی کھڑی تھی
اور سورج کی پہلی کرن زمین پر پہنچتے ہی ٹیرس پر
آگئی تھی۔

اٹل شہوار کو زبردستی یونیورسٹی ٹرپ کے ساتھ
مری لائی تھی۔ اور دو دن سے وہ یہاں ہی رُکے
ہوئے تھے۔ ہادی مجھے سبزہ بہت پسند ہے میرا دل
چاہتا ہے کہ ہم مری میں رہتے ہوتے۔ وہ اکثر اپنی
خواہش کا اظہار کرتی تھی آج بھی ایک وہی شخص
یاد آ رہا تھا۔ جس سے دیوانوں کی طرح محبت
کرنے لگی تھی۔

معا جیسے دعائیں قبول ہو گئیں۔ امیدیں بر
لے آئیں تھیں تمام خواب روشن ہو چکے تھے۔
امید کے سارے یقین چاند میں بدل چکے تھے۔ وہ
حیرت و بے یقینی سے منہ کھولے نیچے سڑک پر دیکھ
رہی تھی جہاں وہ عبدالہادی ہی تھا جو پیٹ کی
جیبوں میں ہاتھ ڈالے آہستہ آہستہ آ رہا تھا۔
شہوار سانس لینا پلکیں چھپکانا بھول گئی
تھی۔ عبدالہادی وہ زندگی سے بھرپور آواز میں
چلائی تھی۔ اور مقابل نے فوراً نگاہیں اٹھا کر دیکھا
تھا جیسے اسی کی پکار کی تلاش میں
ہو۔ ”عبدالہادی..... وہ پاگلوں کی طرح پکارے
جا رہی تھی۔ کتنے پیارے لگ رہے تھے اپنے نام
کے حرف یہ خواب تھا کہ سچ وہ ساکت کھڑا تھا وہ تیز
سے سیڑھیاں اتر کر وہ پاس آ چکی تھی۔

”عبدالہادی۔“ وہ بری طرح خوشی سے
کانپ رہی تھی۔ ”آپ مجھے مل گئے آخر۔“
اس کی سانسیں بے ربط ہو رہی تھیں اور پھر
بے تحاشا روتے ہوئے ایک بار پھر عبدالہادی کے
سینے سے لگ گئی۔

آپ مجھے کیوں چھوڑ کر چلے گئے تھے
عبدالہادی..... آپ کو بابا نے بھیجا تھا..... آپ
کیوں گئے مجھے چھوڑ کر۔

”وہ ایک سانس میں ہزار شکوے ہزار سوال
کر رہی تھی۔ عبدالہادی سینے میں جو طوفان اٹھا ہوا
تھا جیسے وہ کھم گیا تھا زخمی وجود پر جیسے کسی نے مرہم
رکھ دیا تھا۔ سانسیں سکون کی حالت میں تھیں وہ
ایک بار پھر خوش نصیب ٹھہرا تھا۔

بتائیں نہ کیوں گئے تھے.....؟“ وہ پیچھے ہٹ
کر خفگی سے پوچھ رہی تھی اتر اچہرہ بھٹی بھٹی آنکھیں
بکھرے بال کیا حال کر دیا عبدالہادی تم نے اس
لڑکی کا عبدالہادی نے خود کو فوراً ’کوسا‘ پر جواب
اس کو نہ دے سکا۔

عبدالہادی پتا ہے کچھ بھی نہیں بدلا کچھ بھی بابا
مان گئے پھر اگھر مان گیا بابا نے مجھے کہا کہ جب
عبدالہادی ملے گا اس سے میری شادی کر دیں
گے۔ کچھ بھی نہیں بدلا عبدالہادی کچھ بھی نہیں علی نے
خود انکار کر دیا دیکھیں میں آپ کی امانت ہوں۔

”وہ بے تابانہ انداز سے بتا رہی تھی آنکھوں میں
بے تحاشا خوشی جھلک رہی تھی..... یہ کیا ہے.....؟“ اس
کی بانیں کلائی پر گہرا نشان دیکھ کر عبدالہادی نے حیرت
سے پوچھا۔ ”کچھ..... کچھ..... کچھ بھی نہیں۔“ وہ گڑبڑا
گئی۔ ”آپ اب میرے ساتھ چلو گے نا۔“ وہ فوراً پر
یقین لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

ام ایمن۔ ”ایک گرم گرم سیسہ پگھلا کر اس
کے کانوں میں ڈالا گیا تھا۔ اندر تک جلن ہی جلن
ہی..... زندگی ملتے ملتے پھر بہت دور چلی گئی تھی
سانس لینے کے لیے آکسیجن کم بہت کم لگ رہی
تھی۔“ بے بسی سے شہوار کو دیکھنے لگا۔
بتائیں.....؟ شہوار کو ڈر لگنے لگا۔

”در شہوار.....“ وہ محبت سے لبریز لہجے میں

انگوشی تو یہ سب عبدالہادی کا سرمایہ تھا جس کو وہ سب سے چھپا چھپا کر سنبھال سنبھال کر رکھتا تھا۔ وہ کسی پاک چیز کی طرح ڈر ڈر کر ہر چیز کو ہاتھ لگا رہی تھی پر جان تو وہ اب تک نہ سکی تھی کہ آخر اس کا نام کیا ہے جو عبدالہادی کا سب کچھ تھی کچھ دیر بعد جب وہ گولڈن بکس الماری میں رکھ رہی تھی تو بری طرح چونک گئی۔ حیرت کی انتہا پر تھی اور بے یقینی سے آنکھیں پھاڑے الماری کے کونے میں رکھے ٹیڈی بیئر کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی یادداشت اتنی کمزور نہ تھی کہ وہ یہ ٹیڈی بھول جاتی سنہرے اور سفید رنگ کا بڑا سا ٹیڈی جو اس نے درشہوار کو گفٹ کیا تھا اور ٹیڈی کی خاص بات یہ تھی کہ اس کے سینے پر سرخ رنگ کا جو دل نا تھا اس کے اندر ام ایمن نے خود وائٹ کلر سے پی برتھ ڈے لکھا اور وہ اب تک جگمگا رہا تھا۔ بھگی آنکھوں کے ساتھ اُسے اٹھا رہی تھی۔

درشہوار.....“ وہ یا گلوں کی طرح ٹیڈی چوم رہی تھی جیسے خود درشہوار ہو۔ ”میری پیاری درشہوار“ وہ بھول گئی تھی کہ وہ عبدالہادی کی وجہ سے اس روم میں آئی تھی اچانک اس کو جیسے سب کچھ یاد آ گیا وہ پھر بے یقینی کے عالم میں تھی۔

”کیا وہ لڑکی درشہوار ہے.....؟“ وہ دیواروں سے سوال کر رہی تھی اور پھر بے ترتیب دھڑکنوں کو لے کر وہاں سے چلی گئی جیسے اس کمرے میں آئی ہی نہیں۔

کیوں اتنی مشکل ہو گئی ہے زندگی کیوں ایسا لگتا ہے ایک ایک دن عذاب ہے وہ گھر پہنچتے ہی کمرے میں گھس گیا تھا اور تکیے میں منہ چھپا کر بے تحاشا رو رہا تھا کتنا بے بس تھا اگر وہ ام ایمن کی جگہ کوئی اور لڑکی ہوتی تو وہ شاید شہوار سے جھوٹ بول کر اس کے ساتھ چلا جاتا پر ”ام ایمن“ اس کے ہوتے ہوئے وہ

بولتا۔ ”جی بتائیں۔“ وہ آج بھی ضدی لا ابالی اور جلد باز ہی تھی۔ ”میں تمہارے ساتھ نہیں جا سکتا درشہوار.....“ وہ سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔

”کیوں.....“ کیوں کے میں شادی کر چکا ہوں۔ ”بہت ہمتیں جمع کر کے عبدالہادی نے وہی کہا جو اس کو کہنا چاہیے تھا آخر وہ ام ایمن کا کیا کرتا اگر شہوار کے ساتھ چلا جاتا تو۔

”کیا.....؟“ درشہوار جھٹکے سے کچھ دور ہٹی تھی چھن کر کے جیسے خوابوں کا پورا محل ٹوٹ کر گرنے لگا تھا۔ چاروں طرف زلزلہ کو آچکا تھا۔ وہ بے یقین سی عبدالہادی کو دیکھ رہی تھی۔

ہاں درشہوار میں تمہاری زندگی سے جا چکا ہوں اور یہ ایک حقیقت ہے۔ ”وہ ٹھہر ٹھہر کر بولا اور ٹھہرے پھر واپس اسی طرف مڑ گیا جہاں سے آیا تھا۔

کیوں وہ اتنی بدنصیب ہے کہ محبت بھری آنکھوں کے باوجود وہ عبدالہادی کے منہ سے ہمیشہ دھتکار کے لفظ ہی سنتی تھی۔

☆.....☆.....☆

پُر اسراریت ام ایمن کو بے چین کر رہی تھی کیا راز تھے آخر جو اتنے چھپائے جا رہے تھے ایسا بھی کیا تھا جو اتنا پوشیدہ تھا۔

عبدالہادی ہٹ سے باہر گیا تو ام ایمن خود کو روک نہ پائی اور عبدالہادی کے بیڈ روم میں آ گئی دیوار پر جو الماری تھی اس کو لاک نہیں لگا ہوا تھا۔ ام ایمن نے کھولی سامنے ہی سنہری رنگ کا بکس جگمگا رہا تھا ام ایمن نے دھڑکتے دل کے ساتھ باہر نکال کر بیڈ پر رکھ لیا دل عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا جیسے وہ کوئی گناہ کر رہی ہو دھڑکتے دل کانتے ہاتھوں کے ساتھ اس نے کھولا تو کالج کی پنک چوڑیاں سفید موتیوں کے ٹاپس سفید رنگ کی ٹپس

در شہوار سے کیسے سب کچھ چھپاتا اس کو۔

دروازہ آہستگی سے کھٹکھٹایا گیا۔ وہ اپنا منہ رگڑنے لگا آ جاؤ دروازہ کھول کر وہ پھر بیڈ پر ڈھے گیا۔ ”خیریت ہے..... آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے.....“ وہ پریشانی و فکر مندی سے پوچھ رہی تھی۔ ”تم میری فکر مت کرو خدا کے واسطے تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں جاؤ یہاں سے جان چھوڑو میری مجھے اکیلے رہنا ہے۔“

وہ پھٹ ہی پڑا تھا صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا بس چلتا تو کھا جاتا یہ وجود۔

ام ایمن سیم کر دور ہٹ گئی تھی اور پھر غصیلی نگاہوں کی تاب نہ لاتے ہوئے فوراً اپنے کمرے سے باہر نکل گئی تھی۔ عبدالہادی کا رویہ ام ایمن کے ساتھ نہایت سخت اور سرد ہو چکا تھا اور چاہ کر بھی در شہوار کے حوالے سے کوئی سوال نہیں کر پارہی تھی۔

اسی دن وہ اس کو واپس پنڈی لے آیا تھا وہ ادھر ہی کھڑی تھی گھنٹہ دو گھنٹے اور پھر کتنی ہی دیر گزر گئی وہ ادھر ہی جمی کھڑی تھی اہل کا گلا اس کو پکار پکار کر سوکھ گیا تھا پر وہ جواب نہیں دے رہی تھی بے حس و حرکت نگاہیں زمین پر گاڑے کھڑی تھی۔

در شہوار کی قوت گو پانی جیسے کھو چکی تھی اہل آ کر زبردستی اس کو پکڑ کر اندر کمرے میں لے آئی تھی کیوں بارش بہت تیز بارش شروع ہو چکی تھی۔ ”اہل وہ آیا تھا۔“ آ کر وہ چپ توڑ کر بے یقین لہجے میں کہہ رہی تھی۔

”اہل مجھے یقین نہیں آ رہا..... وہ آیا اور چلا بھی گیا۔“ میں نے تو اتنی دعائیں مانگی تھیں..... ہر پل ہر لمحہ پکارا تھا اس کو..... کیا وہ بس اتنی سی دیر کے لیے آیا اور وہ بھی جسٹ یہ بتانے کے وہ.....“ وہ کسی خواب کی کیفیت میں رک رک کر بول رہی تھی اور پھر دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کر بے تحاشا رونے لگی۔

”کیا عبدالہادی آیا تھا وہ ملا تمہیں.....؟“ اہل کو اس پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ”کیا کہہ رہی ہو تم سچ بتاؤ.....“ اہل نے شہوار کے دونوں ہاتھ تھام لیے وہ شہوار کی باپ یقین کرنے کو تیار نہ تھی۔

”اہل کیا وہ مجھے واقعی پیار نہیں کرتا..... اہل وہ نہیں کرتا مجھے پیار..... کیا میں نے یک طرفہ محبت کی.....؟ وہ بے یقینی کے عالم میں اہل کی بات کا جواب دے رہی تھی۔

”اچھا بتاؤ مجھے پوری بات بتاؤ آخر ہوا کیا تھا؟“ اہل نے اس کو پیار اور ترحم سے گلے لگایا اور وہ ایک بار پھر کھل کر رو دی۔ ”دیکھو شہوار! اس کا قصور نہیں ہے ذرا بھی نہیں ہے اس نے تمہیں کوئی آس نہیں دلائی تھی، وعدہ نہیں کیا تھا، وفا کے دعوے نہیں کیے تھے پھر تم اس کی محبت بھری نگاہوں سے اتنی امیدیں کیوں لگائیں اس کی پوری بات سن لینے کے بعد اہل اسکو سمجھا رہی تھی۔ در شہوار نے کوئی جواب نہ دیا وہ لوگ واپس جانے کی تیاری کرنے لگیں تھیں۔

☆.....☆.....☆

خزاں آئی اور پھر جیسے جم کر رہی رہ گئی تھی۔ دنیا کی جیسے ہر شے یاسیت کی چادر اوڑھ گئی تھی۔

وہ مرے مرے قدموں سے ہاسٹل پہنچا تھا زندگی تو گزارنی ہی تھی چاہے سانس لینے میں کتنی ہی تکلیف کیوں نہ ہو اس نے ڈاکٹر سے پہلے خود کا چیک اپ کرایا پھر ام ایمن کی رپورٹ جو کہ ڈاکٹر نے آج شاچار بجے اٹھانے کو کہا تھا اور پھر رپورٹ دیتے ہوئے ڈاکٹر نے جو اس کو کہا اور جو اس نے رپورٹ میں پڑھا وہ اس کے ہوش اڑانے کے لیے کافی تھا اس کا سر اس قدر زور سے چکرایا اس کو لگتا تھا کہ وہ زمین پر ہی گر جائے گا یہ کیسے کیسے امتحانات آ رہے ہیں زندگی میں وہ سر تھام کر کرسی پر بیٹھا تھا اور

پھر تمام ہمتیں جمع کر کے بڑی مشکل سے اٹھا اور گھر جانے کے لیے گاڑی کی طرف گیا۔
 کتنے ہی آنسو اس کی پلکوں کی باڑ توڑ کر اس کے دونوں گالوں پر گر رہے تھے۔ قصداً اس نے گاڑی روکی اور ام ایمن کے لیے موتیے اور گلاب کے گجرے خریدے تھے ساتھ میں چاکلیٹس بھی لیں اور دوبارہ گاڑی اشارٹ کر دی۔“

☆.....☆.....☆

اب دل اور اس کی روز جنگ ہوتی تھی۔ مسز حماد اور امل نے اس کو سمجھایا بھی تھا کہ وہ کبھی اس کا نہیں تھا وہ اپنے کام کی غرض سے یہاں آیا اور کام ہوئے ہی چلا گیا یہ اس کی بے وقوفی ہے جو اس قدر شدید محبت اس سے کرنے لگ گئی تھی۔ کچھ کچھ وہ ان کی بات سمجھ گئی تھی۔ اپنے اندر کی شدت اور بھرپور سعی اور برداشت کے بعد کافی حد تک اس نے کم کر لیا تھا دل اپنی راہوں پر جانے کا بار بار کہتا وہ اپنے پاؤں خفگی ناراضگی غصے کی زنجیروں سے باندھ گیتی اور عبدالہادی کی طرف اس کی سوچوں کی طرف اٹھائے جانے والے قدم روک لیتی کوئی رات کوئی دن ایسا نہیں تھا جہاں عبدالہادی اس کی دنیا کا شہزادہ بن کر اس کے سامنے نہ آتا اور کہتا کہ بس تم اس کی امانت ہو۔

یہ ہی وجہ تھی کہ اس کو چوہدری حماد نے دو رشتوں میں سے ایک سلیکٹ کرنے کو کہا ایک اس کا اپنا ماموں کا بیٹا تھا اور ایک چوہدری فیملی سے ہی چوہدری حماد کے دوست کا بیٹا مسز حماد کی نظر میں اپنے بھائی کے گھر رشتہ کرنا زیادہ مناسب تھا۔ رشتے دونوں ہی اچھے تھے پر اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”امل میں نے کافی حد تک خود کو نارمل کر لیا ہے پر اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم لوگ میری شادی کر دو گے۔“

وہ سخت لہجے میں کہہ رہی تھی۔ میں کوئی جاب کر لوں گی تم سب پر بوجھ نہیں بنوں گی پر شادی مجھے نہیں کرنی۔“ وہ امل کو جتاتے ہوئے دو ٹوک کہہ رہی تھی۔ ”اُف.....!“ امل نے ٹھنڈی سانس خارج کی تھی۔ شہوار اپنی سرخ آنکھیں بے ساختہ رگڑنے لگی تھی۔ بار بار آنسو آئیں تو اب جلن رہنے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

ام ایمن تم اپنا بالکل بھی خیال نہیں کرتیں۔ بہت پیار سے ایمن نے دونوں ہاتھ تھام کر عبدالہادی خفگی سے کہہ رہا تھا۔ ”ام ایمن کا دل بہت زور سے دھڑکنے لگا پہلی بار ایسا ہوا تھا کہ اُسے اتنے پیار سے عبدالہادی نے ایمن کے ہاتھ تھامے ہوں۔ پچھلے ایک ماہ سے وہ ام ایمن کا کسی کالج کی گڑیا کی طرح خیال کر رہا تھا اس کی طبیعت کا بدلاؤ ایمن خود بھی سمجھ نہیں پائی تھی۔ کیوں کیا اس بار بھی میری رپورٹس ٹھیک نہیں آئیں.....؟“ وہ ڈرتے ڈرتے پوچھ رہی تھی۔ ”نہیں یار رپورٹس تو ٹھیک ہیں پر شکل تو دیکھو اپنی اتنا خوبصورت چہرہ کسی بجھے ہوئے چراغ کی طرح لگتی ہو تم۔“ وہ اس کا جائزہ لے رہا تھا اس کی گہری نگاہوں سے وہ جھینپ کر رہ گئی۔

اچھا آج سے خیال رکھوں گی۔“ وہ فوراً مان گئی تھی۔ عبدالہادی نے پیار سے اس کے ماتھے پر آئے ہوئے بال ہٹائے تھے۔ آج ام ایمن پر نجانے کیوں اتنا پیار آ رہا تھا، جیسے وہ کوئی پیاری سی گڑیا ہو۔“ ام ایمن بے ساختگی کی اس حرکت پر پتھر ہی تو بن گئی تھی کیا عبدالہادی مجھے پیار تو نہیں کرنے لگے مگر دوسرے ہی لمحے وہ وہ خود کو جھٹلا رہی تھی۔

رات کا کھانا وہ دونوں باہر ہوٹل میں کھا رہے تھے۔ وہ بھی ام ایمن کی پسند کا ایمن کو اس ایک مہینے میں ایسا فیل ہوتا تھا جیسے مرتضیٰ سے زیادہ عبدالہادی

اس کا خیال رکھ رہا ہے۔ ”آپ کو کسی سے محبت ہے۔“
 ”وہ ہادی کا اچھا موڈ دکھ کر دل میں کب سے
 چھپے سوال پوچھ ہی بیٹھی۔ ”ہاں ہے۔ ایمن کا دل
 دھڑکنے لگا۔ ”پوچھ سکتی ہوں کس سے.....؟“ اُم
 ایمن بس اتنا سمجھ لو کہ اس کی محبت نے ہی مجھے زندہ
 رکھا ہوا ہے اگر اس کی محبت بھی میری زندگی میں نہ
 آئی ہوتی تو کب کا عبدالبہادی کھوکھلے وجود کے
 ساتھ مر چکا ہوتا۔ میں سانس بعد میں لیتا ہوں پہلے
 اس کو یاد کرتا ہوں۔

”لیکن میں..... وہ جذباتیت میں کہتا کہتا
 رک گیا۔ ”کیا آپ وہ ہمہ تن گوئی۔“ میں بہت برا
 ہوں بہت..... اس دنیا کا سب سے بے وفا.....
 سب سے بد نصیب سب سے زیادہ ظالم.....“ وہ
 اعتراف کر رہا تھا اپنے دونوں ہاتھ سختی سے میز پر
 جما کر آنسو پلکوں سے نیچے آئے تو اس نے سر بھی
 جھکا دیا۔
 ”پلیز سوری عبدالبہادی.....“ وہ رو رہا تھا
 ایمن کا دل کٹنے لگا۔

ایمن محبت بہت بری چیز ہے یہ تو تم بھی جانتی
 ہونا.....؟“ جی بہت اچھی طرح جانتی ہوں۔“
 ایمن نے گہرے لہجے میں کہا۔ ”کیا اس لڑکی کا نام
 درشہوار ہے.....“ دھک دھک دل کے ساتھ
 وہ پوچھ رہی تھی۔

”نہیں..... نہیں..... تو۔“ نگاہیں چراتا ہوا وہ
 جھوٹ بول رہا تھا پر اُم ایمن سمجھ چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

ڈاکٹر نے عبدالبہادی کو پھر ایک مشکل میں
 ڈال دیا تھا ان کا کہنا تھا کہ اُم ایمن کو برین ٹیومر
 ہے اور وہ اس تیزی سے پھیل چکا ہے کہ اُم ایمن
 کے پاس صرف چند ماہ ہی باقی ہیں یہ خبر سننے کے
 بعد اس کو واقعی میں دکھ اور صدمہ ہوا تھا اُم ایمن

کے پاس گھر آتے ہوئے پتا وہ کتنی بار اپنی گیلی
 آنکھیں صاف کر چکا تھا۔
 گھر جا کر بہت محبت سے بولا۔

”ایمن ایک بات پوچھوں.....؟“ وہ کچن
 میں چائے بنا رہی تھی جی پوچھیں۔ ”اپنے گھر
 والوں سے ملنے کو دل کرتا ہے تمہارا.....؟“
 اُم ایمن نے ہاتھ میں پکڑا کپ بہ مشکل
 شیلف کر رکھا۔ اس کا وجود کپکپا رہا تھا۔ ”کیا
 ہوا.....؟“ کچھ نہیں..... نہیں کرتا۔“ وہ نگاہیں
 چراتے ہوئے بولی۔

”I am your Friend tell me“
 ”بہت کرتا ہے۔“ وہ مدہم سا بولی۔ ”واقعی.....؟“
 جی وہ بے ساختہ رونے لگی تھی۔ ”ارے یار میرا وعدہ
 ہے تم سے کل تمہیں تمہارے گھر لے کر جاؤں گا سب
 سے ملواؤں گا۔“ وہ یقین سے کہہ رہا تھا۔

”کیا.....؟“ وہ مجسمہ حیرت تھی۔ ”ہاں
 وعدہ ہے میرا اور عبدالبہادی کم از کم وعدہ نہیں
 توڑتا۔“ وہ شوخ لہجے میں بتا رہا تھا ایمن خوشی سے
 پاگل ہونے کو تھی۔

☆.....☆.....☆

اگلی صبح وہ دونوں چوہدری ہاؤس کی طرف رواں
 دواں تھے۔ دل دونوں کے ہی بہت تیزی سے ہی
 دھڑک رہے تھے اسی لیے دونوں ہی بالکل چپ
 تھے۔ گاڑی میں بلا کا سکوت طاری تھا۔ ”درشہوار کو
 یقیناً بہت بہت غلط مطلب نکالے گی وہ کیا سمجھے
 گی.....؟“ سوال دونوں کے ذہنوں میں ایک ہی
 اٹھ رہا تھا۔ ”میں کیسے سمجھاؤں گا اس کو۔ عبدالبہادی
 کی جان نکل رہی تھی۔

طویل سفر کے بعد وہ دونوں چوہدری ہاؤس کے
 سامنے ہی موجود تھے۔ عبدالبہادی نے گاڑی باہر ہی
 روک دی اور اتر کر ایمن کو بھی اترنے کو کہا۔ پورے

دینے والی درشہوار کے اوپر ہی تھیں۔ وہ اُم ایمن سے بہت پیار سے مل رہی تھی۔ سالوں کی جدائی ختم ہو تو انسان کے چہرے پر کتنی پیاری خوشی آتی ہے وہ آج دیکھ سکتا تھا اس وقت گھر میں صرف خواتین تھیں اور سب کی سب ہی مسرور تھیں۔ حتیٰ کے درشہوار بھی روتی ہوئی اُم ایمن کو چپ کر رہی تھی۔

اس وقت گھر میں سناٹا چھا گیا جب لہجہ ٹائم پر چوہدری حماد اور اُم ایمن کے والد چوہدری جواد آگئے وہ سب اسی طرح لیونگ روم میں ہی موجود تھے عبدالہادی سے ابھی تک کوئی سوال نہیں کیا گیا تھا۔ چوہدری حماد اور چوہدری جواد دونوں پتھر کے ہی بن گئے حیرت سے عبدالہادی اور اُم ایمن کو دیکھتے ہوئے کھڑے کھڑے رہ گئے۔

اُم ایمن ڈرتے ڈرتے اٹھی اور چوہدری حماد کے پاس آئی اور ان کے قدموں میں بیٹھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ مسز جواد منہ چھپا کر رو رہی تھیں۔ اگلے ہی پل انہوں نے اُم ایمن کو بازوؤں سے اٹھا کر گلے سے لگا لیا۔ معاف تو وہ اس کو اسی دن کر چکے تھے جس دن درشہوار کو نئی زندگی ملی تھی۔ چوہدری جواد نے اپنی پیاری سی بیٹی کو کتنے سالوں بعد دیکھا تھا۔ کتنی کمزور ناتواں لگ رہی تھی۔ جیسے وہ برسوں کی بیمار ہو۔ سب سے معافی مانگ رہی تھی اور رو رہی تھی گڑگڑا رہی تھی اس کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں میں پچھتاوا اعتراف سب شامل تھا۔

بے تحاشا جذباتی ماحول کے بعد کمرے میں اس وقت صرف سناٹا تھا مسز جواد بیٹی کو اپنے ساتھ کمرے میں لے جا چکی تھیں کمرے میں صرف گھر کے مرد تھے وہ کمرے کے دروازے میں قریباً چھپ کر کھڑی تھی اور سامنے صوفے پر بیٹھے عبدالہادی کو دیکھ رہی تھی۔ اس کا کچھ بھی نہیں بدلا

ساڑھے چھ سال بعد وہ اپنے گھر کا گیٹ دیکھ رہی تھی اپنے پیاروں کا گھر وہ دروازہ چوم رہی تھی۔ آنسو ایسے بہ رہے تھے جیسے آج ہی آنکھوں میں آئے ہیں۔ عبدالہادی اس کا ہاتھ تھام کر اندر لے آیا وہ بری طرح ڈر رہی تھی۔ جیسے سب اُس کو مار ڈالیں گے سب سنگسار کر دیں گے۔ ”نہیں مجھے نہیں جانا.....“ وہ کانپتی ہوئی پیچھے ہٹ گئی سامنے ہی کوریڈور تھا۔ اُم ایمن ہمت کرو۔ وہ اس کا حوصلہ بنا تھا۔ ”میں ہوں ناپیار سے تھکی دی۔“

اُم ایمن اس کے پیچھے چل کر لیونگ روم میں پہنچی تو چھ فٹ کے عبدالہادی کے پیچھے چھپی کسی کو ٹھیک سے نظر نہیں آئی۔ عبدالہادی دو تین ملی جلی آوازیں ابھریں تھیں۔ اور سب ہی اٹھ کر حیرت سے کھڑے ہو گئے تھے۔

اُم ایمن نے تیزی سے درشہوار کے کمرے کی طرف بھاگی تھی۔ عبدالہادی سے متانت سے سلام۔ جس کا جواب حیرت سے ہی ملا اُم ایمن کو کچھ بتائے بغیر کھینچ کر لیونگ روم میں لے آئی تھی۔ وہ مجسمہ بنی پھٹی پھٹی آنکھوں سے عبدالہادی کو دیکھ رہی تھی۔ یہ تو عبدالہادی ہے وہی عبدالہادی جس کو وہ بے تحاشا پیار کرتی تھی۔ آج وہ پھر اس کے سامنے تھے۔ پر کوئی اور بھی تو تھا لائٹ پر پل کلر کے لباس میں ملبوس ہادی کی اوٹ میں اس کی جانب ہادی کے سامنے سے بٹتے ہی اُم ایمن سب کو صاف صاف نظر آ رہی تھی ہر شخص ششدر تھا کنگ تھا۔

مسز جواد نے بے ساختہ جذباتی ہوتے ہوئے اُم ایمن کو گلے سے لگا لیا۔ ”میری بچی میری اُم ایمن.....!“ وہ شدت جذبات سے اس کو چوم رہی تھیں۔ جیسے برسوں کی تڑپتی ماما کو قرار مل گیا ہو اور پھر سب ہی اُم ایمن سے مل رہے تھے۔

عبدالہادی کی نگاہیں عشق میں اپنی ذات کو فنا کر

تھابس "آنکھیں" یہ بتا رہی تھیں کہ وہ کتنے کرب میں رہا ہے کتنا درد سہا ہے اس نے وہ یک ٹک اس کو دیکھے جا رہی تھی معاً چونک اٹھی۔

"تم سے ام ایمن کا نکاح کب اور کہاں ہوا.....؟" شاید وہ اپنی اور ام ایمن کی ہی کہانی سنا رہا تھا ان سب کو پر یہ کیسے الفاظ تھے جو اس کی سماعتوں پر دھماکے کرتے چلے گئے وہ لڑکھڑاتی گئی بمشکل دروازہ سنبھالا حیرت اور صرف حیرت سے وہ عبدالہادی کے جواب کی منتظر تھی۔

میرا نکاح ام ایمن سے تقریباً سات آٹھ ماہ پہلے ہوا ہے۔" سارے خواب ساری خواہشیں ساری خوشیاں ٹوٹ پھوٹ ہو گئیں کچھ دیر بعد ہی از سر بنا محل ایک با پھر ٹوٹ پھوٹ رہا تھا۔ شیشے کے نوکیلے ٹکڑے اس کے پورے وجود کے اندر پوست ہو رہے تھے۔ دل کٹ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے گرم پانی بہنے لگا وہ آگے کچھ بھی نہ سن سکی تیزی سے بھاگی اور اپنے کمرے میں گھس کر دروازہ لاک کر دیا۔

☆.....☆.....☆

عبدالہادی اپنے مقصد میں کامیاب ہو چکا تھا ایک زندگی سے بہت بہت دور جاتے ہوئے شخص کو زندگی دینا ہی تو اس کا مقصد تھا اور وہ اس میں کامیاب ہو چکا تھا یہ کامیابی ہی تو تھی کہ اپنے والدین کی شفقت و محبت سے محروم ام ایمن کو ایک بار پھر والدین کی محبت و شفقت میسر ہو گئی تھی اور یہ سب کچھ عبدالہادی کی وجہ سے ہوا تھا۔ پھر اس نے اپنے بارے میں بھی تو کچھ نہ سوچا تھا اور نہ ہی در شہوار کے بارے میں۔

جب سے وہ آیا تھا شہوار اپنے کمرے میں بند تھی کمرے سے باہر بھی آئی تو ایک بار بھی اس کے سامنے نہیں آئی تھی ام ایمن سے بھی ٹھیک طرح سے

بات نہیں کر رہی تھی وہ خود حیران تھی کہ ام ایمن جا کو وہ اپنا آئیڈیل کہتی تھی۔ اس سے اس قدر شدید جلن کیسے محسوس کر رہی تھی اور عبدالہادی سے تو جیسے نفرت ہو گئی تھی۔ وہ شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔

لیکن اس دن جب مسز حماد نے روتے ہوئے اسے بتایا کہ ام ایمن کو برین ٹیومر ہے اور اس کے پاس وقت بہت ہی کم ہے تو اس کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی وہ بے ساختہ سن کر رونے لگی۔

امی کیا کہہ رہی ہیں.....؟" "یہ سچ ہے۔" مسز حماد بے حد دکھ سے بولیں۔ اوہ اسی لیے سب نے فوراً معاف کر دیا۔ وہ بہت دور سے بول رہی تھی۔ شاید..... گہرا دکھ وہ دونوں ایمن کے ہی پاس آ گئیں۔

ایمن کو ابھی تک اپنی بیماری کا علم نہیں تھا۔ "آپی آپ یہاں آ کر خوش ہیں نا۔" وہ اس کے گلے میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئی۔ "..... در شہوار..... میری جان میری گڑیا کیسی ہو تم؟" ایمن نے اس کا ہاتھ چوم لیا۔

"ٹھیک وہ گلے لگ گئی کیوں ہوتا ہے ایسا کہ اتنے پیارے لوگ چلے جاتے ہیں بہت بہت دور..... یہ کیسی زندگی ہے کیوں ختم ہو جاتی ہے.....؟"

"وہ گلے لگ کر رو بھی رہی تھی اور سوچ بھی رہی تھی۔" کیا ہوا در شہوار؟" ایمن کو محسوس ہوا تو فوراً گلے سے ہٹا کر بولی۔ "کچھ..... کچھ..... نہیں آپی بس سوچ رہی تھی کہ اتنے دن آپ دور رہیں....." وہ متانت سے بات بدل گئی۔

"شہوار.....! کمرہ خالی ہوا تو ایمن نے پکارا۔" جی....." یہ تم نے اپنی کیا حالت بنا رکھی ہے کیا ہوا ہے تمہیں.....؟" وہ پیار سے پوچھ رہی تھی۔ "محبت بے ساختہ در شہوار کے لب ہلے۔" کیا.....؟ سچ.....

؟“ اُم ایمن نے تصدیق چاہی۔ ”..... سن..... نہیں.....
 بابا بابا.....“ وہ گڑبڑا کر مصنوعی ہنسی ہنس دی۔ ”آپی میرا
 نصیب اچھا نہیں ہے وہ زخمی لہجے میں کہہ رہی تھی۔ ”خبر
 دار آئندہ ایسا مت کہنا۔

بتاؤ مجھے وہ کون ہے تنبیہی کرتے ہوئے ایمن
 پوچھ رہی تھی بلکہ اپنا شک یقین میں بدل رہی
 تھی۔ ”آپی.....“ جی وہ شہوار سے قابو ہو کر گلے لگ گئی
 آپنی وہ بہت برا ہے میں اس سے محبت نہیں کرتی۔

”کتنا ٹوٹا ہوا انداز لہجہ جیسے تھکاوٹ اور دوراب
 حد پار کر گیا ہو۔“ کس سے عبدالہادی سے۔“
 ایمن نے اس کے بال سہلاتے ہوئے پیار
 سے پوچھا۔ ”جی.....“ وہ پیچھے ہٹی اور سنجیدگی سے کہہ
 کر کمرے میں چلی گئی۔

اُم ایمن کا دماغ گھوم رہا تھا پچھلے چار مہینے سے
 اس کے سر میں شدید درد رہتا تھا کبھی کبھی تو دل چاہتا
 تھا کہ دیوار سے ٹکریں مارے اور اپنا اور یہ درد دونوں
 ہی ختم کر دے۔ اور یہی کنڈیشن آج اس وقت ہو
 رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

اٹل میں یہ سب کیا سن رہی ہوں.....؟“ وہ
 دندناتی ہوئی کچن میں آ کر چلائی تھی۔ اٹل پاستا بنا
 رہی تھی مسکرا کر بولی۔ ”جو تم سالوں سے چاہتی تھی
 وہی سن رہی ہو۔“ میں اب ایسا کچھ بھی نہیں چاہتی
 کچھ بھی ”مائی ڈیر کزن یہ سب تو قسمت کے کھیل
 ہیں جب انسان جیتنا چاہے تو ہار مل جائے اور
 جب ہارنا چاہے تو جیت مل جائے۔ جو منشا الہی۔

اٹل پاستا باؤل میں نکال رہی تھی۔ ”پر اب
 ایسا نہیں ہوگا کیونکہ میں اب وہ در شہوار نہیں
 رہی۔“ وہ قطعی انداز سے کہہ کر کچن سے نکل
 گئی۔ آج وہ پورے دن گزرنے کے بعد گیٹ
 ہاؤس آ رہی تھی۔ جہاں عبدالہادی قیام پذیر تھا وہ

نہایت غصے اور طیش میں اس کے کمرے میں آئی
 تھی وہ بیڈ پر اداس لیٹا تھا مجھے آپ سے بات کرنی
 ہے انداز بہت سخت اور سپاٹ تھا۔

وہ حیرت سے دیکھتا ہوا اٹھ کھڑا ہوا۔ ”جی
 شہوار بولو۔

وہ حسب عادت محبت سے بولا۔ ”یہ کیا
 ڈرامہ ہے..... آپ کی نظر میں میں کھلونا ہوں
 ہاں!“ وہ درشتی سے دریافت کر رہی تھی۔ ”کیا میں
 سمجھا نہیں.....“ وہ لاعلمی سے بولا۔ ”مسٹر
 عبدالہادی میں آپ سے کسی بھی صورت نکاح
 کرنے پر راضی نہیں ہوں..... کیوں کہ میں نے
 اتنے بے حس ضدی اور پتھر جیسے انسان کے ساتھ
 کسی صورت پوری زندگی نہیں گزارنا چاہوں گی۔

آج وہ جیسے سب گلے شکوے نفرت بھرے
 انداز میں کرنے کا ارادہ کر کے آئی تھی۔ عبدالہادی
 نے تڑپ کر اس کی حقارت بھری نگاہوں میں دیکھا
 تھا۔ ”کیا سمجھتے ہو آپ ہاں جب چاہو گے در شہوار کو
 چھوڑ کر چلے جاؤ گے جب چاہو گے حاصل کر لو
 گے.....؟“ وہ جیسے عبدالہادی کو گوزوں سے مار رہی
 تھی وہ گونگا بن گیا تھا جیسے ”ایک بات اور مسٹر
 عبدالہادی۔“ ”آئی ڈونٹ نو اُم ایمن آپنی سے آپ
 نے شادی اپنی حسن پرستی کی وجہ سے کی ہمدردی کے
 تحت کی یا وقت گزاری کے لیے پر میں بتا رہی ہوں
 آپ کو۔“ وہ انگلی اٹھا کر جیسے وارننگ دے رہی
 تھی۔ ”ان کو اگر طلاق دی تو اچھا نہیں ہوگا۔

وہ آخری جملہ مکمل کر کے رکی نہیں تھی
 عبدالہادی سلگتے کونکوں پر ننگے پاؤں چل رہا تھا
 کیسے الفاظ تھے یہ کیسی باتیں تھیں اس کا وجود تار تار
 کر گئے تھے وہ سسک سسک کر رونے لگا۔

☆.....☆.....☆

”شہوار بیٹا کب تک زندگی کو اپنے مطابق

جینے کی خواہش میں اداس رکھو گی۔ کب تک دکھوں کو گلے کا ہار بناؤ گی کب تک.....؟“

اس وقت اس کے کمرے میں اس کے والدین کے علاوہ چوہدری جواد بھی تھے اور اس وقت وہ ہی اس سے مخاطب بھی تھے ”چھوٹے بابا تھک گئی ہوں زندگی سے۔“ وہ بے بس ہو چکی تھی۔ ”تو پھر کچھ خدا کی مرضی بھی قبول کر لو شہوار.....!“ چوہدری حماد پیار سے بولے وہ نظریں جھکا گئی۔ اس جمعے کو ہم تمہارا نکاح کرنا چاہتے ہیں اور یہ ام ایمن کی شدید خواہش ہے بیٹا کیا اس کی بات بھی نہیں مانو گی.....“ مسز حماد کی نگاہیں بھرا آئیں۔ ”پر یہ آپ پر ظلم ہو گا.....؟“ وہ ماننے کو تیار نہ تھی۔ اس کے نصیب میں جو کچھ تھا وہی ملا اس کو عبدالہادی تمہارا نصیب ہے شہوار۔“ چوہدری حماد نے قائل کیا۔

او کے میں آپ سے خود بات کرنا چاہتی ہوں۔“ وہ اٹھ کر ایمن کے پاس آ گئی۔ ”آپی! یہ کیا ہے کیوں کر رہی ہیں آپ ایسے.....؟“ وہ ایمن کے سامنے بیٹھ گئی تھی ایمن کی حالت بہت بہت ڈاؤن لگ رہی تھی۔ ”در شہوار مجھے زندگی میں ایک کام تو ایسا کرنے دو جو مجھے بہت بہت سکون دے سکے میں ہاتھ جوڑتی ہوں۔“ روتے روتے ہاتھ جوڑے تو شہوار تڑپ کر لپٹ گئی۔

شہوار مجھے پتا ہے میرے پاس زندگی باقی نہیں رہی مجھ سے سب چھپاتے پر مجھے ہر بات پتا ہے..... ام ایمن تڑپ تڑپ کر کرب بھرے انداز سے بولے جا رہی تھی اور شہوار کے اندر اتنا حوصلہ نہ تھا کہ اس کو دیکھ بھی سکے۔

جمعے کے دن عبدالہادی اور در شہوار کا نکاح ہوا تھا گھر میں چھوٹی سی تقریب رکھی گئی تھی عبدالہادی کی اکلوتی خالہ USA سے فوراً پہنچ گئی تھیں اور بہت خوش تھیں۔ وہ پنک کلر کے لہنگے میں ملبوس تھی

جبکہ عبدالہادی بلیک سوٹ میں ملبوس تھا۔ ایسا ہی ہوتا ہے انسان بھاگا بھاگا پھرے اپنا آپ برپا کر دئے دنیا کے پیر پڑ جائے پر جو چیز اللہ پاک نے جس وقت دینی ہوئی ہے اسی وقت ملتی ہے۔

ہادی نے سوچا بھی نہیں تھا کہ در شہوار مل جائے گی اور وہ بھی اس طرح وہ پلکیں جھکائے بیٹھی در شہوار کو محویت سے دیکھ رہا تھا۔ صد شکر انے اللہ پاک تیرا جتنا شکر ادا کروں کم ہے وہ دل ہی دل میں بے تحاشا شکرانہ ادا کر رہا تھا۔

☆.....☆.....☆

دکھ اور سکھ کا چولی دامن کا ساتھ ہے اور چوہدری ہاوس میں یہ بات بالکل سچ ثابت ہوئی تھی نکاح کی رات ہی ایمن کی طبیعت بہت زیادہ بگڑ گئی ہاسپٹل لے جایا گیا اور اگلے ہی دن وہ خالق حقیقی سے جا ملی جیسے قیامت صغریٰ ٹوٹ پڑی تھی ہر آنکھ اشکبار تھی ہر ذی روح شدید صدمے کی حالت میں تھا۔ نکاح کے بعد عبدالہادی پنڈی جا چکا تھا خبر سن کر وہ فوراً پہنچا تھا۔ اللہ پاک کے ہاتھ میں ہے سب کب کس کو بلا لے یہی زندگی کی حقیقت ہے انسان خود کو سونے کا بھی بنالے تو موت ایک منٹ میں مٹی کے ڈھیر میں بدل دیتی ہے۔ ہر طرف سوگ تھا ایک ایسی لڑکی جو شاید اپنے تمام گناہوں کی سزا دنیا میں ہی کاٹ گئی تھی۔

دو ماہ گزر چکے تھے چوہدری جواد نے خود چوہدری حماد کو کہا تھا کہ در شہوار کی رخصتی کر دیں اس کی خوشیوں کو ہم ترس گئے ہیں دھوم دھام سے شادی کریں در شہوار کے والدین کچھ جھجک محسوس کر رہے تھے پر سب نے ہی کہہ دیا تھا کہ شہوار نے جس قدر درد سہا ہے اس کو مکمل تیاری کے ساتھ رخصت کریں گے اور وہی ہوا اگلے ماہ اس کی رخصتی طے پائی۔

شادی کی ایک ایک چیز نہایت قیمتی اور سب کی

چہرہ ہاتھ سے اوپر کیا تھا عبدالہادی کی نگاہوں سے محبت ہی محبت ٹپک رہی تھی۔ ”شہوار میں تمہارا گنہگار ہوں چاہے جو بھی سزا دے دو لیکن یہ یاد رکھو میں محبت تم سے بے حساب کرتا ہوں میں تمہارے عشق میں پاگل ہوں وہ جذبات سے بھر پور لہجے میں بتا رہا تھا۔

شاید ام ایمن میری زندگی میں آئی ہی اس لیے تھی تاکہ مجھے تم سے پھر ملوا سکے۔ در شہوار میں آج اعتراف کرتا ہوں میں تم سے شدید پاک لازوال محبت کرتا ہوں۔“ وہ اس کے ہاتھ تھام کر وہ جوشیلے انداز سے بولا وہ ترس چکی تھی اس کی روح اس کی سماعتیں اس کا وجود کتنا پیاسا محروم تھا۔ وہ بے یقینی سے اتنے پیارے جملے سنی رہی۔ ”یہ تمہاری منہ دکھائی۔“ ایک سنہری بکس ہادی نے اس کی گود میں رکھا۔ در شہوار نے کھولا اور حیرت سے بول اٹھی۔

”یہ کیا عبدالہادی یہ سب تو.....“ جی یہ چوڑیاں یہ بندے یہ رنگ سب تمہارا ہے۔“ جو میرے پاس میرا سرمایہ تھا تمہارا اس ملتا تھا ان سے تمہاری خوشبو تمہاری کسی صورت سب.....“ وہ بتائے جا رہا تھا آپ بھی مجھے اتنی ہی محبت کرتے ہیں جتنی کہ میں آپ سے۔“ میں کتنی خوش نصیب ہوں ہادی وہ بے ساختہ اس کے کاندھے سے لگ گئی تھی۔ اللہ پاک کی رضا جب تھی ہم جب ملے مگر ہم راستے سے بھٹک جاتے محبت میں ملاوٹ کر دیتے تو ہم کبھی بھی نہ ملتے یہ سچ ہے عبدالہادی۔“ وہ خوشی سے سرور تھی آج جیسے شکر ادا کرنے کے لیے لفظ ہی نہیں مل رہے تھے۔ ”ہاں در شہوار محبت میں ملاوٹ کر لینے والے کبھی سرخرو نہیں ہوتے چاہے کچھ بھی کر لیں ہماری ہر صبح روشن ہے کیونکہ ہم اپنے حصے کا اندھیرا پیچھے چھوڑ آئے ہیں۔ باہر چاندنی مسکرا رہی تھی اور اندر وہ دونوں۔

☆☆.....☆☆

پسند سے خریدی جا رہی تھی۔ در شہوار چپ تھی وہ تیار یوں میں زیادہ تنقید یا پسندیدگی کا اظہار کم ہی کرتی تھی اور پھر وہ دن بھی آ گیا ریڈ کلر کی کرتی کے نیچے گرین لہنگا اور بلیو دوپٹہ اوڑھے وہ مہندی کے لیے تیار کھڑی تھی۔ پھولوں کی مکمل جیولری پہنے وہ کسی دوسرے دیس کی شہزادی لگ رہی تھی۔ ماشاء اللہ ماشاء اللہ ہر طرف یہی بازگشت تھی رسم جاری تھی کہ معادھما کے ہوئے تھے سب چونک گئے تھے۔ سفید کرتا شلوار پہنے وہ کسی دیس کا شہزادہ لگ رہا تھا۔ خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹ رہی تھی پر اس نے ایک نگاہ بھی شہوار پر نہیں ڈالی۔ اسٹیج پر شہوار کے پاس بیٹھا تو شہوار کا دل بری طرح دھڑکنے لگا وہ بے انتہا شرمناک رہی تھی۔ معاسب سے چھپا کر عبدالہادی نے بڑی سی چاکلیٹ اور سرخ گلاب اس کی گود میں رکھ دیا تھا وہ حیران رہ گئی۔

”مجھے نہیں چاہیے کچھ.....!“ وہ خفگی سے بولی۔ ”تو واپس کر دو۔“ وہ شوخ ہوا۔ ”اٹھا لیں۔“ وہ بہت خفا تھی۔ ”خود اٹھا کے دو نہ۔“ وہ شوخ ہوا آ کر وہ نظریں جھکا گئی۔

دلہن بنی وہ کوئی اسپر کوئی ملکہ حسن سے کم نہیں لگ رہی تھی۔ فیروزی لہنگا گولڈن کام کے ساتھ اس پر خوب ججا تھا پر جب عبدالہادی اسٹیج پر آ کر بیٹھا تو یہ کہنا مشکل ہو گیا کہ دلہن زیادہ پیاری ہے یا دولہا آج اس کو سب مل گیا تھا سب جس کے لیے وہ پاگل تھی۔ اپنی زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ پر ایک جملے سے تمام شکایتیں دور نہیں ہوئی تھیں۔

وہ بیڈ ریٹھی گلاب کی پتیوں کو ہاتھ سے مسل رہی تھی کتنا مشکل تھا یہ وقت کیسے سنبھالوں خود کو وہ بار بار اپنا چہرہ صاف کر رہی تھی۔ السلام وعلیکم!“ وہ آچکا تھا سامنے بیٹھ چکا تھا مخاطب ہو چکا تھا شہوار نے نگاہیں بیڈ پر جمادیں عبدالہادی بہت پیار سے اس کا

نگہت اعظمی

افسانہ

عمود کی چٹان

ایک جملے کے بعد ماما کے سامنے زمین اور آسمان گھومنے لگے تھے۔ ماما چکرا کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں اور بیٹھتے ہی ان کی نظر برابر میں کھڑی ہوئی افشین پر پڑی جس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔ اللہ کا راستہ آسان نہیں ہوتا۔ اس راستے پر.....

جب سے افشین نے ریمز کے رشتے سے انکار کیا تھا ماما جلے پاؤں کی بلی کی طرح کمرے میں پھر رہی تھیں جبکہ افشین اپنا فیصلہ سنا کر اپنے کمرے میں اے سی آن کر کے مزے سے محو استراحت تھی۔ سب



Downloaded From Paksociety.com

READING
Section

سے چھوٹی شازمین اپنے لپٹاپ پر فلم دیکھنے میں مصروف تھی۔ پاپا بھی گھر نہیں آئے تھے اب لے دے کرافٹین سے چھوٹی ماہین ہی رہ گئی تھی جو ماما کی ساری کڑوی کیسلی باتوں کو سن کر ان کی ہاں میں ہاں ملا رہی تھی۔

”غضب خدا کا۔ سراسر کفرانِ نعمت ہے۔ کیسا عمدہ رشتہ تھا۔ ہر لحاظ سے بہترین آخر کیا لگی تھی.....؟“

خوبصورت، پڑھا لکھا، نیک اچھا خاندان بھلا اب اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہوگا۔“

ماما چلتے چلتے تھوڑی دیر کے لیے رکیں تو وہ جو ماما کے ہر جملے پر ہاں کی گردان کر رہی تھی گڑ بڑا گئی۔ پتا نہیں ماما پوچھ رہی تھیں یا بتا رہی تھیں۔

”اور کیا اس سے اچھا رشتہ اور کیا ہوگا.....؟“ اس نے جلدی سے ماما کا آخری جملہ دہرایا۔

”وہ سمجھ رہی ہے کہ شاید اس کے لیے شہزادہ چارلس اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئے گا۔“ ماما کی پریڈ دوبارہ سے شروع ہو چکی تھی۔

”یہ سب تمہارا دادی کا کیا دھرا ہے بچپن میں ہر وقت ان کے پاس گھسی رہتی تھی۔ نہ جانے کیا بڑھاتی کیا سکھاتی رہتی تھیں خود تو اللہ کے گھر چلی گئیں اور ہم ان کی تربیت کا خمیازہ بھگت رہے ہیں۔ تمہارے باپ کو بڑا فخر تھا کہ ان کی ماں نے کیسی عمدہ تربیت کی ہے..... دیکھ لیا..... کیا خوب تربیت کی ہے.....؟ ماما سانس لینے کے لیے رکیں تو اس نے جلدی سے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں بہت خوب تربیت کی ہے۔“ اس نے ماں کی بات سمجھے بغیر ہی دادی کی حمایت کر دی۔

”آج کل لڑکیاں اپنے آپ کو کیسے سجا سنوار کر رکھتی ہیں اور اس میں نہ جانے کون سی بڑھی روح سا

گئی ہے کہ ہر وقت اپنے آپ کو چارگز چادر میں لپٹے رکھتی ہے میں تو حیران ہوں آخر بھابی کے گھر والوں نے اسے کیسے پسند کیا۔ ان کے خاندان میں تو اتنی اچھی اچھی لڑکیاں موجود ہیں ایک سے ایک دولت مند پڑھی لکھی۔ ماما ایک سیکنڈ کورکس تو اس نے وقت ضائع کئے بغیر فوراً ٹکرا لگایا۔“ اور ایک سے ایک ماڈرن کوئی بھی دوپٹہ نہیں اوڑھتی۔“

بھابی کا خاندان تو ہمیشہ سے ہی بہت پڑھا لکھا اور روشن خیال ہے وہ لوگ تو جدی پشتی رئیس ہیں۔ آج کل کے دولت مندوں کی طرح نو دو لیتے نہیں ہیں.....“ ماما کو فی الحال ان کے خاندان میں ڈھونڈنے سے بھی کوئی خامی نظر نہیں آ رہی تھی اور ماما تو ویسے ہی اپنی بھابی کے گھر والوں سے حد درجہ مرعوب رہتی تھیں اور خاص طور پر ان کے چچا کے گھر آنے سے جو ڈیفنس میں رہتے تھے اور جن کا آدھے سے زیادہ خاندان امریکہ میں رہتا تھا اور امریکہ میں رہنے والوں سے ماما کو اتنی عقیدت تھی کہ ان کے گھر میں کوئی امریکہ میں رہنے والا کوئی رشتے دار آجاتا تو ان کا بس ہی نہیں چلتا کہ اس کے سامنے اپنے گوشت کے کباب بنا کر پیش کر دیں۔

جب بھی ماما کو ان کے گھر کسی تقریب میں جانا ہوتا تو ان کی تیاریاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ اپنا سب سے بہترین جوڑا نکالتیں بالوں میں کلر گائیں موقع ملتا تو بیوٹی پارلر جا کر فیشل بھی کرا لیتیں اور جب مکمل کیل کانٹوں سے لیس ہو کر ان کے گھر جاتیں تو واپسی میں ہمیشہ ان کے لبوں سے ٹھنڈی ٹھنڈی آہیں برآمد ہوتیں۔

”بس جی اللہ کے کام ہیں کسی کو اتنا دیتا ہے کہ خرچ کرنے کا بہانہ تلاش کرتے ہیں اور کسی کو ساری زندگی ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑ کر

خرچ کرنا پڑتا ہے۔“ دوسرے قسم کے لوگوں میں اپنے آپ کو وہ شامل کرتیں۔

”کیسی باتیں کرتی ہو اللہ کا شکر ادا کرو ہزاروں لاکھوں سے بہتر ہیں۔“ پاپا کو ماما کی ایسی ٹھنڈی آہوں اور جذباتی، ڈائلاگز سے سخت چڑھی۔ ”ہاں بھی شکر تو کرتے ہیں کب ناشکری کی ہے۔ اس کی مرضی جس حال میں رکھے۔ ویسے کیسا جگر جگر ہو رہا تھا گھر کیا تھا محل تھا ہر چیز ایسے چاکمستی ہے جیسے ابھی ابھی بازار سے آئی ہے۔

ماما سارے راستے گھر کے قصیدے پڑھتی رہیں اور پاپا کا خون کھولتا رہتا۔

”پتا نہیں لوگوں کے پاس اتنا پیسا کہاں سے آجاتا ہے۔“

”بھئی ان کے چاروں بیٹے امریکہ میں رہتے ہیں دھڑا دھڑا ڈالر بھجوا رہے ہیں۔“ پاپا کلس کر کہتے۔

”آپ کے اندر تو آگے بڑھنے کی لگن ہی نہیں اگر آپ بھی جوانی میں کہیں باہر چلے جاتے تو ہم بھی اسی طرح عیش کرتے۔“ ماما کو اس عمر میں بھی پاپا کے باہر نہ جانے کا شدید قلق تھا۔

”اپنے وطن کی روکھی سوکھی بھی غیروں کے ترنوالوں سے بہتر ہے۔“ پاپا بھی وطن کی محبت میں عرق عرق ڈوبے ہوئے تھے۔

”یہ سب کتابی باتیں ہیں۔ کتابوں میں ہی اچھی لگتی ہیں اس دنیا میں عزت سے رہنے کے لیے پیسہ چاہیے۔ ماما اپنے موقف سے ایک انچ بھی نہ ہٹیں۔

”آپ سے تو بات کرنا ہی فضول ہے۔ آپ ہر چیز کو دولت کے آئینے میں دیکھتی ہیں۔“ پاپا جل کر یہ جملہ کہتے اور خاموشی اختیار کر لیتے اور اب یہ کیسی حیرت انگیز بات تھی کہ اس گھر کے سب سے چھوٹے

بیٹے رمیز کا رشتہ ان کی بیٹی افسین کے لیے آیا تھا۔ جس کا رنگ تو گندی تھا لیکن چہرے پر بلا کی کشش تھی پھر اس کی آواز اس قدر دلکش تھی کہ ہنسنے والا دم بخود ہو کر سنتا۔ وہ میڈیکل کے فائنل ایئر میں تھی اور میلادوں میں نعیتیں پڑھتی تھی۔ کچھ دن پہلے ماما کی بھابی کے چچا زاد بھائی کے گھر میلاد تھا وہیں رمیز کی والدہ جو دو دن پہلے امریکہ سے آئیں تھیں اور رمیز کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں انہیں میلاد میں نعت پڑھتی افسین اس قدر پسند آئی کہ وہ اگلے دن ہی ماما کی بھابی کے گھر پہنچ گئیں۔

”میں نے تو جب سے اس بچی کو دیکھا ہے میرا دل اس کی طرف کھنچا جا رہا ہے۔ چہرے پر کیسی معصومیت ہے مجھے تو رمیز کے لیے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔“ ان کے ایک ایک لفظ سے افسین کے لیے پسندیدگی جھلک رہی تھی۔

”آپ کو اندازہ نہیں آپ نے کس لڑکی کو پسند کیا ہے یہ لڑکی تو ہمارے خاندان کا ہیرا ہے۔ ایسی نیک، فرما بردار لڑکیاں آج کل ڈھونڈنے سے بھی نہیں ملتیں۔“ ماما کی بھابی بھی کیوں پیچھے رہتیں انہوں نے بھی دل بھر کے تعریفیں کرنی شروع کر دیں اور دو دن بعد ہی ان کو لے کر افسین کے گھر پہنچ گئیں۔ ماما تو انہیں دیکھ کر ہی ہونق ہو گئیں جبکہ ان کی بھابی نے رمیز کی والدہ کے جانے کے بعد ہی ماما کا نمبر ملا کر انہیں یہ خوشخبری سنائی تھی۔

”آپا کیا بتاؤں کیسا بہترین لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا، لائق، قابل نیک۔ ادھر ماما کو یہ سن کر ہی پسینے آنے لگے کہ وہ دو دن کے بعد ہی رشتہ لے کر آ رہی ہیں ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ وہ کس طرح اس گھر کی ہر شے کو بدل دیں ویسے ہی انہیں اپنا گھر بہت پرانا اور بوسیدہ لگتا تھا اور اب تو رمیز کے گھر والوں نے آنا تھا اور ان کے پاس صرف دو دن تھے۔ ان دو

دنوں میں ہی انہوں نے گھر کی حالت بہتر بنانے کے لیے اپنی جان کھپا دی۔ پورے گھر میں وائٹ واش کروانا تو ممکن نہیں تھا اس لیے ڈرائنگ روم میں کلر کروایا۔ نئے پردے لے کر آئیں۔ شکرے صوفہ لیدر کا تھا اسے صحن میں نکال کر سرف سے رگڑ رگڑ کر دھویا۔ قالین اچھا خاصا صاف تھا لیکن انہیں میلا میلا لگ ہا تھا اسے بھی باہر نکلا کر دھلوا دیا۔ پکھے ٹیوب لائٹس ڈیکوریشن پیمز ز جان لگا کر صاف کروائے گئے پھر ان کے ناشتے کے لیے جو فہرست تیار ہوئی اسے دیکھ کر پاپا چکرا کر رہ گئے۔ ”یہ لوگ افشین کا رشتہ لے کر آ رہے ہیں یا بارات لے کر آ رہے ہیں۔“

”کیا مطلب ہے.....؟“ ماما تو بابا کی حیرانی پر پریشان تھیں۔

”آپ اتنے مہنگے آسٹم ناشتے کے لیے منگوا رہی ہیں۔ اس میں تو چھوٹی موٹی بارات کے کھانے کا بندوبست ہو سکتا ہے۔“ پاپا نے بھی مبالغے کی حد کر دی تھی۔

تو کیا ان لوگوں کے سامنے چائے اور بسکٹ رکھ دوں.....“ ماما پاپا کے جملے پر تڑپ کر بولیں۔

”یہ کون کہہ رہا ہے کہ چائے کے ساتھ بسکٹ پیش کر دیں لیکن پز، رس ملائی، ملائی بوئی، پاستا، پیسٹری، اور..... جانے کون کون سی غیر ملکی آسٹم ہیں جنہیں آج میں پہلی دفعہ پڑھ رہا ہوں..... کچھ زیادہ نہیں ہو گیا.....“

پاپا آدمی لسٹ پڑھ کر ہی پریشان ہو گئے۔

”آپ ان کے گھر میلاد میں گئے تھے۔ وہاں نہیں دیکھا تھا کتنے قسم کے کھانے تھے گننا مشکل ہو رہا تھا۔“ ماما نے یاد دلایا۔

ہمارا ان سے کوئی مقابلہ نہیں..... ان کے پاس تو بہت پیسہ ہے۔“ پاپا یہ کہتے ہوئے متفکر ہو گئے۔

”ظاہر ہے ہم ان کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے لیکن اب وہ ہمارے گھر میں رشتہ جوڑنا چاہ رہے ہیں تو ہم

انے اب کو تھوڑا بہت تو ان کی سطح پر لانا ہوگا۔“ ماما کی بات میں کسی حد تک وزن تھا شاید اسی لیے پھر پاپا نے بحث نہیں کی اور لسٹ اٹھا کر باہر نکل گئے۔

جمعہ کے دن گھر میں صبح سے ہی ایسی ہلچل تھی جیسی پاکستان میں اوباما کے آنے پر ہونے کا امکان ہے۔ ماما دل ہی دل میں وہ الفاظ دہرا رہی تھیں جو انہیں رمیز کے گھر والوں کے سامنے بولنے تھے۔ پورا گھر آئینے کی طرح چمک رہا تھا۔ پھر بھی ماما کو کہیں نہ کہیں گرد نظر آ جانی اور ماما کا بلڈ پریشر ہائی ہونے لگتا۔ ماما کی وجہ سے پورا گھر ٹینشن میں تھا۔ بہر حال خدا خدا کر کے شام پانچ بجے رمیز کی والدہ اپنی بہن اور دونوں اور جیٹھانی کے ساتھ تشریف لائیں۔ رمیز بھی ان کے ساتھ ہی تھا سیاہ چمچاتی ہوئی گاڑیوں میں جب وہ لوگ آئے اور ماما نے کھڑکی سے دیکھا تو ان کو اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہو گیا۔

”آپ کی بیٹی بہت پیاری ہے۔ مجھے رمیز کے لیے ایسی ہی لڑکی کی تلاش تھی۔ رمیز کی والدہ کی رسمی گفتگو کے دوران افشین کے کمرے میں آئی تو اس کو گلے کر بڑے پیار سے کہا۔ وہ ہلکے پیازی کلر کے لان کے سوٹ اور اس کے ہم رنگ اسکارف میں بغیر میک اپ اور جیولری کے بہت فریش اور خوبصورت لگ رہی تھی۔ رمیز اپنی والدہ کے برابر بیٹھا تھا۔ اس نے اس کے داخل ہوتے ہی کھڑے ہو کر بہت مہذب انداز میں اسے سلام کیا۔ اور پھر سارا وقت وہ اپنی خالہ سے باتوں میں مصروف رہا۔ ایک آدھ بار ہی کنکھیوں سے اس نے افشین کو دیکھا تھا۔ افشین کو اس کا مہذب انداز بہت اچھا لگا۔ افشین کچھ دیر ان کے درمیان بیٹھی رہی اور پھر اٹھ کر چلی گئی۔

بہت پیاری بچی ہے۔ خدا اس کا نصیب اچھا

کرے افشین کے جانے کے بعد رمیز کی والدہ نے پھر اس کی تعریف کی۔

بڑی نیک اور پرہیزگار ہے۔ نماز روزے کی پابند اور پردہ تو اتنا کرتی ہے کہ کزنز کے سامنے بھی بغیر پردے کے نہیں آتی۔ ماما کی بھابی کو پھر افشین کی تعریف کرنے کے موقع مل گیا۔ وہ بہت پر جوش تھیں کہ سسرال اور میکے میں دونوں جگہ ان کا گراف اوپر جا رہا ہے۔

”اتنا سخت پردہ.....“ ان کی بات سن کر رمیز چونکا۔

”تو اور کیا۔“ یونیورسٹی بھی عبایا پہن کر جاتی ہے..... جب سے اس نے ہوش سنبھالا ہے کبھی عبایا کے بغیر گھر سے نہیں نکلی.....“ ماما کی بھابی کو کچھ زیادہ ہی جوش آ گیا۔

”واقعی آج کل کے دور میں اس طرح پردہ کرنا بہت مشکل ہے.....“ رمیز کی خالہ نے حیرانی سے کہا۔

”وہ تو اسکول کے زمانے سے کرتی آرہی ہے.....“ ماما کو بھابی کا یہ جملہ کچھ زیادہ ہی پسند آیا۔ وہ نہ خود پردہ کرتی تھیں نہ ان کی دونوں بیٹیاں اور نہ ہی انہیں افشین کا پردہ کرنا پسند تھا۔

”اصل میں میری ساس بہت بہت پرانے خیالات کی تھیں۔ افشین زیادہ تر انہی کے ساتھ رہی۔ اس لیے اس پر بھی ان کے خیالات کا اثر ہو گیا ہے۔ ورنہ ہم ہمارے خاندان میں تو اب کوئی بھی پردہ نہیں کرتا۔“ ماما نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

”مجھے تو ایسی ہی لڑکیاں پسند ہیں.....“ رمیز کی والدہ کے اس جملے پر ماما کی جان میں جان آئی اور ان کا بلڈ پریشر نارمل ہونے لگا۔

”آپ جلد از جلد ہمیں جواب دے دیجیے

گا۔ میری بہنیں اور میری نندیں اگلے ہفتے امریکہ جانے والی ہیں میں چاہتی ہوں ان کی موجودگی میں کوئی رسم ہو جائے۔“

رمیز کی والدہ نے جاتے جاتے رشتہ پکا کر دیا اور ماما پر گویا شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ ان لوگوں کے جانے کے بعد ماما کی بھابی نے پھر رمیز کی تعریفیں شروع کر دیں۔

”آپا کیا بتاؤں کیسا ہیرو لڑکا ہے۔ اس قدر قال، پڑھا لکھا اور اتنا نیک شریف۔“

”ہاں ہاں کیوں نہ اچھا ہوگا آخر تمہارے

خاندان کا ہے اور تمہارا خاندان تو ایسا لا جواب ہے کہ چراغ کے کر ڈھونڈنے سے بھی ایسے لوگ نہ ملیں۔“ ماما کا لہجہ شہد میں ڈوبا ہوا تھا انکا بس چلتا تو اپنی بھابی اور ان کے خاندان کے ہر فرد کی ڈاکو منٹری فلم بنا کر آسکر ایوارڈ کے لیے بھجوادیتیں۔

”آپا آپ نے کچھ نہیں سوچنا ہے بس فوراً ہاں کر دینی ہے۔“ بھابی کے لہجے میں بھی اپنائیت آخری حدوں کو پہنچی ہوئی تھی۔ شکر ہے پاپا وہاں موجود نہ تھے۔ اگر وہ ان کی گفتگو سن لیتے تو شاید سکتے میں آ جاتے۔

”کیسی باتیں کر رہی ہو تمہارے خاندان کا

لڑکا سے تم رشتہ لے کر آئی ہو۔ بھلا میں تم سے انکار کر سکتی ہوں لیکن تم اپنے نندوئی کو تو جانتی ہو کہ ہر رشتے میں اسی باریکی سے جانچ پرتال کرتے ہیں کہ سائنسدان لیبارٹری میں خلیوں کو بھی اسے نہ جانچتے ہوں گے۔“ ماما نے بی ایس سی کیا تھا۔ لہذا وہ وقتاً فوقتاً عام گفتگو میں بھی اپنے بی ایس سی ہونے کا ثبوت دینے کی کوشش کرتیں۔

”آپ بھائی جان سے صاف صاف کہہ دیجیے گا کہ اس رشتے میں کسی چھان بین کی ضرورت نہیں۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ

اور آدھے سے زیادہ خاندان امریکہ میں رہتا ہے۔“ ماہین نے فوراً ماما کی مدد کی تھی۔
آدھا کیا تقریباً پورا خاندان ہی امریکہ میں آباد ہے.....“

”لگتا ہے اگلے الیکشن میں او باما کی جگہ رمیز کے خاندان کا کوئی فرد ہی امریکہ کا صدر بنے گا۔“ پاپا کے اس جملے پر بڑی مشکل سے ماہین نے اپنی ہنسی روکی تھی۔

”آپ تو میری ہر بات کو مذاق میں اڑا دیتے ہیں..... آپ کو تو کسی بات کی فکر ہی نہیں..... میں ہی رات بھر جاگ جاگ کر ان کے لیے دعائیں کرتی ہوں۔“ ماما کا لہجہ بھرانے لگا تھا تو پاپا فوراً سنجیدہ ہو گئے۔

”ٹھیک ہے آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں لیکن فوری ہاں کرنا بھی اچھا نہیں لگتا۔ وہ لوگ سوچیں گے کہ ہم پر اپنی لڑکی بھاری تھی۔“

”یہ تو صحیح ہے لیکن آج کل اچھے لڑکے پر بھی ہر ایک کی نظر ہوتی ہے بھابی بتا رہی تھیں بہت بڑے بڑے گھروں کے لوگ آس لگائے بیٹھے تھے بس اللہ کا احسان ہے ان کی نظروں میں ہماری افسین سما گئی۔“ یہ حقیقت تھی کہ پاپا ماما کی طرح خوشی کا اظہار نہیں کر رہے تھے لیکن ان کے اندر خوشی ان کے ہر انداز سے ظاہر ہو رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

”تم ہی اسے کچھ سمجھاؤ یوں تو سارا دن سر جوڑے دنیا جہاں کی قصے کہانیاں سناتی رہتی ہو اب اتنے اہم مسئلے پر تم نے بھی منہ پر گوند لگا لیا ہے۔“ ماما کے گھٹنوں کا درد تھوڑا کم ہوا تو وہ پھر ٹہلنا شروع ہو گئیں اور اب توپ کے دہانے کا رخ اس کی طرف تھا۔

”میں نے سمجھایا تھا وہ نہیں مان رہی.....“

کی نیکیوں کا صلہ ہے۔ بھابی کا یہ جملہ ماما کے دل پر اس قدر لگا کہ بے اختیار ان کی آنکھیں بھر آئیں۔

”ہم گناہ گار کس قابل ہیں یہ تو اس پروردگار کا احسان ہے کہ اس نے ہمیشہ ہر خواہش کو پورا کیا۔“

دونوں اتنی دیر تک باتیں کرتی رہیں کہ وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ سند بھاوج کی ایسی مثالی دوستی دیکھ کر شیطان بھی بلبلا اٹھا ہوگا۔

☆.....☆.....☆

اب پتا نہیں تمہارے باپ سنیں گے تو ان پر کیا گزرے گی۔“ اتنی دیر ٹہلنے سے ماما کے گھٹنوں کا درد پھر سے شروع ہو گیا۔ وہ وہیں تخت پر بیٹھ کر گھٹنے دبانے لگیں۔

”ہاں پتا نہیں پاپا پر کیا گزرے گی.....“
ماہین کو ایکدم پاپا پر بے تحاشہ ترس آنے لگا۔

”بے چارے پتا نہیں کیا سوچے بیٹھے تھے سارے خاندان کو بھی بتا دیا تھا۔ اب انہیں کتنی شرمندگی ہوگی.....“ ماہین نے ماما کے اس جملے پر حیرانی نے ان کو دیکھا تھا پاپا نے کسی کو کچھ نہیں بتایا تھا بلکہ ماما نے رمیز اور ان کے گھر والوں کے جانے کے بعد خود ہی سب کو فون کر کے بتایا تھا جبکہ پاپا تو منع کر رہے تھے کہ ”اتنی جلدی ہاں کرنا مناسب نہیں ہے مانا کے دیکھے بھالے لوگ ہیں پھر بھی لڑکی کا معاملہ ہے سوچ بچھ کر جواب دینا چاہیے۔ اور ان کے اس طرح کہنے پر ماما نے فوراً کہا تھا۔“ مجھے تو یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس میں سوچنے سمجھنے کی کیا ضرورت ہے رمیز کو دیکھا نہیں کتنا خوبصورت ہے..... لوگ کتنے مالدار ہیں اور..... اور..... ماما کے پاس الفاظ کا ذخیرہ ختم ہونے لگا تو وہ فوراً ٹکنے لگیں۔

”وہ کیسے نہیں مانے گی اس کا تو باپ بھی مانے گا.....“ ماما کا پارہ ہائی ہو گیا کہ ماہین بری طرح خوفزدہ ہو گئی اس نے جلدی سے ٹھنڈے پانی میں لیموں اور چینی ڈال کر انہیں پلایا۔ اتنے میں پاپا بھی آگئے وہ ماما کی صورت کو دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ کوئی افارت ہوئی ہے۔

”کیا ہوا.....“ انہوں نے اشارے سے ماہین سے پوچھا۔

”افشین نے رمیز کے رشتے سے انکار کر دیا۔“ ماہین نے ماما سے نظریں بچا کر اشارے سے سمجھانے کی کوشش کی لیکن وہ بے چاری بھی اشاروں کی زبان کی ماہر تو نہ تھی اور نہ ہی اس نے گونگوں، بہروں کے اسکول میں پڑھا تھا۔ اس نے جو اشارے کیے پاپا سمجھے پڑوس کے گھر حافظ صاحب کے والد سوسال پورے کر چکے ہیں اس جہاں فانی سے رخصت ہو گئے۔

”بڑا افسوس ہوا.....“ اس دفعہ وہ زور سے بولے انہیں حیرانی تھی کہ حافظ صاحب کے والد کے انتقال پر ماما اتنے غصے میں کیوں ہیں.....؟“

”کیسا افسوس اور کہاں کا افسوس میں اتنی آسانی سے ماننے والی نہیں.....“ ماما نے غرا کر کہا۔

”پھر اب کیا ہو سکتا ہے ہم اللہ کی مرضی کے آگے تو کچھ نہیں کر سکتے۔“

”یہ اللہ کی مرضی ہے یہ اپنے ہاتھوں کا کیا دھرا ہے.....؟“

”ایسے کفر کے کلمات زبان سے نکالنے پہ اللہ کو برا لگے گا۔“ پاپا سمجھے کے حافظ صاحب کے والد کے انتقال نے ماما کے دماغ پر اثر کر دیا۔ ویسے بھی ماما ان سے بہت محبت کرتی تھیں اکثر ان کے لیے کھانے کی چیزیں بھیجا کرتیں وہ بھی انہیں

محبت سے میری بیٹی کہا کرتے تھے۔

”مجھے تو یہی سوچ سوچ کر ہول اٹھ رہے ہیں کہ میں خاندان والوں کو کیا جواب دوں گی۔“

کیوں.....؟ خاندان والوں کو کیا پڑی ہے کہ وہ آپ کے گھر آئیں اور آپ سے پوچھ گچھ کریں۔

”مجھ سے نہیں پوچھیں گے تو اور کس سے پوچھیں گے.....“ ماما کا پارہ بتدریج بڑھتا جا رہا تھا۔

”کیوں بھلا کیا آپ نے انہیں اس دارفانی سے رخصت کیا ہے؟ پاپا نے بھی جانے کیوں اس وقت اس قدر ادب زبان میں گفتگو کر رہے تھے۔ ماما اتنے شدید غصے میں تھی کہ ہمیشہ کی طرح پاپا کی بات سنے بغیر یہ سمجھیں کہ انہوں نے ان پر طعنہ زنی رخصت کی ہے۔

”ہاں، ہاں اگر وہ نہیں مانی تو یہ بھی کروں گی۔“ اماں غصے میں تنک کر بولیں ماہین عجیب مجمعے میں گرفتار ہو گئی اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ دونوں کس قسم کی گفتگو کر رہے ہیں۔

”کون نہیں مانی..... ان کی بہو.....؟“ پاپا سمجھے حافظ صاحب کی بیوی کیوں کہ ماما ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ ان کا سلوک اپنے سر کے ساتھ اچھا نہیں ہے اور وہ یہ چاہتی ہیں کہ اس کے سر جلد از جلد اس دنیا سے رخصت ہو جائیں تاکہ ساری جائیداد ان کے شوہر کے قبضے میں آجائے پاپا کو یقین ہو گیا کہ حافظ صاحب کی بیوی نے ہی اپنے سر کا خاتمہ کیا ہے تب ہی ماما اتنے غصے میں ہیں۔

”اف میرے اللہ خدا آپ جیسا دماغ کسی کو نہ دے.....؟“ کیا بہو کی مرضی کے بغیر کوئی اتنا بڑا فیصلہ کر سکتا ہے۔

”یہ تو آپ بالکل درست کہہ رہی ہیں یقیناً ان کی بہو اس معاملے میں شریک ہوں گی۔ اللہ رحم کرے کیسا دور آ گیا ہے۔ انسان کسی پر بھی بھروسہ نہیں کر سکتا۔ پاپا نے گلوگیر آواز میں کہا۔

مما آپ تھوڑی دیر کے لیے آرام سے بیٹھ جائیں پھر پاپا کو ساری بات تفصیل سے بتائیے۔“ ماہین نے تنگ آ کر مما کو بٹھانے کی کوشش کی۔ مما فوراً ماہین کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے بیٹھ گئیں لیکن بیٹھتے ہی جو گھٹنوں میں ٹیس اٹھی تو آواز سے درد کا اظہار ہونے لگا جسے سن کر پاپا شدید پریشان ہو گئے۔

”بھئی کیا بات ہے.....؟“ آخر حافظ صاحب کے والد کے انتقال پر تم اتنی کیوں افسردہ ہو رہی ہو کہیں وہ تمہارے پچھڑے ہوئے باپ تو نہیں تھے۔“ پاپا کا صبر کا میمانہ لبریز ہو چکا تھا۔

”کون حافظ.....؟“ کون سا پچھرا ہوا باپ..... ماہین مجھے بہت دنوں سے شک تھا کہ تمہارے باپ کے دماغ کو کچھ ہو گیا ہے یہ کئی دنوں سے ایسی بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، مما نے باقاعدہ ہچکیاں لے لے کر رونا شروع کر دیا۔ ماہین رحم بھری نظروں سے باپ کو دیکھنے لگی اسے افشین اور شازمین دونوں پر غصہ آ رہا تھا جو دونوں اپنے کمرے میں بند اپنے دل پسند مشغلوں میں مگن تھیں اور وہ اکیلی اس میدان کارزر میں مصلح کا کردار ادا کر رہی تھی۔

”یہ افشین کہاں ہے.....“ پاپا سمجھ گئے مما کو اختلاج کا دورہ پڑ گیا ہے اب افشین ہی انہیں سنبھال سکتی ہے۔

”اس کا تو نام ہی نہ لیں سب کچھ اسی کا کیا دھرا ہے۔“

اس دفعہ پاپا کچھ نہ بولے تو ممانے بالآخر

بات پوری کر دی..... ”اب اپ ہی اسے سمجھائیے کہ اتنی سی بات پر ایسے رشتے سے انکار کی کیا تکنتی ہے۔“

”تو کیا افشین نے رشتے سے انکار کر دیا ہے۔“ پاپا کی اردو گرامر اتنی اچھی نہ تھی وہ ماما کے In direct جملوں کو فوراً سمجھ جاتے لیکن سالوں سے ماما کے ساتھ رہتے ہوئے انہیں بھی ماما کی پہلیاں بوجھنے کی عادت ہو گئی تھی۔

”تو اور کیا.....؟ میں کیا اتنی دیر سے سقراط کے فلسفے پر بحث کر رہی تھی؟“

”مجال ہے کبھی کوئی بات سیدھی طرح کہہ دیجیے اچھا اب یہ بتائیے آخر اس نے انکار کیوں کیا.....“

”کوئی خاص وجہ نہیں ہے بس رمیز کو حجاب پسند نہیں ہے۔ ممانے اتنی اہم بات کو اتنا معمولی بنا کر پیش کیا کہ ایک لمحے کو پاپا بھی چکرا کر رہ گئے۔“ واقعی یہ اتنی بڑی بات تو نہیں ہر انسان کی اپنی اپنی پسند اور ناپسند ہوتی ہے۔ پاپا کو ویسے بھی حجاب یا پردے کے موضوع سے کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔

”یہی تو میں بھی کہہ رہی ہوں۔“ ماما پاپا کی شہ پا کر کچھ زیادہ ہی پر جوش ہو گئیں..... اور پھر دنیا جانتی ہے وہ سالوں سے امریکہ میں رہ رہا ہے اس کا ذہن کھلا ہوا ہے۔ وہ دقیانوسی خیالات کا مالک تو نہیں کہ بیوی کو پردے میں لپیٹ کر تماشہ بنا دے۔“

”آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں میں افشین کو خود سمجھاؤں گا۔“ پاپا بھی آج کل کے moderate ذہنیت رکھنے والے مسلمان تھے۔ جو اماں ابا نے سمجھا دیا تھا آج تک اسی پر عمل پیرا تھے نماز پابندی سے پڑھتے تھے۔ وہ بھی

اس عمر میں روزے بھی رکھتے تھے۔ گانے بجانے کو برا نہیں سمجھتے تھے پردے کو اچھا سمجھتے تھے لیکن گھر کی عورتوں پر زبردستی کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اسی لیے نہ مہر پروردہ کرتی تھیں نہ ماہین اور نہ شازمین بس افشین نہ جانے کس پر چلی گئی تھی کہ مکمل پردے میں رہتی تھی۔

”مجھے یقین ہے وہ آپ کی بات ضرور مانے گی۔“
 پاپا کی یقین دہانی پر ماما کی جان میں جان آگئی۔
 اسی رات پاپا نے افشین سے بات کی تھی۔
 ”مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے تم کھانے کے بعد میرے کمرے میں آ جانا۔“ کھانے کے وقت جب افشین ٹیبل پر برتن لگا رہی تھی پاپا نے اس سے کہا۔ وہ سمجھ گئی کہ پاپا اس سے کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔

کھانے کے بعد جب ماما عشاء کی نماز پڑھ رہی تھیں وہ ان کے کمرے میں آگئی۔
 ”تم نے رمیز کے رشتے سے صرف اس لیے انکار کیا ہے کہ اُسے حجاب پسند نہیں۔“ انہوں نے بغیر کسی تمہید کے بات شروع کی۔

”جی..... پاپا..... کیوں کہ اس نے کہلوادیا ہے کہ مجھے شادی کے بعد حجاب اتارنا ہوگا۔ اس کا لہجہ بے حد مضبوط تھا۔

”میرا خیال ہے یہ اتنی بڑی بات نہیں ہے جس پر اتنا اچھا رشتہ ٹھکرا دیا جائے۔“

”پاپا میرے نزدیک یہ بہت بڑی بات ہے میں کسی کے کہنے پر اللہ کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کر سکتی۔

”بیٹا یہ بھی تو ہو سکتا ہے تم ابھی اس کی بات مان لو اور بعد میں آہستہ آہستہ اپنی بات منوا لو.....“

”پاپا جس رشتے کی بنیاد میں شرط ہی اللہ کی

نافرمانی ہو وہ رشتہ کیسے پائیدار ہو سکتا ہے.....“
 افشین کی اس بات پر پاپا لا جواب ہو گئے۔
 بیٹا آج کل کے لڑکے اتنی گہرائی میں نہیں سوچتے اور سوچیں گے بھی کیسے انہیں کوئی سیدھا راستہ بتانے والا کوئی نہیں ہوتا۔ پاپا نے اسے قائل کرنے کی کوشش کی۔

انسان کی عقل اس کی سب سے بڑی رہبر ہے وہی اسے سچا راستہ دکھاتی ہے اور آج کل تو ایسا کوئی مسئلہ نہیں ہے سارے راستے آپ کے سامنے کھلے ہیں آپ جہاں سے چاہیں اور جو چاہے معلومات حاصل کر سکتے ہیں افشین اسکول کالج کے زمانے میں بہترین مقررہ رہ چکی تھی۔ اس کو قائل کرنا آسان نہیں تھا۔

بیٹا ان کے گھر کا ماحول بھی تو دیکھو ایسے ماحول میں بچوں کو کیا پتا دین کیا ہے؟ اور دین کے احکامات کیا ہیں.....؟ اور سچ پوچھو تو ہمارے گھر میں تمہارے سوا کس کو دین کا صحیح علم ہے؟ ہم لوگ بھی تو دین کی بنیادی تعلیمات سے واقف نہیں.....“

”لیکن ہاں مجھ پر پابندی تو نہیں ہے کہ میں اللہ کے راستے میں نہ چلوں آج ان کی یہ شرط ہے کہ میں حجاب نہ لوں کل وہ کہیں گے نماز پڑھنا چھوڑ دو..... پھر کیا ہوگا.....؟ پھر سب مجھے سمجھائیں گے کہ دیکھو شوہر مجازی خدا ہوتا ہے شوہر کا حکم مانو..... اپنے گھر کو بچاؤ۔ اور پھر میں شوہر کا حکم ماننے کے لیے اللہ کا حکم ماننا چھوڑ دوں گی۔ افشین کی تقریر سن کر پاپا کے پسینے چھوٹ گئے۔

”اچھا خیر ابھی جلدی میں کوئی فیصلہ نہ کرو اچھی طرح سوچ سمجھ لو.....“

پاپا کو اگے کچھ کہنا سمجھ میں نہ آیا تو جان بچانے کے لیے یہ جملہ بول دیا۔

بردار ہونے کو تیار نہیں تھیں انہیں رمیز کی اس شرط پر کہ وہ شادی کے بعد افشین کو حجاب نہیں لینے دے گا سخت اعتراض تھا۔ ادھر افشین کی مہارمیز کی حمایت کر رہی تھیں اور مہارمیز کی بھابی بی بی ہوئی تھیں رمیز کو سمجھاتیں اور کبھی افشین کو لیکن دونوں میں سے کوئی ایک بھی اپنے موقف سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھا۔

☆.....☆.....☆

رمیز اور اس کے سارے گھر والے امریکہ واپس جا رہے تھے۔ رمیز جانے سے پہلے اس سے ملنے اسپتال آیا۔ اس کی ایمرجنسی میں ڈیوٹی لگی ہوئی تھی وہ وہیں آ گیا وہ ایک مریض کا بلڈ پریشر چیک کر رہی تھی ایمرجنسی میں حشر کا منظر تھا ایک مریض اس دنیا سے کوچ کر گیا۔ دو افراد کوچ کرنے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ ایک ایکسڈنٹ کا کیس آیا ہوا تھا۔

آپ مجھے تھوڑا سا ٹائم دے سکتی ہیں وہ بلڈ پریشر لے کر پلٹی تو رمیز نے بڑے مہذب انداز میں درخواست کی حالانکہ اسے اس وقت یہ کہنا انتہائی نامناسب لگ رہا تھا۔ افشین نے بلڈ پریشر کا آلہ کیس میں رکھا اور اس کی طرف دیکھے بغیر بولی۔

”آپ کو تھوڑا سا انتظار کرنا پڑے گا اس وقت آپ دیکھ رہے ہیں کتنا رش ہے۔“

”نو پرابلم میں انتظار کر لوں گا.....“

رمیز کے جانے کے بعد اس نے دو مریض نمٹائے ایک کو ڈرپ لگائی تھی اور دوسرے کے بینڈیج کی تھی۔ پھر اپنی کولیک سے کہہ کر ایمرجنسی سے باہر آ گئی جہاں رمیز اس کے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ رمیز کو دیکھ کر اس کا دل بغاوت پر آمادہ ہونے لگا۔ چند لمحوں میں وہ دونوں کینے ٹیریا میں بیٹھے تھے۔ افشین اس وقت بھی اسکارف پہنے ہوئی تھی

”پاپا میں نے بہت سوچ سمجھ کر یہ فیصلہ کیا ہے اور یہ میرا آخری اور حتمی فیصلہ ہے وہ بالکل ان کی ماں کی طرح دو ٹوک بات کرتی تھی۔ ساری زندگی وہ ماں سے ڈرتے رہے اور ان کے سامنے کچھ بول نہ سکے اور اب بیٹی کے سامنے بالکل کنگ ہو گئے۔“

”واقعی ان کی بیگم ٹھیک ہی کہتی تھی اماں نے اسے بالکل اپنا جیسا بنا دیا ہے۔“ وہ پریشان ہو کر لاؤنج میں آئے تو بیگم نماز سے فارغ ہو چکی تھیں۔

”کیا ہوا..... وہ مان گئی..... انہوں نے بڑی امید سے پوچھا۔“

”فکر نہ کریں مان جائے گی۔“ فی الحال وہ سچ بولنے کی پوزیشن میں نہیں تھے۔

”مجھے پتا تھا لڑکیاں ایسے ہی کرتی ہیں ڈرا سا ڈرا ڈھکاؤ راضی ہو جاتی ہیں۔ بس دعا کریں اللہ خیر کرے۔ انہوں نے آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کی اور اٹھ کھڑی ہوئیں۔“

”تفصیل سے بتائیے کیا بات ہوئی وہ اتنی جلدی کیسے مان گئی.....“ وہ بھی ان کی اماں کی بہو تھی۔ پچیس سال ان کے ساتھ رہی تھیں۔

اور دونوں ساس بہوؤں میں سے کسی نے ہار نہیں مانی تھی۔ دونوں اپنے اپنے محاذ پر لڑتی رہی تھیں۔

”ابھی تو مجھے شدید نیند آ رہی ہے صبح بتاؤں گا.....“ پاپا یہ کہہ کر تیزی سے اپنے کمرے کی طرف چلے گئے اور ان کے داخل ہونے سے پہلے ہی خرائے لینے لگے۔

☆.....☆.....☆

افشین کے انکار کے بعد دونوں گھروں میں معرکوں کا آغاز ہو گیا۔ رمیز کی والدہ کو افشین اس قدر پسند آ گئی تھی کہ وہ اس رستے سے دست

لیکن اس وقت عبایا کی جگہ اس نے اوور آل پہنا ہوا تھا۔

”کیا آپ گھر میں بھی ہر وقت حجاب میں رہتی ہیں؟“ تھوڑی سی رسمی گفتگو کے بعد رمیز اصل موضوع پر آیا اس کا سوال سن کر افسین کو لگا وہ طنز کر رہا ہے یا اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔

”جی اگر گھر میں کوئی نامحرم ہو تو میں حجاب میں ہی رہتی ہوں۔“ اس کا لہجہ قدرے تلخ ہو گیا۔

”آپ کی ڈکشنری میں نامحرموں کی لسٹ میں کون کون سے افراد شامل ہیں؟ رمیز نے پوچھا۔

یہ تو آپ کو بھی معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام میں کس کو نامحرم کہا گیا ہے.....“

”میں عالم دین تو نہیں لیکن اتنا جاہل بھی نہیں جتنا آپ سمجھ رہی ہیں۔“ رمیز کو غصہ آ گیا۔

”ایسی بات نہیں مجھے کسی کو جاہل سمجھنے کا کوئی حق نہیں میں تو صرف آپ کے سوال کا جواب دے رہی تھی۔

میں آپ سے صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں..... رمیز کے اس جملے پر اس کا سارا خون سمٹ پر اس کے چہرے پر آ گیا۔

”جی..... جی.....“ وہ اس کے سامنے نظریں نہ اٹھا سکی۔

لیکن شادی سے پہلے میں کھل کر آپ کو یہ بات بتا دینا چاہتا ہوں کہ مجھے کیا پسند ہے اور کیا نہیں اور میں عورتوں کے معاملے میں بہت روشن خیال ہوں اور مجھے عورتوں کا اس طرح پردے میں رہنا بالکل پسند نہیں۔ آپ کو مجھ سے شادی کے بعد نارمل طریقے سے رہنا ہوگا۔ رمیز نے اپنی بات کی وضاحت کر کے اس کی طرف دیکھا۔

اسے لگا جیسے وہ پل صراط پر کھڑی ہے۔ اس

نے رمیز کی طرف دیکھا اس کی جان لبوں میں آگئی۔ اتنے خوبرو اور اسمارٹ لڑکے کو ریجیکٹ کرنا آسان نہیں تھا۔ وہ چند لمحوں کے لیے فیصلے کی سولی پر لٹکا دی گئی۔ فیصلہ کرنا کتنا مشکل کام ہے.....؟ آج اسے احساس ہو رہا تھا اروہ رمیز کی بات مان لے تو آئندہ زندگی بظاہر بے حد خوش رنگ اور خوشیوں کے پھولوں سے بھری رنگین نظر آ رہی ہے اور اگر وہ رمیز کی بات سے انکار کر دیتی تو مستقبل غیر یقینی تھا اچھا بھی وہ سکتا تھا اور برا بھی۔

”ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں۔“ اس نے دل ہی دل میں اس آیت کو دھرایا۔ یہ اس کی عادت تھی جب بھی وہ کسی مشکل میں گرفتار ہوتی تھی تو اس آیت کو دھرا کر اللہ سے مدد مانگتی۔

اور پھر اُسے فوراً اس کے ذہن میں سورہ احزاب کی 59 آیت کا ترجمہ گونجنے لگا جسے وہ آج کی صبح ٹی وی پر سن کر آئی تھی۔

اے نبی اپنی بیویوں، بیٹیوں اور مومن عورتوں سے کہہ دیجئے کہ وہ اپنی چادریں کو اپنے اوپر لے لیا کریں تاکہ پہنچانی نہ جائیں۔“

اسے لگا جیسے اللہ اس کو راستہ دکھا رہا ہے۔

”یہ ناممکن ہے.....“ اس نے بے حد مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

افسین کا یہ دو ٹوک جواب سن کر رمیز سکتے میں آ گیا۔ زندگی میں پہلا موقع تھا جب ایک عام سی لڑکی اسے ریجیکٹ کر رہی تھی ورنہ اب تک تو وہ جس لڑکی کی طرف ہاتھ بڑھاتا وہ مقناطیس کی طرح اس کی طرف کھینچی چلی آتی۔ وہ جھنجھلا گیا کیا آپ اپنے فیصلے پر نظر ثانی نہیں کر سکتیں.....“ اس نے پھر کوشش کی۔

”میں اپنے فیصلے بدلا نہیں کرتی۔“ اللہ کے حکم کو

سامنے رکھ کر وہ پہلے کی طرح بے خوف اور بولڈ بن چکی تھی۔ افشین کے اس جملے پر رمیز کو غصہ آ گیا وہ فوراً کھڑا ہو گیا۔

”میرا خیال ہے ہمیں اس Chapter کو Close کر دینا چاہیے۔“ رمیز کے اس جملے پر اسے لگا جیسے کسی نے اس کے جسم سے جان نکال دی۔

”آپ بہت اچھی ہیں اور میری دعا ہے کہ آپ کو آپ کی مرضی کا ساکھی مل جائے جو آپ کو بہت خوش رکھ سکے۔“

رمیز یہ کہہ کر چلا گیا۔ اور وہ نظریں جھکائے فرش کو دیکھتی رہی۔

☆.....☆.....☆

رمیز امریکہ چلا گیا ایک ماہ بعد ہی افشین کا ایک اور رشتہ آ گیا۔ لڑکا ڈاکٹر تھا۔ گھر انہ بہت دین دار اور مذہبی تھا۔ متوسط طبقے کے لوگ تھے لیکن لڑکا سکل و صورت کا بہت اچھا نہیں تھا۔ رنگ خاصا سانولا تھا اور قد بھی درمیانہ تھا۔ لیکن لڑکے کی شرافت اور قابلیت کو دیکھتے ہوئے پاپا نے یہ رشتہ اوکے کر دیا۔ جبکہ ماما کو لڑکے کی شکل و صورت پسند نہیں آئی ان کی نظر میں رمیز بسا ہوا تھا وہ ہر لڑکے کا اسی سے مقابلہ کرنے لگیں تھیں۔ اس رشتے کے لیے پاپا نے ماما کو بہت سمجھایا۔

حسن بہت اچھا لڑکا ہے سب سے بڑی بات یہ کہ وہ ڈاکٹر ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے مسائل کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے، اتنے اچھے رشتے کو ٹھکرانا کفرانِ نعمت ہے آپ رمیز کا خیال دل سے نکال دیجیے۔ افشین بہت نیک اور پرہیزگار ہے اس نے جو فیصلہ کیا تھا بہت سوچ سمجھ کر کیا تھا اور مجھے یقین ہے وہ بہت خوش رہے گی۔ اور یہ بھی سوچیے ماما اور شازمین بھی برابر کی ہو گئی ہیں ان کے رشتے بھی آرہے ہیں ہمیں ان کی بھی شادی کرنی ہے۔ پاپا

کے سمجھانے پر ماما بادل نخواستہ راضی ہو گئیں اور ایک ماہ کے اندر ہی افشین رخصت ہو کر حسن کے گھر آ گئی۔ وہ بظاہر بڑی خوش نظر آتی تھی لیکن نہ جانے ماما کو ایسا کیوں لگتا تھا وہ خوش ہونے کی اداکاری کرتی ہے۔

☆.....☆.....☆

رمیز کی شادی کی تیاریاں زرد شور سے ہو رہی تھیں ہر طرف خاندان میں شور تھا۔ آئے دن امریکہ سے کوئی نہ کوئی آرہا تھا بڑی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ فائیو اسٹار ہوٹل میں ولیمہ ہونا تھا۔ برانڈل ڈر۔ لمز سب سے بڑے بوتیک سے تیار کیے جا رہے تھے۔ جن کے بارے میں سنا گیا تھا کہ وہ لاکھوں کے تھے۔ نکاح پہلے سے ہو گیا تھا ان لوگوں کو صرف ویسے میں بلایا گیا تھا۔ ویسے کے دن ماما کی عجیب حالت تھی۔ بار بار بلڈ پریشر ہائی ہو رہا تھا وہ کبھی بلڈ پریشر کو کنٹرول کرنے کے لیے گولی کھاتیں کبھی ٹھنڈا پانی پی کر سنے کی جلن کم کرتیں۔

”اگر افشین اپنی ضد سے باز آ جاتی تو آج کس شان سے اس کا ولیمہ ہوتا۔“ ہوٹل میں داخل ہوتے ہی وہاں کی شان و شوکت دیکھ کر ماما کی زبان سے بلا ارادہ یہ جملہ پھسل گیا۔

”ماما پلیز اب آپ وہاں جا کر ایسی کوئی بات نہیں کیجیے گا۔“ ماما نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے سرگوشی کی۔

”اوہ نہ میری اماں مت بنو میرا جوجی چاہے گا وہی کہوں گی۔“

وہ سب ہال میں پہنچ گئے ہر چیز جگمگا رہی تھی سب کے چہرے خوشی سے چمک رہے تھے۔ ایک تو ویسے ہی رمیز کا خاندان بہت حسین تھا اور دوسرے پیسے کی چمک نے اور نور بکھیر دیا۔ رمیز کی والدہ ماما کے پاس آئیں۔ بہت اخلاق سے ملیں۔

”میں تو آپ کے پاس آنے ہی والی تھی.....“

”لڑکی کا گھرانہ بہت مذہبی ہے لڑکی اتنی باپردہ ہے کہ کزنز کے سامنے بغیر حجاب کے نہیں آتی۔“
 ”پر ریمز ایسی لڑکی سے شادی پر کیسے آمادہ ہو گیا اسے تو حجاب پسند نہیں تھا۔ ماما کے دل کا درد زبان پر آ گیا۔“

”بس آپ قسمت میں جو لکھا ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔“ ماما کی بھابی نجانے کس وقت ان کے برابر میں آ کھڑی ہو گئی تھیں۔
 ماما کی آنکھوں میں بے شمار سوال چل رہے تھے۔

”آپ آپ نے افشین کی شادی میں بہت جلدی کی۔ ریمز کے امریکہ جانے کے بعد جب اس نے اسلامک سینٹر جوائن کیا تو کچھ ہی دن بعد مجھے فون کیا کہ میں دوبارہ آپ کے پاس آؤں اور افشین کا رشتہ مانگوں۔ وہ اپنی شرط سے دستبردار ہو گیا تھا.....“

لیکن تم نے مجھ سے اس بات کا ذکر تک نہیں کیا۔“
 ماما کی آواز میں بے شمار سسکیاں گونج رہی تھیں۔
 کیسے ذکر کرتی۔ اس فون سے دو دن پہلے ہی افشین کا نکاح ہو چکا تھا۔“

ماما کی بھابی کے ایک جملے کے بعد ماما کے سامنے زمین اور آسمان گھومنے لگے تھے۔ ماما چکرا کر وہیں صوفے پر بیٹھ گئیں اور بیٹھتے ہی ان کی نظر برابر میں کھڑی ہوئی افشین پر پڑی جس کے چہرے پر مسکراہٹ تھی لیکن چہرہ لٹھے کی طرح سفید ہو رہا تھا۔
 اللہ کا راستہ آسان نہیں ہوتا۔ اس راستے پر چلنے والوں کو بہت کچھ کھونا پڑتا ہے اور اس وقت اس رنگ و نور سے جگمگاتی ہوئی محفل میں حجاب میں ملبوس اس معصوم سی لڑکی کو دیکھ کر کوئی بھی یہ اندازہ نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے کیا کھویا ہے اور کیا پایا ہے۔

☆☆.....☆☆

انہوں نے ماما کو گلے لگا کر کہا۔ ”میرے پاس.....“
 آپ کا شکر یہ ادا کرنے..... آپ کی بیٹی نے ریمز کو ہدایت کا راستہ دکھا دیا.....“ ریمز کی والدہ ماما کا ہاتھ تھامتے ہوئے جو کچھ کہہ رہی تھیں ماما کو مکمل سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

ریمز افشین کو راضی کرنے اس کے اسپتال گیا تھا اور اس کے دو ٹوک جواب انکار پر بہت دل برداشتہ ہو کر واپس آ گیا۔ اور پھر ہر چیز سے اس کا دل اچاٹ ہو گیا۔ پھر وہ فوراً ہی امریکہ چلا گیا۔ وہاں جا کر اس نے اسلامک سینٹر جوائن کیا اور بہت گہرائی سے اسلام کا مطالعہ کیا۔ خدا نے اسے ہدایت دی۔ اب وہ پکا مسلمان بن چکا ہے۔ ریمز کی والدہ کی گفتگو جاری تھی کہ ان کی بہن انہیں بلانے آئیں۔

ماجی ریمز اور اس کی دلہن آ رہے ہیں۔“ ریمز کی والدہ یہ سنتے ہی تیزی سے آگے بڑھیں اور ماما کا دل ان روشنیوں کے باوجود اندھیرے میں ڈوبنے لگا اور اس وقت تو ماما کو لگا جیسے ان کی سانس رک جائے گی جب انہوں نے دیکھا کہ دلہن ہال میں داخل ہوئی وہ عبایا میں ملبوس تھی۔ ہال میں داخل ہوتے ہی اس نے عبایا اتارا کیونکہ وہاں عورتوں اور مردوں کا حصہ بالکل الگ تھا عورتوں کے حصے میں فوٹو گرافر بھی عورتیں تھیں اور ویٹرز بھی۔ دلہن کا لباس بے انتہا خوبصورت تھا۔ ہلکے گلابی رنگ کے غرارے پر بہت قیمتی کام بنا ہوا تھا۔ شرٹ کی آستینیں کلائیوں تک تھیں۔ بال حجاب میں چھپے ہوئے تھے اور لباس کے اوپر وہ بڑا اور چوڑا دوپٹہ اوڑھے ہوئے تھے میک اپ بھی برائے نام تھا۔

”یہ سب کیا ہے دلہن حجاب اور عبایا میں۔“ ماما نے ماہین سے آہستہ سے کہا۔
 ”واقعی حیرت کی بات ہے ایسی باپردہ دلہن تو ہم نے کہیں نہیں دیکھی۔ کسی خاتون نے تبصرہ کیا۔“

چال

وہ جو بہت برانڈ کانش تھی اور میں صرف کانش اب اُسے کون بتاتا کہ وہ بھی ان گری ہوئی لڑکیوں میں شمار ہو چکی ہے جو صرف گوری چمڑی اور پالش کی چمک دیکھ کر دھوکہ کھا لیتی ہیں اور اپنی عزت تک کی پرواہ نہیں کرتیں۔ پھر جب میں نے اسے گھر آنے کے لیے کہا تو.....

”جب تمہیں پتا ہے دیر ہو جاتی ہے تو جلدی کیوں نہیں اٹھتیں۔ دو ہفتے ہونے کو آئے اور تمہیں عادت نہیں ہوئی جلدی اٹھنے کی۔“

مما کو میری جلدی مچانے پر غصہ آ رہا تھا اور غصہ بجا بھی تھا کہ کلاسز کا آغاز ہوئے کافی دن ہو چکے تھے اور میں ابھی بھی سستی دکھاتی تھی کالج کے لیے اٹھنے میں۔ ”اچھا کل سے جلدی اٹھوں گی..... دیکھیں وین آگئی اب میرا لچ بکس تیار کر دیں ناشتا رہنے دیں۔“ وین آگئی تھی اور مما کے گھورنے کی پرواہ کیے بغیر ان کے ہاتھ سے لچ بکس لے کر میں بیرونی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ ”اللہ حافظ مما۔“ مجھے پتا تھا کالج سے واپسی پر میری کلاس ضرور لیں گی۔

☆.....☆.....☆

یار تمہیں عجیب سا نہیں لگتا بچوں کی طرح روز نفن اٹھا کر آتی ہو۔“ راتھ کے لہجے میں ہلکی سی نا گواری تھی۔

تمہیں کیا تکلیف ہے میں ناشتا کر کے نہیں آئی

دوپہر میں ہونے والی موسلا دھار بارش کے اثرات ابھی باقی تھے۔

ٹھنڈی ہوا پتوں کی سرسراہٹ میں موسیقی پیدا کر رہی تھی اور چاند کی روشنی کھڑکی سے ٹکرا کر واپس وہیں رک گئی تھی۔ لیکن یہ خوابناک منظر میرے اندر بسی وحشت کو مٹانے میں ناکام رہا بلکہ دنیا کا کوئی حسین منظر یا لمحہ میرے دل کے صحرا کو سہرا بن نہیں کر سکتا تھا جب تک مجھے سکون نہ ملتا۔ اور اندورنی سکون تو نصیب والوں کو ہی ہوتا ہے اور میں یقیناً ابھی اتنی بھاگوں والی نہیں تھی کہ چاند کی چمک میری آنکھوں کو روشن کر پاتی یا ہوا کی تازگی میری روح کو شاد کرتی۔ ابھی تو ایک طویل مسافت مجھے طے کرنا تھی۔ جوکانٹوں اور پتھروں پر مشتمل تھی۔

مگر یہ خاک میں نے خود اپنے لیے اڑائی تھی۔ سو اپنے نصیب بھی میں نے خود ہی کالے کیے تھے۔ اور مکافات عمل تو اسی دنیا میں ہوتا ہے۔

☆.....☆.....☆

”مما! ناشتا..... دیر ہو رہی ہے۔“



Downloaded From Paksociety.com

READING SECTION



تھی اس لیے..... اور روز کب لاتی ہوں۔ عجیب لگنے والی کیا بات ہے، مجھے نہیں پسند کینٹین کی گھنٹیا کو لٹی کی چیزیں.....“

”اچھا بابا بس کرو، میری طرف سے بچوں کی پانی والی بوتل بھی ساتھ لے آیا کرو.....“ ٹھنڈی ٹھار پیسی کا سپ لیتی رات نے کہا تو مجھے ہنسی آ گئی۔ ”اچھا آئیڈیا سے کل سے لاؤں گی، یہاں کی دو نمبر بوتلیں تم جانے کیسی پی لیتی ہو.....“ میرے چڑانے سے وہ تپ ہی گئی، مگر کہا کچھ نہیں، ہم لوگ کیفے سے نکلنے والے تھے، جب ایک لڑکی نے ہمیں روک لیا۔ ”ایکسوزمی! کیا آپ میں سے کسی کہ پاس پانچ روپے کھلے ہوں گے ایچو لی کولڈ ڈرنک بیس روپے کی ہے اور میرے پاس صرف پندرہ روپے کھلے ہیں تو اگر.....“ وہ مزید وضاحت دینا چاہ رہی تھی مگر رات نے اسے پچاس روپے نکا کر پکڑا دیئے۔ ”ارے نہیں، نہیں اگر آپ کے پاس بھی نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں، وہ لڑکی اب شرمندہ نظر آ رہی تھی..... میں نے رات کو آنکھیں دکھائیں مگر وہ میری طرف دیکھتی تب نا۔“ کوئی بات نہیں، آپ کل لوٹا دینا۔“ رات نے کہا کہہ کر رکی نہیں اور میں اس کے پیچھے پیچھے کیفے سے باہر..... کیا ضرورت تھی اتنے پیسے پکرانے کی، نہیں تھے کھلے تمہارے پاس تو نہ دیتیں۔“ میں نے سرسری ساختگی کا اظہار کیا۔ ”خدا کا خوف کرو نقوی! وہ کوئی مانگنے والی تو نہیں تھی جو نہ دیتی اور کونسا میں نے اسے پچاس ہزار روپے دے دیے، پچاس روپے ہی تھے نہ۔“ رات نے سادہ سا انداز میں کہا تھا مگر مجھے لگا جیسے وہ مجھے سنا رہی ہے۔ ”اچھا یہ بتاؤ کچھ تیاری کی تم نے ایگزامز شروع ہونے والے ہیں اور ثناء بھی بتا رہی تھی کہ بس نایاب کے پاس ڈیٹ شیٹ بھی آچکی ہے۔“ میرے چہرے کے تاثرات کو دیکھے بغیر عام سے انداز میں اس نے اگلی بات چھیڑ دی۔

”کہاں یا را بھی کالج داخلہ لیے جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اور پیر سر پہنا چنے لگے ہیں۔“ پیرز کا سنتے ہی میرا حلق کڑوا ہو گیا۔ ابھی ٹیچرز نے کچھ خاص پڑھایا نہیں تھا اور ڈرم ٹیسٹ کا شیڈول ہر نوٹس بورڈ پر لگا دیا گیا تھا۔

خیر اب یہ بات نہ کرو دو جمعے تو گزر رہی گئے ہیں کالج میں آئے اور آٹھ کو بھی ٹو سے ملٹی پلائے کرو تو سولہ دن ہو گئے ہیں۔ بس اب مستیاں ختم رات نے میرے محاورے کی توڑ پھوڑ کی اور حساب کر کے مجھے مزید غصہ دلایا۔ اور اب مجھے دیکھتے ہوئے مزید گویا ہوئی۔ ”چلو تم یہ ٹیسٹ نہ دینا، کونسا فائنل ٹرم ہے ابھی ہم نے کچھ پڑھا تو ہے نہیں۔“ مجھے پتا تھا کہ وہ میرا مذاق اڑا رہی تھی دراصل ان سولہ دنوں میں رات نے میرے بارے میں کافی کچھ جان چکی تھی یہ بھی کہ پیرز سے میری بڑی جان جانی ہے، ایسا نہیں تھا کہ میں بہت نکلی اسٹوڈنٹ تھی، بس یہ جو اسکولز اور کالج میں ڈسمبر نومبر ٹیسٹ ہوتے ہیں۔ ان سے مجھے بڑی چڑ رہی تھی ہمیشہ۔ مجھے اصل مزہ فائنل ایگزامز کی تیاری کرنے کا ہی آتا تھا۔ اور میرے انہیں نادر خیالات کے پیش نظر رات نے مجھے چھیڑ رہی تھی۔

”نجر بیٹا اسٹڈیز کیسی چل رہی ہیں۔“

سیدھا پلیٹ میں موجود سناگا پورین رائس کے رائس اور اٹھتھی میں الجھی ہوئی تھی بابا کے مخاطب کرنے پر سیدھی ہو بیٹھی۔

”ٹھیک ٹھاک بلکہ فرسٹ کلاس۔“ میں نے جواب دیا۔

”اسٹڈیز تو چلتی ہی رہیں گی، آپ اسے اپنے طریقے سے سمجھالیں کہ ناشتا ٹھیک طرح سے کر کے جایا کرے، صبح لیٹ اٹھتی ہے اور دوپہر میں بھی صرف ایک چھوٹے سے لنچ باکس سے گزارہ کرتی ہے یہ محترمہ..... بہت پریشان کیا ہوا ہے اس لڑکی

نے مجھے۔“

بابا آج کافی دنوں بعد رات کے کھانے پر موجود تھے۔ سو ماما کو موقع مل گیا میرا شکایت نامہ سنانے کا۔“ ”فجر! میں کیا سن رہا ہوں؟“ بابا کا لہجہ ذرا سخت ہوا اور اسی سے مجھے ڈر لگتا تھا، ماما بھی میری کمزوری کا خوب فائدہ اٹھاتیں تھی۔ ”بابا میں بالکل ٹھیک.....“

آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو بمشکل پیتے ہوئے میں نے اپنی صفائی دینے کی کوشش کی، کہ شاید بابا کو ذرا احساس ہو مگر.....

”زیادہ آنسو بہانے کی ضرورت نہیں ہے فجر اپنی غلطی مان لیا کرو۔“ ماما نے لگتا تھا آج میرے خلاف کمر کس لی ہے۔ ”تمہاری ماما بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں فجر بیٹا، کیوں پریشان کرتی ہو اپنی ماما کو.....؟“

”آئندہ نہیں کروں گی۔“ پھنسی پھنسی آواز میں، میں نے توبہ کی جس سے پاپا کو تو اطمینان ہو گیا۔ ”Thats like A good girl“ مگر مجھے شدید غصہ آ رہا تھا ماما یہ اور میں بابا کے سامنے کھانا چھوڑ کر بھی نہیں جاسکتی تھی۔ احتجاجاً اپنا غصہ سنگاپورین رائس پر ہی اتارا.....

اگلے دن صبح میں جلدی اٹھی، بابا گھر پہ ہی تھے اور جب بابا گھر پر ہوتے تھے تو مجھے کالج چھوڑنے کی ذمہ داری بابا کی ہوتی تھی، جو بابا بڑے شوق سے نبھاتے تھے۔ ظاہر ہے میں ان کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی جو تھی۔ ”ہماری بیٹی ناراض ہے کیا۔“ بالآخر بابا کو احساس ہو ہی گیا۔ صبح اٹھنے سے چپ چاپ ناشتا کرنے اور بابا کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے تک کہ میں ناراض ہوں۔ میں خاموش رہی، کیونکہ نہ تو دھڑلے سے ہاں کہہ سکتی تھی اور جھوٹ بھی بولنا نہیں چاہتی تھی۔

”اگر ہاں تو بیٹا تمہاری ماما کا ناراض ہونا بھی بالکل بجا ہے۔ ناشتا نہیں کرو گی تو سارا دن کالج میں کیسے پڑھو گی۔ لنج میں ایک سینڈویچ یا چکن پیس سے کیا بنتا ہے۔ کچھ خود بھی تو احساس کرنا چاہیے نا آپ کو بیٹا۔“ بابا سمجھ گئے تھے کہ معاملہ سیریس ہے لہذا اپنا فرض پورے کر رہے تھے وہ، اور بابا کا انداز ایسا ہی ہوتا تھا کہ میں آرام سے اپنی غلطی مان لیتی۔ آئندہ نہ کرنے کا پکا عہد کرتی اور ماما سے بھی سوری کرتی۔ اب بھی یہی ہوا تھا کہ چپ چاپ میں نے سر جھکا لیا تھا، جس کا مطلب تھا I Admit And I am sorry اور بابا نے میرے سر پر ہلکی سی چپت لگائی۔

☆.....☆.....☆

موسم نے ذرا سی کر ڈٹ لی تھی۔ ہوا میں ہلکی سی خنک کی آمیزش نے گرمی کی شدت کو بری طرح مات دی۔ کالج جاتے ہوئے خالی دوپٹے سے گزرا کرنا ناممکن تھا۔ سو یونیفارم کے مطابق سبز شال بڑے شوق سے لڑکیاں اوڑھ کے آتی تھیں۔ مڈ ٹرم سے جان چھوٹنے پر پوری کلاس نے باہمی ہم آہنگی کے ساتھ ہفتہ بھر چھٹیاں منائیں اور اب کلاس روم میں مچھلی منڈی لگی ہوئی تھی۔ ہر لڑکی اپنے ہی قصے لے کر بیٹھی تھی یوں لگ رہا تھا جیسے شور کرنے کا یہ آخری موقع ہے، اس کے بعد ہر لڑکی کی زبان کاٹ کر پرنسپل کے آفس میں پہنچا دی جائے گی ہمیشہ کے لیے۔ سو سب لڑکیاں اس آخری سنہرے موقع سے خوب فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ ہم لوگ تو اکتا کر باہر آ گئے۔

”کیا خیال ہے فرنٹ گارڈن کی طرف چلیں۔“ بسمہ کو بہت شوق تھا پرنسپل کے آفس سامنے لگے خوبصورت پھولوں کے Selfies لینے کا۔ اور اب تو موسم بھی خاصا رومانٹک تھا۔ سو جھٹ سے اپنا خیال پیش کر دیا۔ ”ٹھیک ہے لیکن اگر آج مالی بابا

نے ڈانٹا تو تم میرے ہاتھوں سے بچ نہیں سکو گی۔“
 رات کو ساتھ ہی گرینڈ سیلفی کا واقعہ یاد آیا، جب بسمہ
 کی ضد پہ ہی پہلی بار ہم لوگ فرنٹ گارڈن کی طرف
 گئے تھے، بسمہ تو ہزار رنگ کے پھول دیکھ کر ہی پاگل
 ہو گئی، جھٹ سے اپنا موبائل نکالا اور کھٹا کھٹ
 تصویریں لینے لگی، خیال آیا تو کبھی مجھے رات کو اور طوبی
 کو کھینچ کھانچ لیا ساتھ، اور ابھی ہم ایک گرینڈ سیلفی
 لینے ہی والے تھے کہ طوبہ کے کندھے پہ کسی نے زور
 سے دھپ لگائی اس سے پہلے کہ وہ اس بوڑھے کو کچھ
 سنا پاتی، بسمہ کی بھاگو بھاگو کی گردان نے ہمیں بغیر
 سوچے سمجھے بغیر بھاگنے پر مجبور کر دیا۔ اب حال یہ تھا
 کہ وہ بابا ہمارے پیچھے اور ہم اُس کے آگے، اور
 جب اس کی بوڑھی ٹانگوں نے شاید بلکہ یقیناً بھاگنے،
 سے انکار کیا تو وہ وہیں کھڑا پشتو میں ہمیں خطابات
 سے نوازتا رہا۔ اور بعد میں جو بسمہ کی درگت
 ہمارے ہاتھوں لگی وہ علیحدہ۔

اور اب طوبی نے تو ساتھ جانے سے انکار ہی کر
 دیا۔ ارے بھئی! نہیں کچھ ہوتا۔ اس نے تمہارا کندھا
 ہی پکڑا تھا ہاتھ تو نہیں۔“ بسمہ کی بھی نرالی منطق
 تھی۔ ”تو تم کیا چاہتی ہو اب کی بار وہ میرا ہاتھ
 پکڑ لے، میں نہیں جا رہی..... تم لوگ جاؤ میں کیفے
 سے چائے پی لیتی ہوں تب تک۔“ طوبی بھی بضد
 تھی۔ ”اوہو یار! کیا ہو گیا ہے میں بچالوں کی جیسے
 پہلے بچایا تھا۔“ طوبی نے بسمہ کی طرف اور میں نے
 رات کو کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ مذاق کر رہی ہو، مگر
 بسمہ کے تاثرات ایسے تھے جیسے اگر وہ واقعی ہی اس
 وقت نہ ہوتی تو ہمیں زندان میں قید کر دیا جاتا، اس
 غلطی کی پاداش میں کہ ہم نے ملکہ کے باغیچے کے پھول
 توڑے تھے بغیر اجازت..... اور جب رحم دل
 شہزادی کو یہ بات معلوم ہوئی تو اس نے اپنی امی
 حضور سے درخواست کر کے ہماری جان بخشوائی۔

یعنی کہ..... حد ہے مبالغہ آرائی کی۔
 ”اب چلو گی تم لوگ یا کھڑے رہ کر ٹائم ویسٹ
 کرنا ہے؟“

بسمہ کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ ”ٹھیک ہے
 چلو، طوبی فکر کی کوئی بات نہیں ہے نا ساتھ۔“ میں
 نے بھی طوبی کو تسلی دی اور بسمہ کو چلیج۔

☆.....☆.....☆

”تو ماما کیسی لگ لگیں آپ کو میری فرینڈز؟ ذرا
 تفصیلاً تبصرہ فرمائیے گا۔“ ماما کچن میں مصروف تھیں،
 مجھے اچانک یاد آیا تو پوچھا، لیکن ماما کو شاید میری آواز
 نہیں پہنچی تھی۔ ”بتائیں نا کیسی لگیں میری دوستیں۔“
 ”صبر کرو لڑکی، ابھی فارغ نہیں ہوں، میں ذرا
 سا دھیان ادھر ادھر ہوا تو ہندیا لگ جائے گی۔ ماما
 نے دینی میں ڈوئی ہلاتے ہوئے کہا۔ ”ادفوہ! اتنی
 لمبی بات کی جگہ اگر آپ میرے سوال کا جواب دے
 دیتیں تو کیا ہو جاتا تھا۔“ میں نے جھنجھلائی ”ہاں بولو
 اب کیا پوچھ رہیں تھیں تم۔“ فریج سے دھنیا نکالتے
 ہوئے ماما نے کہا۔ ”نہیں اب آپ پوری طرح فری
 ہو جائیں پھر پوچھوں گی جو پوچھنا ہوگا۔“ آخری
 حصہ میں نے منہ بناتے ہوئے ادا کیا تھا۔

”اچھا بابا ہو گئی ہوں میں فارغ الوقت، بتاؤں
 اب تمہاری فرینڈ کیسی لگیں؟“ وہ صوفے پر بیٹھے
 ہوئے بولیں یعنی اب ان کے پاس بالکل فراغت تھی
 میری بات سننے کے لیے۔

”جی ارشاد۔“ میں بھی ہمہ تن گوش ہوئی۔
 سب اچھی تھیں ڈینٹ گرلز..... لیکن.....“ انہوں
 نے شرارتاً جملہ ادھورا چھوڑا یہ ان کی آنکھوں سے
 ظاہر تھا۔ ”کیا ماما صحیح طرح بتائیں نا۔“ میری بھی
 عادت تھی جب تک ماما سے ہر چیز خصوصاً اپنی چیزوں
 کے بارے میں تفصیلاً رائے نہ لیتی چھین نہیں ملتا، اور
 وہ بھی میری اس عادت سے بخوبی واقف

پسند نہیں تھا، اور مجھے تو ان لڑکیوں کو دیکھ دیکھ کر حیرانی ہوتی تھی جو جھنڈ کی شکل میں کینین کا رخ کرتی تھی اور وہاں کی بدمزہ گھٹیا چیزیں کھاتیں، میری رائے سے دوستی اس وجہ سے تھی کیونکہ اُس کا اکیڈمک ریکارڈ بہت زبردست تھا۔ وہ بلاشبہ ذہین اور نہایت ہی پُر اعتماد تھی، لیکن اس کا شمار کلاس کی غریب غریب لڑکیوں میں ہوتا تھا جو شکل سے بھی کم حیثیت ہوتی ہیں لیکن کلاس میں پھر بھی وہ نمایاں رہتی اپنے Confidance اور اچھے اخلاق کی وجہ سے، بس مجھے یہی ایک چیز چھبھتی تھی۔ اگر میری فرسٹ پوزیشن آتی تو رائے نے بھی سیکنڈ پوزیشن لی، اگر مجھے ڈرامہ کمپینیشن میں First Prize ملا ہے تو رائے نے سالانہ ڈیبیٹ Competition میں

Award جیت لیا۔ اس کا Life Style بالکل Low تھا مگر وہ پھر بھی کسی نہ کسی طرح میرے برابر آ ہی جاتی تھی بلکہ آہستہ آہستہ اُس نے میرے حق پر بھی قبضہ کر لیا۔ اور اسی بات نے مجھے ایک بے نام سے Complex میں مبتلا کر دیا اور میں چاہتے ہوئے بھی اپنے آپ کو اس سے نجات نہیں دلا پار ہی تھی۔ وہ دن بدن ناصرف کلاس میں بلکہ کالج میں بھی ہر دل عزیز اسٹوڈنٹ بنتی جا رہی تھی، یعنی میری جگہ لے رہی تھی، مجھے یاد ہے کالج کالامیں رائے کی ملاقات اس لڑکی سے ہوئی جس نے ہم سے پانچ روپے مانگے تھے اور رائے نے اُسے 50 روپے دے دیے تھے۔ اب وہ لڑکی رائے کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا رہی تھی۔

مجھے لگا وہ صرف بٹرنگ کر رہی ہے تاکہ رائے اس سے کہیں پیسے نہ مانگ لے اور جب میں نے اس خیال کا اظہار رائے سے کیا تو اُس نے میری بات کو چٹکیوں میں اڑایا، ”ارے نہیں، میری تو نیلیم..... اس لڑکی کا نام نیلیم ہے، سے کافی دوستی ہو گئی ہے، اکثری

تھیں” ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ طوبی ذرا Naughty ہے۔ بسمہ Clever اور ڈینٹ سی لگی مجھے۔“
 ”Clever بھی اور ڈینٹ بھی یہ تو کوئی میچ نہیں ہے۔“ بالکل ہے Clever ہونا اچھی بات ہے لیکن ایک حد تک اور Clever بندہ سو بر بھی ہو سکتا ہے۔ اور پہلے میری رائے سن لو پھر اعتراضات اٹھالینا اپنے۔“ اوکے next اور سب سے اچھی تو مجھ سے رائے لگ رہی تھی، تمہاری ہی طرح کیوٹ Well mannered اور Smart بھی، مگر پھر شرارتی انداز میں بولیں اور میں جو کب سے ماما کی بدلتی رائے پر اپنے چہرے کے تاثرات بھی بدل رہی تھی۔ آخری بات پر میرا منہ کھلا تو کھلتا ہی چلا گیا۔“
 رائے کیسے اتنی اچھی لگتی ہے آپ کو وہ تو اتنی غریب آئی میں بالکل سادہ سی ہے اور اُسے.....“ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ الٹا سیدھا بولتی ماما کی تنبیہی نظروں سے مجھے بالکل خاموش کر دیا اور میں ماما سے نظر ملائے بغیر اپنے روم کی جانب بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

رائے الجحت اور میرا تعلق بہت زیادہ پرانا نہیں تھا۔ ایف، ایس سی کلاس کے دوسرے روز ہمارا تعارف ہوا اور پھر رفتہ رفتہ یہ تعارف ہی دوستی میں بدل گیا۔ جس میں زیادہ ہاتھ رائے کا ہی تھا۔ پھر بسمہ جو کہ رائے کی اسکول فیلو بھی رہ چکی تھی اور طوبی بھی گروپ کا حصہ بن گئیں، طوبی واقعی ہی بہت شیطان اور نٹ کھٹ سی لڑکی تھی۔ ہر بات پر let it go ماما کہنے والی ہنس مکھ لڑکی اور میرا خیال تھا کہ ماما کو بھی طوبی سب سے زیادہ پسند آئے گی، مگر رائے کی تعریف سن کر مجھے کچھ عجیب سا احساس ہوا، شاید وہ میرے بنائے ہوئے اچھائی کے معیار پر پورا نہیں اترتی تھی، میں تو گھر سے اپنا اسپیشل لیچ بکس ہر روز ماما سے تیار کرواتی تھی کہ کالج کا کیفے مجھے بالکل بھی

”لیکن عام طور پر سب لڑکیاں شادی کے بعد اپنا سر نیم چینج کر کے Husband کا نام لکھتی ہیں آپ نے ایسا کیوں نہیں کیا؟“

”کہاں لکھا ہے کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔“
 ”مطلب؟“ ”بھئی یہ لوگوں کی اپنی ہی سوچ ہے کہ شادی کے بعد ہی فوراً ہی لڑکی کا سر نیم تبدیل کرتے ہیں ورنہ ایسا کرنا بالکل ضروری نہیں بلکہ مسلمان ہونے کے ناتمے کسی بھی شخص کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ کسی صورت اپنی ولدیت تبدیل کرے۔“

”Its so Strange“

”سٹریج تو ہوگا بیٹا ہمارے معاشرے کی روایات ہی اتنی پختہ ہو چکی ہیں کہ اب وہ مذہب کا حصہ معلوم ہونے لگیں ہیں۔“ وہ افسردہ لہجے میں بولیں۔ ”او آئی سی تب ہی تو ہمیشہ سے بکس میں عائشہ محمد ﷺ کے بجائے عائشہ صدیقہ اور فاطمہ علیؓ کے بجائے فاطمہ بنت محمد ﷺ لکھا ہوا ملتا ہے۔“ بات میرے سمجھ میں آ چکی تھی اور مجھے یہ بات بہت پسند آئی تھی۔

”بالکل۔“ ”ممانے تائیداً کہا۔“ ”وہ آپ کو اتنی Un common بات کس نے بتائی؟“

”یونیورسٹی میں پروفیسر تھیں مس اکرم ہم بھی یہی سمجھتے تھے کہ وہ ان میرڈ ہیں، تب ہی ایک دن بات سے بات شروع ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ وہ میرڈ ہیں اور اکرم ان کے والد کا نام ہے اور پھر یہ سب باتیں انہوں نے پوری کلاس کو بتائی اور جیسے تمہارے لیے حیران کن بات ہے، ہم بھی اتنے ہی معجب اور بے یقین تھے، لیکن ایک حدیث کے ذریعے انہوں نے ہمیں بات واضح کی تو دماغ کی تپاں تھلیں۔ اب تم یہ مراقبہ بند کرو، اپنی اسائنمنٹ مکمل کر کے سو جانا جلدی۔“ میں تو مزید سوال

ملاقات ہو جاتی ہے اس سے۔“

”اوہ! تو مجھے کیوں نہیں بتایا تم نے اس بارے میں۔“ مجھے حیرت ہو رہی تھی۔ ”اب میں اتنی چھوٹی سی بات تمہیں اسپیشلی بتاتی اور تم ویسے بھی دو دن سے غیر حاضر تھیں محترمہ۔“ اس نے عام سے لہجے میں کہا تو میں نے زیادہ بحث نہیں کی۔ ”اچھا چلو بسمہ، طوبیٰ کو بلاؤ چلتے ہیں اب میرے گھر ماما ویت کر رہی ہیں۔“ ایونٹ کے اختتام پر ان سب کا پلان میرے ساتھ میرے گھر چلنے کا تھا۔“

☆.....☆.....☆

”فجر بیٹا یہ فائل الماری میں رکھ دو۔“ ”ممانے غالباً اپنا کالم مکمل کر لیا تھا اینڈ والے پیپر پر شانلہ صدیق لکھا تھا۔“

جیسی مجھے ایک بات یاد آئی۔ فائل الماری میں رکھ کر میں ماما کے پاس ہی بیڈ پر بیٹھ گئی۔ ”ماما ایک بات پوچھوں؟“ ”کوئی سوال نہیں فجر جا کر اپنا پڑھو اور مجھے بھی آرام کرنے دو۔“ ”ماما آرام کی غرض سے لیٹیں تھیں، اس لیے میری بات سننے کے موڈ میں نہیں تھیں۔“ ”ماما پلیز بس ایک سوال پھر مجھے بھول جائے گا۔“ میں ابھی اپنے نام کی ایک تھی۔ ”اچھا جلدی پوچھو۔“ ”پوچھو بھی۔“ ”میرے یوہی خاموش رہنے پر ممانے جھنجھلا کر کہا۔“

”آپ ہر جگہ اپنے نام کے ساتھ نانا کا نام کیوں لکھتی ہیں؟“ میں ماما کے جتنے بھی کالمز اب تک دیکھے تھے اور آئی ڈی کارڈ بھی اس میں بابا کے نام کے بجائے نانا کا نام ہی ماما کے نام کے ساتھ ہوتا تھا، اور اب کافی عرصے بعد مجھے اس سوال کا جواب پانے کا موقع ملا۔

”کیوں کہ میرے والد کا نام ہی ہونا چاہیے میرے سر نیم کی جگہ۔“

جواب کے موڈ میں تھی، ماما کہ انداز پر ارادہ بدلنا پڑا۔ ”ٹھیک ہے شب بخیر۔“
 ”شب بخیر بیٹا، اور دودھ پی لینا یاد سے۔“
 آنکھیں بند کیے ماما نے یاد دہانی کرائی۔

☆.....☆.....☆

سردی کی شدت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سردیوں کی چھٹیوں کے کالج میں حسب توقع رش کم تھا۔ طوبی اور بسمہ بھی غائب تھیں۔ رات کو لائبریری میں بکس تلاش کر رہی تھی جبکہ میں گراؤنڈ میں بیٹھ کر کتاب میں ضروری ٹاپکس مارک کر رہی تھی۔ ”شکر ہے مل گئی Key book۔ رات کو دھپ سے گھاس پر بیٹھی۔“ ”کیمسٹری کی ملی؟“

”نہیں یار یہ اتنی مشکل سے ڈھونڈ پائی ہوں، بڑی بے کار لائبریری ہے ویسے اس کالج کی۔ تم نے کر لیا انڈر لائن سارا Chapter؟“

سارا چیپٹر کیسے کروں بس اہم ٹوپکس کی نشاندہی کی ہے ابھی، گھر جا کر تفصیل سے کر دوں گی۔“
 میں نے دھواں منہ سے خارج کر کے، گویا دھند کو دھند سے چیرنا چاہا۔

”ویری گڈ، کل پھر یہ بک میں لے جاؤں تمہاری ٹھیک ہے نا؟“ اس نے اجازت چاہی۔

”اوکے۔“ میں نے کندھے اچکائے۔ ”ارے ہاں..... وہ بیگ سے چس نکال کر کھا بلکہ کتر رہی تھی جب اچانک اس نے کہا۔“ آج میں تمہیں کچھ دکھاؤں گی۔“

”کیا؟“ میں نے دلچسپی سے پوچھا۔
 ”کیا نہیں پوچھو گے؟“ رات کو آج کافی خوشگوار موڈ میں نظر آ رہی تھی۔

”اچھا جی پوچھ لیا، اب بتاؤ گے؟“
 ”اپنے کزن کو۔“

”کیوں۔“ مجھے اچنبھا ہوا۔ ”کیوں کا کوئی

جواب نہیں ہوتا بس تم بتاؤ، آؤ گی گیٹ تک میرے ساتھ؟“ وہ اسی اطمینان سے پوچھ رہی تھی۔
 میں بھی چڑ گئی اُس کے انداز پر۔

”ایک تو تم بھی نا، بھئی میری خالہ آئی ہوئی ہیں ہماری طرف اپنے بیٹے کے ساتھ، اماں اور خالہ نے بازار جانا ہے بلکہ وہ لوگ چلی گئیں ہوں گی، بس میرا کزن۔ مجھے پک کرے گا، کیونکہ مجھے نہیں پتا وہ لوگ کون سی مارکیٹ گئے ہیں۔ حسن بھائی کے ساتھ ہی جانا تھا انہوں نے اور آج کالج بھی وہ مجھے ڈراپ کر کے گئے ہیں بس یا کچھ اور بھی بتا دوں اپنے سے بنا کر؟“ وہ بھی تب کرایک سانس میں بولتی چلی گئی اور میں خلاف توقع ناراضی سے گویا ہوئی۔“
 ”نہیں یہی کافی ہے، ٹھیک ہے بھئی میں دیکھ لوں گی۔“
 میں نے جواب دیا۔

”نہیں رہنے دو اب احسان کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“ وہ بالکل سنجیدہ تھی۔ ارے کہہ تو رہی ہوں ٹھیک ہے اب زیادہ نخرے کرنے کی ضرورت نہیں ہے، ویسے بھی تم پہ سوٹ نہیں کرتی ناراضگی۔“
 میں نے ایک Smiley کے اشارے سے اُسے کہا تو کچھ لمحوں بعد اس کے چہرے پہ بھی مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”ویسے حسن بھائی ہیں بہت اسمارٹ۔“

”اوہ تو حسن نام ہے آپ کے کزن بھائی کا۔“
 میں نے شرارتی لہجے میں کہا۔ اور رات کو الجھت نے کچھ غلط نہیں کہا تھا، میں بس اُسے دور سے دیکھ سکتی تھی، وہ صرف اسمارٹ نہیں تھا بلکہ بے حد وجیہہ شخص تھا۔
 میرے قریب سے نکلتے ہوئے رات کو نے میرے کان میں سرگوشی کی تھی۔ ”اس بات کا کسی سے ذکر مت کرنا۔“

☆.....☆.....☆

رات کو کے کزن سے میری ملاقات ہوئی تھی۔ کالج گیٹ سے وین تک کا راستہ میں نے رات کو

ہو، آپ چاہیں گے کہ یہ لمحہ بارہا آپ کی زندگی میں آئے، اور اس لمحے کو دوبارہ پانے کی چاہ میں نے بھی کی تھی۔ لیکن میری اس خواہش کی تکمیل اتنی جلدی اور اس قدر بھیا تک ہوگی یہ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن ویک اینڈ تھا، نانو کی طبیعت پچھلے دنوں کافی خراب رہی تھی سو ماما کا روزانہ ان کی طرف چکر لگتا تھا۔ آج میں اور بابا بھی ماما کے ساتھ گئے، نانو واقعی بہت نحیف اور لاغر نظر آ رہی تھیں، مگر مجھ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں، ڈھیروں دعائیں دے ڈالیں۔ مجھے تھوڑی شرمندگی ہوئی کہ انے عرصے سے وہ بیمار ہیں مگر میں انہیں دیکھنے نہیں آ سکی اور دعائیں تو مجھے ان کے لیے کرنی چاہیں۔ پھر کچھ دیر رُک کر ہم لوگ واپس آ گئے۔ مجھے اسائنمنٹ مکمل کرنا تھا اور پہلے سے زیادہ محنت کرنا تھی، پتا نہیں کیوں پچھلے کچھ عرصے سے اسائنمنٹ اور پریزنٹیشن میں وہ گریڈز برقرار نہیں رکھ پارہی تھی، پوری کوشش اور محنت کے باوجود میں سیکینڈ نمبر پر آ رہی تھی، کالج ٹیسٹ میں بھی یہی صورتحال تھی، حالانکہ ان سب چیزوں میں ہمیشہ مجھے بونس مارکس ملتے رہے تھے۔ یہ بھی ایک علیحدہ پریشانی تھی۔ پھر اسٹڈی سے فارغ ہو کر نجانے کب رات کے کزن کے بارے میں سوچنے لگی، کہیں نہ کہیں لاشعوری طور پر مجھے اُمید تھی کہ کل رات ضرور اپنے کزن کا ذکر کرے گی۔ ایسی کوئی بات کرے گی جس میں میرا بھی ذکر ہو، اور رات نے یہ بھی تو کہا تھا کہ میں اس بات کا کسی کو نہ بتاؤ، تو یقیناً کوئی خاص بات ہوگی۔“ اور خاص بات تو واقعی ہی تھی مگر میری سوچوں کے بالکل برعکس۔

☆.....☆.....☆

اور حسن کے ہمراہ طے کیا تھا، میں اس کی آنکھوں میں دیکھنے کے لیے دانستہ طور پر گریز کر رہی تھی جب اس نے مجھے اچانک اپنی نظروں کے حصار میں لیتے ہوئے کہا۔ رات آپ کا اکثر ذکر کرتی ہے۔“

اور میری ہارٹ بیٹ معمول سے زیادہ تیز ہوئی، مگر میں نے اپنے چہرے پر کچھ عیاں نہ ہونے دیا اور رات سے مل کر وین میں بیٹھ گئی۔ پورے چاند والی رات بھی عجیب سحر سا پھونک دیتی ہے ماحول پر..... کچھ رات کے کزن سے ملاقات کا کمال تھا کہ مجھے ہر شے غیر معمولی محسوس ہو رہی تھی، آج دھند نہ ہونے کے برابر تھی لیکن خنک ہوا میں کافی پینے کا اپنا لطف تھا اور پھر اس جملے کی تکرار نجانے کیوں بار بار میرے ذہن میں گونج رہی تھی۔“ رات آپ کا اکثر ذکر کرتی ہے۔“ اس نے کچھ ایسی انوکھی بات بھی نہیں کی تھی۔ نہ ہی میری خوبصورتی کی تعریف کی تھی لیکن پھر بھی میں اسے لاشعوری طور پر سوچنے پہ مجبور محسوس کر رہی تھی خود کو.....“

میں نے شاید زندگی میں پہلی بار کسی خوبصورت لڑکے کو وہ بھی اتنے قریب سے دیکھا تھا۔ ورنہ میرے ننھیال میں تو میری ہی ہم عمر لڑکیاں تھیں اور ان سے بھی چھوٹے چھوٹے کزنز۔ بابا اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھے، میری طرح، سو بسھی کسی لڑکے سے براہ راست ملاقات کا کوئی واقعہ نہیں ہوا تھا، اور اب جب یہ رونما ہو گیا تو دل میں عجیب سا احساس جاگ رہا تھا۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے اگر کوئی چیز آپ نے زندگی میں پہلی بار دیکھی ہو یا کوئی واقعہ فرسٹ ٹائم پیش آئے تو پھر یا آپ اُسے بالکل Dislike کریں گے یعنی پہلی بار ہونے کے بعد آپ دوبارہ اس واقعہ کی نوبت نہیں آنے دیں گے یا پھر وہ چھوٹا سا لمحہ آپ کو اپنے سحر میں جکڑ لے گا، خصوصاً جب دوسرے لوگوں کے لیے وہ نارمل بات

میری امیدوں کے برعکس راتھ نے کوئی بات نہیں کی تھی، پھر لگا تار لیکچرز نے یہ بات بھی یکسر بھلا دی۔ مگر زیادہ دن میں اپنے بچس پر قابو نہیں رکھ پائی۔“

”تم راتھ کے کزن کو جانتی ہو؟“ لائبریری سے نکلتے ہوئے میں نے بسمہ سے پوچھا، بس میں یہ جاننا چاہتی تھی کہ راتھ نے واقعی ہی یہ بات مجھ سے ہی شیئر کی ہے یا ہو سکتا ہے اس نے سب کو بتا کر اس بات کو راز رکھنے کا بھی کہا ہو۔

”کون سا کزن؟“ بسمہ کتاب بیگ میں ڈال رہی تھی۔ ”بے ایک کزن آج کل وہ اسی کے ساتھ کالج آتی جاتی ہے، دونوں کا فیئر ہے آئی میں وہ دونوں Involved ہیں.....“ میں نے جان بوجھ کر بات چھوڑی۔

”تم حسن کی بات کر رہی ہو؟“ اس نے تصدیق چاہی گویا وہ پہلے سے جانتی تھی۔ مگر اس کے اگلے انکشاف نے مجھے سکتے میں ڈال دیا۔

”ہاں مگر تم کیسے جانتی ہو؟“

”ارے اُس نے خود ہی بتایا تھا، میں اس کی مستغنی ہونے والی ہے اگلے ماہ۔ بلکہ بات پکی ہو گئی ہے“

میں کچھ بول نہ سکی۔ ”اور تم کس طرح بات کر رہی ہو راتھ کے بارے میں..... تمہیں معلوم نہیں تھا اس بات کا۔“ انتہائی ذلت کے احساس نے مجھے گھیر لیا، ”چلو اب“ مجھے خاموش دیکھ کر اس نے کہا اور آگے بڑھ گئی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن میں کوشش کے باوجود کالج نہیں جا سکی، میں اتنی کمزور اور بزدل ہرگز نہ تھی کہ اتنی سی بات کو دل سے لگا لیتی اور منہ چھپائی پھرتی۔ مگر میری عزت نفس مجروح ہوئی۔ مجھے اس بات کا دکھ نہیں تھا

اس اس نے سب کو بتانے کے باوجود مجھے بتانے سے منع کر دیا، اہم بات یہ تھی کہ اس نے مجھے مستغنی کے بارے میں نہیں بتایا تھا، اس نے میرے سامنے یوں ظاہر کیا تھا کہ جیسے وہ اس کے بڑے بھائی کی طرح ہوں، مجھے جو یہ خوش فہمی تھی کہ راتھ نے اپنے اسمارٹ سے اس کزن کا صرف مجھ سے کیا ہے..... اور..... اور میں نے جو فرمودات راتھ کے حوالے سے بسمہ کے سامنے بیان کیے تھے بہت ناممکن تھا کہ وہ من و عن و لیے ہی سب کچھ راتھ سے جا کر نہ کہہ دیتی، مگر مجھے اس بات کی بھی فکر نہیں تھی۔ اس نے مجھ سے جھوٹ نہیں کہا تھا مگر سچ کو چھپایا تھا اگر وہ مجھے اپنے کزن کے رشتے کے بارے میں بتا دیتی تو بسمہ لوگ تو یقیناً مجھ سے پہلے حسن کے بارے میں جانتیں تھیں، میری انا کو نہیں پہنچی تھی۔ ایک چنگاری سی میرے دل میں لگنے لگی تھی۔ غصہ، حیرت اور کہیں نہ کہیں حسد کے احساسات نے مجھ پر وار کیا تھا۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ راتھ نے ایسے کیوں کیا؟ زندگی اکثر موقعوں پر انسان کو اس کی اوقات یاد دلاتی ہے جسے وہ ہمیشہ بھول جاتا ہے۔

میرا خیال تھا کہ راتھ اس بات پر مجھ سے ضرور استفسار کرے گی اور میں بھی اس کے انتظار میں تھی تاکہ اس چپکے سے ماری گئی اینٹ کا جواب پتھر سے دوں لیکن ایسا کچھ نہ ہو سکا۔ اس نے مجھے کوئی اس قسم کی بات نہ کی وہ میرے ساتھ بالکل نارمل تھی، جیسے کچھ بھی نہ ہوا ہو، میری اس کے کزن سے ملاقات نہ اس کی اپنے کزن سے مستغنی اور اسی خاموشی نے مجھے مزید تپا دیا تھا۔

میں بس کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھی جسے راتھ کے خلاف استعمال کر سکوں۔ وہ جتنی ٹھنڈے مزاج اور صلح جو طبیعت تھی اتنی ہی زیادہ اسمارٹ تھی۔ اس بات کا اندازہ مجھے ہو رہا تھا۔ اور جلد ہی مجھے یہ

موقع مل گیا۔

”اوہ فجر میں اپنا رجسٹر کلاس میں بھول آئی ہوں پلیز تم جا کر لے آؤ میں سینٹر سے نوٹس کا پتا کرتی ہوں۔“

”کیا ہے راتحہ اب میں دوبارہ اتنی دور کلاس میں جاؤں۔ فجر نے جھنجھلاتے ہوئے کہا۔“ اچھا تم جاؤ نا بہت ضروری کام لکھا ہوا ہے۔“ وہ کلاس میں داخل ہوئی تو سامنے چیئر پہ ہی رجسٹر نظر آیا، تسلی کے لیے اس نے کھول کر نام دیکھا، واپس رجسٹر بند کرتے ہو وہ رُکی، پہلے صفحے پہ نام کہ پہنچے ہی ایک فون نمبر درج تھا، اور ساتھ میں انگلش Alphabets ایچ۔ ایسا لکھا تھا۔ اسے سمجھنے میں دیر نہ لگی یہ کس کا نمبر ہے۔“ اتفاقاً بال پین رجسٹر میں تھا۔ وہ لیفٹ ہینڈ یوز کرتی تھی اس نے رائٹ ہینڈ پر نمبر نوٹ کیا۔ ایک عجیب سی خوشی لیے وہ میں گیٹ کی طرف بڑھ گئی۔ ”کہاں رہ گئی تھی، ملا رجسٹر؟“ فجر کو اندازہ نہیں تھا کہ وہ اس سے پہلے یہاں موجود ہوگی، راتحہ کو دیکھ کر وہ چونکی، اس نے سر ہلایا اور بائیں ہاتھ میں پکڑا رجسٹر راتحہ کی طرف بڑھا دیا۔ راتحہ نے رجسٹر تھام لیا اور پھر فجر کی جانب دیکھا وہ کہیں اور متوجہ تھی مگر اس نے نوٹ کیا تھا کہ اس کے دائیں ہاتھ کی مٹھی غیر محسوس طریقے سے بندھی۔ راتحہ الجھت سر جھکا کر مبہم سا مسکرائی۔

☆.....☆.....☆

میں ہاتھ لے کر نکلی تھی، جب فون بجنے کی آواز آئی، راتحہ کا نمبر دیکھ کر حیرت ہوئی کہ ابھی دو دن پہلے تو کالج سے فری ہوئے تھے، شاید کوئی پڑھائی سے متعلق مسئلہ تھا۔

”السلام وعلیکم! راتحہ بات کر رہی ہوں۔ فجر سے بات ہو سکتی ہے؟“ وہ ایک ہی سانس میں بولے گئی، یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کافی جلدی میں

ہو۔“

”وعلیکم السلام۔“ ہاں راتحہ کیسی ہو؟“ ٹھیک ہوں یا تم سے ایک کام ہے۔“ اب کے اس کی آواز میں واضح گھبراہٹ تھی۔

”کیسا کام؟“

”دراصل میں گھر میں اکیلی ہوں۔ اماں پھوپھو کی طرف گئیں ہیں اور میرا کزن..... میں نے تمہیں بتایا تھا ایک دفعہ بلال کے بارے میں، وہ کسی بھی وقت یہاں آ سکتا ہے۔ پلیز مجھے ڈر ہے کہیں وہ..... تم سمجھ رہی ہونا میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں.....؟“

چند ثانیے میں خاموش رہی، مجھے یاد آ رہا کہ بہت شروع میں اس نے اپنے ایک ادباش کزن کے بارے میں بتایا تھا، اس کے قصے کہانیاں وہ اکثر ہمیں سناتی تھی، تو یقیناً اب کوئی سیریس مسئلہ تھا اور تفصیل وہ مجھے فون پر نہیں بتا سکتی تھی۔ میں چاہ کر بھی انکار نہ کر سکی۔ جو بھی تھا وہ اس وقت کافی مشکل میں تھی۔ ”بولو فجر تم آرہی ہو؟“ وہ پھر پوچھ رہی تھی۔

”راتحہ میں.....“ اور پھر میرے ذہن نے ایک جال بنا۔ ”ٹھیک، راتحہ میں آرہی ہوں کچھ دیر میں تم دروازہ بند رکھنا۔“ اسے تسلی دیتے ہوئے میں نے فون بند کیا اور اب..... کچھ عرصے پہلے کا نوٹ کیا ہوا نمبر میرے کام آیا۔ اس مرتبہ مسج کرتے ہوئے لحظہ بھر کو میرے ہاتھ کپکپائے تھے مگر میں نے اپنے آپ پر قابو پالیا۔ پیغام جانے کے کچھ لمحوں بعد ہی رپلائی آیا۔ اور پھر کال آنا شروع ہو گئی میں نے کال کاٹ کر پھر سے ایک مسج کیا۔ اب کی بار کوئی رسپانس نہیں آیا تھا، مگر مجھے یقین تھا کہ میری تدبیر کام کر رہی ہے۔ اس کے گھر کا پتا مجھے معلوم تھا، ہمارے گھر سے زیادہ دور نہ تھا اور یقیناً یہی وجہ تھی کہ اس نے سب سے پہلے مجھے کال کر کے آنے کو کہا تھا۔ مگر اس وقت پڑوس میں تھیں۔ میں نے الماری سے اپنا بہترین

ڈریس منتخب کیا اور پوری تیاری کے ساتھ گھر سے نکلی۔ ایک نوٹ پر مہما میں کالج کے ایک ضروری کام سے راتحہ کی طرف جا رہی ہوں۔ آپ پریشان مت ہوئے گا لکھ کر اندرونی دروازے پر چسماں کر دیا۔

☆.....☆.....☆

یہ ایک کشادہ گلی تھی مگر اس کے دونوں اطراف میں انتہائی غلیظ نالیاں بہ رہی تھیں۔ ایک پل کو مجھے محسوس ہوا کہ میں غلط راستے پر آ گئی ہوں اور مجھے واپس جانا چاہیے مگر اگلے ہی پل دل کی آواز کو جھٹک کر میں آگے بڑھی۔ سرخ رنگ کے گیٹ کے پاس رک کر میں نے دائیں بائیں دیکھا، مبادا اس کے علاوہ تو کوئی سرخ رنگ کا دروازہ نہ ہو، راتحہ نے مجھے یہی بتایا تھا کہ گلی میں داخل ہوتے ہی دوسرے نمبر پر سرخ دروازہ اسی کے گھر کا ہے۔ اندر داخل ہوتے ہی نہایت بد رنگ اور بدبودار پردہ میرے نتھنوں سے ٹکرایا، یہاں تک آتے آتے بڑی مشکل سے میں نے خود کو قے کرنے سے بچایا۔ ایک طویل مگر تنگ سی راہداری عبور کر کے سامنے کھلا سا کمرہ تھا اور وہاں کا منظر میری توقعات کے بالکل برعکس تھا۔

”السلام وعلیکم۔“ صوفی پر بیٹھے مرد اور پکی عمر کی عورت نے چونک کر مجھے دیکھا، وہ کسی حساب کتاب میں مصروف تھے۔ ”میرا حساب پورا ہے، اپنی تسلی کر لے تو۔“ میرے سلام کو نظر انداز کر کے وہ عورت انتہائی جاہلانہ انداز میں بولی یوں کہ اس کے پیلے بدنما دانت مجھے دور سے اور بھی ہیبت ناک لگے۔ ”یہ راتحہ الجنت کا گھر ہے؟ اسے بلا دیں۔“ مجھے انہیں دوبارہ توجہ دلانی پڑی اب کی بار اس مرد اور عورت نے عجیب انداز سے ایک دوسرے کی جانب دیکھا۔ ”آئیں جی بیٹھیں۔“ وہ عورت مجھ سے مخاطب ہوئی۔ ”راتحہ گھر پر ہی ہے۔“ بیٹھتے ہوئے میں نے پھر سے تسلی کرنا چاہی۔“

”جی میں ابھی بلاتا ہوں اسے آپ آرام سے بیٹھیں۔“ عورت کے منہ کھولنے سے پہلے ہی وہ مرد بولا۔ پھر سے ان دونوں میں نظروں کا تبادلہ ہوا اور وہ عورت، اس سے بولی۔ ”اچھا تو دیکھ اسے، میں پھر آؤں گی۔“ وہ عورت دوپٹا سنبھالتی ہوئی باہر کی جانب بڑھی اور وہ مرد اس کے پیچھے گیا۔ یکدم مجھے محسوس ہوا اس وقت گھر پر میرے علاوہ کوئی اور نہیں ہے۔ ایک سنسنہٹ سی میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں واقعی غلط جگہ پر آ گئی ہوں، نہایت غلط جگہ پر لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ جلدی سے پہلے دیر.....

معاذہ آدمی گریبان کھولے صوفی کی پشت پر آ کر کھڑا ہوا، جہاں میں بیٹھی تھی، اور میرے اٹھتے اٹھتے ہی اس نے اپنا ہاتھ میری جانب بڑھایا، اس سے پہلے کہ وہ میرا دوپٹہ کھینچ پاتا، فون کی گھنٹی سے اسے ایسا کرنے سے روکا وہ فون کی جانب متوجہ ہوا اور میں باہر کی جانب لپکی، اور نہ جانے کیسے، میرے جوتے کی ہیل ٹیڑھی ہوئی، پاؤں مڑا تھا یا آگے کوئی چیز تھی، جس سے ٹکرا کر میں منہ کے بل زمیں پر گری آدمی بات کرتے کرتے پھر سے میری طرف بڑھا تھا اور خود کو اس کی پہنچ سے پرے گھسیٹتے کوئی سخت چیز میرے ہاتھ لگی تھی، اور میں لمحہ ضائع کیے بغیر وہ پوری قوت سے اُسے دے ماری میرا وارکار گر ثابت ہوا تھا یا نہیں مگر اس نے بچاؤ کی کوشش کی اور میں بجلی کی سی تیزی سے دروازے تک پہنچی۔

”اے سالی (گالی) زک۔“ اپنے پیچھے میں نے اس ذلیل آدمی کی وہ مکروہ آواز سنی تھی۔

☆.....☆.....☆

میری آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی تھی، قریب تھا کہ میں دروازے پر ہی ڈھیر ہو جاتی مگر..... اس گھر سے باہر نکل کر جو کچھ میں نے دیکھا تھا بہتر تھا بہت

☆.....☆.....☆

وہ منظر میری آنکھوں سے نہیں جا رہا تھا، جب میں اس گھر سے نکلی تھی اور معا میری نگاہ گلی کے نکلنے پر سامنے کھڑے راتھ اور اس کے کزن پر پڑی، وہ جس دروازے کے پاس کھڑے تھے وہ بھی سرخ رنگ کا تھا۔ زمیں و آسمان میری نظروں میں گھومنے لگے تھے۔ راتھ نے اپنے گھر کے دروازے کا رنگ سرخ بتایا تھا۔ مگر کس حال میں ہے یہ فرق اس نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟ وہ دروازہ بالکل صحیح حالت میں تھا، اس کا رنگ دور سے ہی نمایاں ہوتا تھا، مگر میں جس دروازے سے داخل ہوئی تھی اس کی خستہ حالی ہی اس گھر کے مکینوں کی حالت کا پتہ دیتی تھی، اس کا سرخ رنگ ان کے گناہوں کی پیش سے بدل کر Rust ہو رہا تھا۔ راتھ نے مجھ سے کبھی جھوٹ نہیں بولا تھا مگر سچ کو ہمیشہ چھپایا تھا اس کا اندازہ مجھے آج ایک بار پھر اچھی طرح ہو رہا تھا۔ نجانے کیا کچھ کھونے والی تھی میں اور کیا کچھ لٹ گیا تھا میرا۔

☆.....☆.....☆

اس کا نام راتھ الجنت تھا۔ یعنی جنت کی ہوا، اور اپنے نام کی ہوا اس نے کبھی کسی کو نہ لگنے دی تھی۔ وہ جس طرح کے ماحول میں پیدا ہوئی تھی جس طرح پللی بڑھی تھی اس گھر کے دور و دیوار سے مفلسی ٹپکتی تھی۔ چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لیے تڑپنا اور روز روز کے جھگڑے، گالم گلوچ ان سب چیزوں سے بہت جلدی اسے اس ماحول سے متنفر کر دیا۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ اپنی بہنوں کی طرح خود ترسی کا شکار نہیں ہوگی۔ حالات پر سمجھوتہ کر کے ہاتھ جھاڑ کر نہیں بیٹھے گی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ اس ظالم اور لالچی بے حس معاشرے میں رہنے کے لیے اسے اپنے بقاء کی جنگ لڑنی ہے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جو اپنے حق پر عقاب جیسی نگاہ رکھتے ہیں۔ اگر کوئی ان کا حق چھینے

بہتر تھا کہ وہیں کھڑے کھڑے میری روح فنا ہو جاتی۔ راتھ اور حسن کی آنکھوں میں دیکھنے سے پہلے میں اندھی ہو جاتی..... میں نجانے کس طرح گھر پہنچی..... لاؤنج کہ دروازے تک پہنچ کر مجھے ماما کا خیال آیا۔

میں تو ماما کے سینے سے لگ کر ڈھیر سا رونا چاہتی تھی۔ آہٹ پر ماما کچن سے باہر آ کر میری جانب بڑھیں۔ ”تم فریش ہو کر آ جاؤ میں کھانا لگا رہی ہو، تمہارے بابا آ چکے ہیں۔“ سرد اور سپاٹ لہجے میں ماما نے میری طرف دیکھے بغیر کہا۔ اپنے کمرے آ کر وہیں میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ پچھتاوا ذلت اور سب سے بڑھ کر اپنی نظروں میں، اپنی نظروں میں گرنے کا احساس مجھے تڑپا رہا تھا، میں نے کیا چاہا تھا، کتنی مضبوط پلاننگ بنا کر میں گھر سے نکلی تھی۔ میں تو سارے راستے یہ سوچ کر طے کرتی گئی کہ واپسی پر میری فتح ہوگی۔ جب میں راتھ کو حسن کے سامنے اپنی صفائیاں دیتے دیکھوں گی۔ جب وہ اپنی پاکدامنی کی قسمیں کھا رہی ہوگی اور مجھے وہاں دیکھ کر حسن میری تائید کرے گا۔ میری جانب بڑھے گا مگر میں اُسے دھتکاروں گی..... مگر..... میں نے جو بساط بچھائی تھی وہ مجھ پر ہی الٹ پڑی۔ مجھے موقع ملا تھا، عرصے بعد اپنے دل میں پھیلے حسد کی آگ پر پانی ڈالنے کا..... لیکن..... میں اڑتے اڑتے زمیں پر گری تھی، وہ بھی اوندھے منہ۔

جب انسان تقدیر پر یقین کرنے کے بجائے اپنی تدبیریں لڑانا شروع کر دے تو پھر اللہ اُس کو اپنی یاد دلانے کے لیے ایک جھٹکا ضرور دیتا ہے۔ اور وہ لوگ خوش نصیب ہوتے ہیں جو اس آزمائش یا سزا سے سنبھل جاتے ہیں، سُدھر جاتے ہیں۔ ورنہ ساری زندگی گمراہی انسان کو آخر میں جہنم تک گھسیٹ لاتی تھی۔

تو جھپٹ کر وار کرتے ہیں اور چھیننے والے کا اپنا حق بھی اس کے پاس نہیں رہنے دیتے۔ وہ ذہین تھی، سمجھ دار تھی، پر اعتماد تھی اور زندگی کی سختیوں نے اُسے منتقم بھی بنا دیا تھا۔ راتھ نے اپنے گھر والوں کی روایت کے برخلاف میٹرک کے بعد ہی تعلیم جاری رکھی اور پھر کالج میں اس کی ملاقات فجر نقوی سے ہوئی جس نے اس کی خود پسند طبیعت کو چیلنج کیا تھا۔ پھر اسے موقع ملا تھا اپنے اندر چھپے سیلف پونڈ انسان کو مار کر اپنا مقام بنانے کا۔ فجر نقوی جو بلا کی ذہین تھی، پر اعتماد، منہ پھٹ، مغرور اور پھر خوبصورتی نے سونے پہ سہاگے کا کام کیا تھا۔ اس نے فجر سے دوستی کر لی اور اخلاق کا لبادہ اوڑھ کر اپنے اندر دم وجود Complex کو چھپایا۔ جوں جوں دوستی بڑھتی گئی۔۔۔ راتھ نے یہ جانا تھا کہ فجر میں ڈھیر ساری خوبیوں کے باوجود عقل نام کو نہیں تھی۔

بس یہ چھوٹی چھوٹی کمزوریاں ہی راتھ کی طاقت بن رہی تھیں۔

☆.....☆.....☆

کلاس میں فجر نقوی ہمیشہ مجھ سے ایک نمبر آگے رہی تھی چاہے نصابی سرگرمیاں ہو یا غیر نصابی ایکسٹریٹریز اور مجھے نہ تو اس سے پیچھے رہنا منظور تھا اور نہ برابر میں اس سے ایک قدم آگے رہنا چاہتی تھی۔ سو اس کے لیے مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی۔ فجر کی رائیٹنگ پیاری تھی اور ہر کام میں اس کی پریزنٹیشن بھی کمال ہوتی تھی۔ جس کا مجھے پہلے اندازہ نہیں تھا اور جب ہوا اس کے بعد سے فجر ہمیشہ مجھ سے ایک پوائنٹ کے فاصلے پر پیچھے رہنے لگی۔ پھر اس کے چہرے کے تاثرات سے میں اندر ہی اندر نہایت لطف اندوز ہوتی۔ حسن جو عنقریب میرا منگیتر بننے والا تھا سے میں نے جان بوجھ کر فجر کو ملوایا تھا اور وہ ہی ایک ملاقات میں اس کی اسیر دکھائی

دے رہی تھی۔ میں نے فجر کو منع کیا تھا کہ وہ کسی سے یہ بات شیئر نہ کرے مگر اس نے وہی کیا تھا جیسا میں چاہتی تھی یا جس کا مجھے ارمان تھا۔ بسمہ نے مجھے جو بتایا تھا وہ میری حیرت کے لیے کافی تھا۔ چنگاری لگ چکی تھی، آگ پھیلنے میں ذرا سا وقت باقی تھا اور جب میں نے فجر کو رجسٹر لانے کے لیے بھیجا تو اس نے وہی حرکت دہرائی۔ جو اُسے اس کے سو کالڈ بنائے ہوئے معیار سے بہت نیچے لے آئی تھی۔ وہ جو بہت برا انڈکشن تھی اور میں صرف کانٹا اب اُسے کون بتاتا کہ وہ بھی ان گری ہوئی لڑکیوں میں شمار ہو چکی ہے جو صرف گوری چمڑی اور پالش کی چمک دیکھ کر دھوکہ کھا لیتی ہیں اور اپنی عزت تک کی پرواہ نہیں کرتیں۔ پھر جب میں نے اسے گھر آنے کے لیے کہا تو وہ تھوڑے شش و پنج کے بعد راضی ہو گئی۔

میں اس وقت گھر میں اکیلی تھی اور کچھ ہی دیر میں حسن کے ساتھ امی اور خالہ کو لے کر پنڈی روانہ ہونے والے تھے۔ اب بس مجھے فجر کا انتظار تھا، جو کچھ وہ کرنے کی کوشش کر چکی تھی، ناممکن تھا وہ میرے ایک بار بلانے پر مجھ سے ملنے آ جاتی، اس لیے مجھے فون پر خود کو پریشان اور مشکل میں ظاہر کرنا پرا، یہ بھی شکر تھا، کوئی وضاحت طلب کیے بغیر فجر نے آنے کی ہامی بھری تھی۔ میں نے خاص طور پر فجر کو حسن سے ملوایا تھا کہ اتنے خوبصورت لڑکے کو میرے ساتھ دیکھ کر وہ کیا رد عمل ظاہر کرے گی، جان سکوں۔ اسے اپنی منگنی کے بارے میں نہ بتانے کے پیچھے میری سوچ یہ تھی کہ کسی اور سے یہ سب جان کر وہ کیساری ایکٹ کرے گی۔ وہ عام طور پر خاموش، چپ چاپ برداشت کرنے والی لڑکیوں میں سے نہ تھی مگر میری توقع کے خلاف اس نے مجھ سے کوئی جواب طلبی یا شکایت نہیں کی تھی۔ شاید اپنی انا کے ہاتھوں مجبور ہو کر وہ چپ رہی تھی۔ مگر بسمہ کے

ذریعے سے اس نے میرے بارے میں جو Gossip پھیلانے کی کوشش کی تھی۔ اس سے مجھے یہ اندازہ ضرور ہو گیا تھا کہ وہ خاموش رہ کر بھی وار کر سکتی ہے۔ میری توقع کے عین مطابق اس نے رجسٹر سے نمبر نوٹ کیا تھا اور مجھے یقین تھا کہ وہ ضرور حسن کو اپروچ کر کے اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کرے گی۔ لیکن اس نے ایسی کوئی حرکت نہ کی۔ یہ بھی میرے لیے حیرت کی بات تھی۔ ہ اور جب میں نے اپنا ٹرانسفر پنڈی کروالیا تھا۔ حسن اور خالہ کے اصرار پر تو میں چاہتی تھی کہ پرانی گھتیاں سلجھا کے جاؤں میں صاف دل سے فجر سے آخری بار ملاقات کر لوں کیونکہ میں نے جس کی عرصے سے خواہش کی تھی وہ منزل مجھے نظر آ رہی تھی۔ میرا راستہ صاف تھا۔ میں مطمئن تھی اور ایسا ہوتا ہے کہ جب انسان ذہنی طور پر مطمئن ہو تو پرانی رنجشیں بھی بھلانے کو دل چاہتا ہے۔ سو فجر سے بھی میں آخری مرتبہ صاف دل سے ملنا چاہتی تھی کہ آخر دل میں بغض رکھے ہی سہی ہم دونوں نے کچھ وقت ایک ساتھ اچھا گزارا ہی تھا اور شاید میں فجر سے مل کر اس کے تمام گلے شکوے بھی دور کر دیتی اگر..... مجھے ابھی ابھی حسن کا سبب نہ آیا ہوتا۔

”تمہارے علاوہ گھر میں کون کون ہے؟؟“
عجیب سے انداز میں عجیب سا سوال پوچھا تھا اس نے، جبکہ وہ جانتا تھا کہ گھر میں میرے علاوہ کوئی نہیں ہوگا۔ میں نے کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ کچھ لمحے گزرنے کے بعد پھر پوچھا تھا اس نے۔ ”بلال تمہارے گھر ہے؟“ حسن کا سبب پڑھ کر میں چونکی تھی اور کچھ پل لگے مجھے سمجھنے میں، بلال میرا وہی کزن تھا جس کے بارے میں فجر کو ایک بال پہلے بھی بتا چکی تھی اور فون پر بھی اسی حوالے سے اپنی پریشانی ظاہر کی تھی۔ یعنی فجر نے..... حسن کو میرے بارے میں

غلط انفارمیشن بتائی تھی۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا، دماغ سائیں سائیں کر رہا تھا۔ قبل اس کہ میں حسن سے کوئی جواب دیتی فجر مجھ سے گھر کا ایڈریس پوچھ رہی تھی اور میں نے اسے اپنے گھر کا دروازہ بتانے کے بجائے اس گھر کا سرخ دروازہ نشانی کے طور پر بتایا جس سے کوئی عزت دار لڑکی کبھی داخل نہیں ہوئی اور اگر داخل ہو جائے تو وہ عزت دار لڑکی نہیں ہے۔ مجھے اب اس بات کی پروا نہیں ہے وہ کیا کرے گی، اس کے ساتھ کیا ہوگا، مجھے فکر اس بات کی تھی کہ حسن کو آنا تھا اور نجانے اب وہ آئے گا یا نہیں۔ بسمہ تک تو بات ٹھیک تھی، جب فجر نے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی مگر یہ بھی اچھا تھا میں اور بسمہ ایک دوسرے کو اسکول سے جانتے تھے اور طوبیٰ کو بھی میں پہلے سے اپنی ایجنٹ کے بارے میں بتا چکی تھی۔ لیکن میرے فیانسی کی نظروں میں مجھے گرانے کی کوشش، فجر اس حد تک گر جائے گی میرے وہم گمان میں نہ تھا۔

کچھ دیر یونہی پریشانی کے عالم میں گزری، پھر اچانک دروازہ کھٹکھٹانے کی آواز میرا دل میری قوت سے دھڑکا تھا۔ دروازے پر حسن کو دیکھ کر میں نے بے اختیار ٹھنڈی سانس لی۔

”رہپلائی کیوں نہیں کر رہی تھیں۔“ لہجے میں حتی الامکان نرمی لیے اس نے پوچھا۔ ”کیڑوں والا سامان پیک کر رہی تھی آپ گاڑی میں رکھ آئیں میں باقی دروازوں کو لاک کرتی تب تک۔“

سپاٹ لہجے میں، میں نے کہا۔ میرے علاوہ گھر میں کسی کو ناپا کر وہ شرمندہ ہوا تھا یا نہیں مگر اب قدرے نارمل لہجے میں بات کر رہا تھا اور میرے یکسر نظر انداز کرنے سے اسے معاملے کی سنگینی کا اندازہ ہوا تھا۔ جب ہی اس نے اپنا موبائل میری نظروں کے سامنے کیا۔ وہ بلاشبہ فجر کا نمبر تھا ”مسٹر حسن آپ

تھی۔ آخر ہم جیسے لوگوں کو اس بے حس اور خود غرض سماج میں ایڈجسٹ کرنے کے لیے اپنی بقاء کی جنگ 'Battle Of Survival' تو لڑنی ہی پڑتی ہے۔

☆.....☆.....☆

چوبیس گھنٹے کمرے میں قید رہنے کے بعد بالآخر میں بابا کا سامنا کرنے کی ہمت کر پائی، وہ بھی اگر بابا خود مجھے نہ بلا تے تو شاید میں اپنے کمرے میں ہی بڑی رہتی، کیونکہ اس دوران ممانے مجھ سے دوبارہ کسی قسم کی کوئی بات نہیں کی تھی۔ بابا ہفتے بھر کے لیے پھر سے ڈیوٹی پر جانے والے تھے۔ سو میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ میری وجہ سے پریشان ہوں بلکہ ان کی پریشانی سے زیادہ مجھے اپنی غلطی چھپانے کی فکر تھی۔ بابا کے جانے کے بعد میں کچھ دیر دانستہ طور پر وہیں بیٹھی رہی کہ شاہد اب ممانے سے کھل کر بات کریں میں جو کل رات سے پریشان تھی کہ وہ کیوں آ کر مجھ سے بات نہیں کر رہی اس وجہ سے کہ میں انہیں بتائے بغیر رات کی طرف چلی گئی یا انہیں میرے..... اچانک میری نظر کارنر پر رکھے موبائل اسٹینڈ پر پڑی، دکھ اور شرمندگی کی لہر نے ایک بار پھر مجھے تڑپا کر رکھ گئی تھی اور رات کے کزن سے ہونے والی Conversation بھی جلدی جلدی میں ریسوو کرنا بھول گئی تھی۔

مما کی لا تعلقی کی وجہ مجھے سمجھ میں آ گئی تھی۔ پچھتاوے کے شدید احساس نے مجھے پھر سے آگھیرا۔ اب بظاہر سب کچھ ٹھیک ہے۔ ممانے سے بات چیت، گھر میں ہلکی پھلکی شرارتیں۔ خاص طور پر یونیورسٹی..... ہاں یونیورسٹی میں بھی میں اپنی ٹاپ پوزیشن برقرار رکھنے میں کامیاب ہوں۔ مجھے Admire کرنے والے ٹیچرز اور کلاس فیلوز بھی ہیں..... لیکن....."

☆☆.....☆☆

خبردار رہیں۔ آپ کی منگیتر رات کو آپ کو دھوکہ دے رہی ہے۔ وہ کسی بلال نامی اپنے کزن میں انوالوڈ ہے اگر آپ کو یقین نہیں ہے تو....." آگے بھی کچھ لکھا ہوا تھا۔ شاید مگر دکھ اور صدمے کی شدت سے میں پڑھ نہیں پائی۔ مجھے اس شخص پر حیرت تھی جو لہنتی دیدہ دلیری سے یہ سب مجھے دکھا رہا تھا۔ میں اپنی صفائی میں کچھ نہیں بولی تھی۔ بولنے کو کچھ تھا بھی نہیں "آپ یہ لے جائیں میں آرہی ہوں۔" آخری بیگ حسن کو پکڑاتے ہوئے میں نے کہا۔ وہ شخص اب نادم لگ رہا تھا، اپنی صفائی کے لیے دلائل دے رہا تھا، مگر اب کچھ نہیں سننا چاہتی تھی۔ بس ابھی مجھے حسن کے ساتھ جانا تھا کیوں کہ میرے نہ آنے سے امی پریشان ہو جائیں۔ فجر پہ پہلے بھی کوئی خاص بھروسہ نہیں تھا مگر یہ انسان جسے میں نے اپنے بعد دنیا میں سب سے زیادہ ٹرسٹ کیا تھا، وہ ڈگمگایا، ایک پل کے لیے ہی سہی، مگر مجھ پر اسے اتنا کم اعتماد تھا کسی انجان مسج کے زیر اثر آ کر اس نے مجھ سے تفتیش کی تھی۔ وہ جو نہی گیٹ کو تالا لگا کر مڑا، ایک پل کے لیے ٹھٹکا تھا۔ اور اس کی نظروں میں تعاقب میں دیکھتے ہوئے میں ساکت رہ گئی۔ فجر لٹھے کی مانند سفید چہرہ لیے کھڑی تھی۔ وہ ہم سے قدرے فاصلے پر تھی مگر اس کے چہرے کے تاثرات غیر معمولی دور سے پہنچانے جاسکتے تھے۔ میں نے ذرا کی ذرا حسن کی طرف دیکھنے کی کوشش کی اور اسی پل وہ میری طرف مڑا تھا، نظریں ملی تھیں مگر مجھے کچھ بھی وضاحت کرنے کی ضرورت نہ پڑی البتہ حسن کی آنکھوں میں غصے، حیرت اور ناگواری تاثرات میں آسانی سے دیکھ سکتی تھی جو مجھ سے نظریں ملنے پر افسوس اور شرمندگی میں بدل گئے۔ اب بس حسن نے تمام راستے مجھے منانا تھا اور مجھے اپنی انا وقار کا جھنڈا بلند رکھنے کے لیے، کچھ عرصہ خاموشی اختیار کیے رکھنا

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈ فری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

افسانہ

ندا حسین

ایک ملاقات

قیمتی زیورات زیب تن کیے عنابی رنگ کی بیل دار، شیفون کی نفیس ساڑھی میں وہ کسی ریاست کی ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔ سلمیٰ کے دل میں حسد نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ جوانی میں ان کا حسن خاندان بھر میں مشہور تھا۔ اور تب اس سوکھی سرری کہکشاں کو.....

قیمتی فانوش کی روشنیوں میں جگمگاتا، اعلیٰ وارضع فرنیچر سے مزین وہ محل نما گھر اعلیٰ طبقے کے ہونے کی محفل کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ زرق برق جدید تراش خراش کے لباس میں ملبوس خواتین و حضرات مسکراتے تہقے لگاتے خوش گپیوں میں ایک دوسرے کے ساتھ مصروف ادھر سے ادھر گھوم رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہاں موجود تمام نفوس اعلیٰ طبقے کی ہی ترجمانی کر رہے



READING
Section

تھے بلکہ کچھ سلمیٰ جیسے درمیانے طبقے کی نمائندگی کرتے افراد بھی وہاں اپنی کم حیثیت ہونے پر دل ہی دل میں کڑھتے، چہرے پر مصنوعی مسکراہٹ سجائے محفل میں شامل تھے۔

تقریب سلمیٰ کے دور پرے کے رشتہ دار کی متلنی کی تقریب تھی۔ سلمیٰ اپنے بیٹے اور شوہر فیض کے ساتھ اس تقریب میں شرکت کے لیے آئیں تھیں۔ نو سالہ طیب ان کے پہلو سے لگا بیٹھا رنگ و نور کی محفل کو حیرت سے تک رہا تھا۔ اس نے اپنی اب تک کی زندگی میں ایسی عالیشان و شاندار محفل نہ دیکھی تھی۔ دفعتاً سلمیٰ کی نظر کچھ فاصلے پر بیٹھی ایک ملکبتری خاتون پر پڑی۔ شکل کچھ جانی پہچانی لگی۔

بھویں سکیڑ کے مزید غور سے دیکھا تو نگاہوں میں شناسائی کی رفق دوڑ گئی۔ وہ کہکشاں تھی۔ ان کی بچپن کی سہیلی، خالہ زاد بہن۔ آخری بار انہوں نے اسے اس کی شادی میں دیکھا تھا۔ تب بھی وہ ایسی حسین نہیں لگ رہی تھی جیسی آج نظر آ رہی تھی۔ دراز قد، زرد رنگت کی مالک کہکشاں کی آج چھب ہی نرالی تھی۔ رنگ کھل کر گلالی ہو چکا تھا۔ کچھ شخصیت میں شان بے نیازی اور نمکنت کا عکس بھی نمایاں تھا۔ قیمتی زیورات زیب تن کیے عنابی رنگ کی بیل دار، شیفون کی نفیس ساڑھی میں وہ کسی ریاست کی ملکہ دکھائی دے رہی تھی۔

سلمیٰ کے دل میں حسد نے ایک زوردار انگڑائی لی۔ جوانی میں ان کا حسن خاندان بھر میں مشہور تھا۔ اور تب اس سوکھی سڑی کہکشاں کو کون پوچھتا تھا۔ پر آج وہ حسن میں اسے مات دے رہی تھی۔ اپنی دلی کیفیت سے گھبرا کر اس نے ادھر ادھر دیکھا، سامنے ہی دیوار پر نصب دیوار گیر شیشہ اسے ان دونوں کی جھلک دکھا رہا تھا۔ شیشے میں کہکشاں کا عکس سلمیٰ کے عقب میں نمایاں

تھا۔

”آہ۔۔۔!“ دل سے سرد آہ ابھری۔ کہکشاں اس کے مقابلے میں تازہ کھلے ہوئے گلاب کی مانند تھی اور وہ جیسے مرجھایا ہوا پھول جس میں تازگی و شادابی ناپید ہو چکی ہو۔

”نظروں کا دھوکہ ہے سب، حسن نہیں ہے بس دیدہ زیبی ہے۔“ اس نے اداس ہوتے دل کو سمجھایا۔ وہاں موجود لوگوں کی نگاہوں میں کہکشاں کے لیے ستائش دیکھ کر سلمیٰ اندر ہی اندر جل بھن گئی۔

”ہونہہ! اصل حسن کی پرکھ تو لوگ کھو بیٹھے ہیں سارا کھیل پیسے کا ہے۔ میں بھی ان کے جیسے کپڑے زیورات پہن لوں تو اس سے کہیں زیادہ لشکارے ماروں۔ اور یہ میرے جیسا کم قیمت عام سا لباس پہن لے تو معلوم پڑے حقیقت حسن کی۔“ دل میں انگڑائی لیتا حسد اب ایک شعلہ کی مانند دہک رہا تھا۔

”پر یہ دولت آئی کیسے، اس کے سسرال والے کوئی کھاتے پیتے گھرانے سے تعلق نہیں رکھتے تھے۔ شادی ہی اس سادگی سے کی تھی کہ نہ پوچھو۔ پھر یہ کیا کیسے پٹی۔“ حسد کے بعد تشویش نے بھی سلمیٰ کے دل میں سرا بھارا۔

”ہوں نہوں!“ کہکشاں کو نظروں ہی نظروں میں ٹٹولتے اس کے ذہن میں ایک نئے خیال کی آمد ہوئی۔

”ہو سکتا ہے دکھاوا کرنے کو کسی سے مانگ مانگ کر لے آئی ہو کہ جی مجھے بڑی دعوت میں جانا ہے دنیا کو دکھانا ہے کہ میں بھی کسی سے کم نہیں۔ ذرا اپنے فلاں کپڑے اور جوتے دے دیں۔ ہائے یہ زمانے میں پھیلی دکھاوے کی بیماری۔ بیچاری کہکشاں بھی اس کے زد میں

آگنی۔“ خیال آنے پر وہ دل ہی دل میں ہنستی تصور کی آنکھ سے اسے گھر گھر کپڑے جوتے مانگتا بھی دیکھنے لگی۔

ارے ملوں تو صحیح باتوں ہی باتوں میں اس سے سب اگلواتی ہوں۔ تبدیلی کی ساری وجہ کھل کر سامنے آ جائے گی۔ آخر فیصلہ کر کے وہ اپنی نشست سے اٹھ ہی گئی۔ وہ اب کہکشاں کے برابر والی نشست پہ بیٹھی قریب سے کہکشاں کے پہناوے، اوڑھاوے کا جائزہ لے رہی تھی۔ رسی سلام دعا کے بعد اور خیر خیریت کا مرحلہ بخوبی طے پا چکا تھا۔ سلمیٰ کی نظروں سے چھلکتی حسد و جلن کہکشاں کی نظروں سے اچھی نہ رہ سکی تھی۔ سوان کی حالت کا بھرپور مزہ اٹھاتے وہ چسکے لینے والے انداز میں پوچھنے لگی۔

”اور منیب بھائی کا کیا حال ہے سلمیٰ۔ وہی سرکاری آفس میں جوتی گھس رہے ہیں یا مزید کوئی دوسرا کام بھی کر رہے ہیں ساتھ ساتھ۔“ اس چبھتے سوال پر سلمیٰ کو تو پچھلے لگ گئے۔ پر ضبط کر کے بولی۔” جوتے کیوں گھسیں گے، الحمد للہ سولہ گریڈ کے آفیسر ہیں۔ تم سناؤ عمران بھائی کی وہی ننھی سی کاسمیٹکس کی دکان ہے یا کچھ بڑھائی ہے۔“ سلمیٰ کون سی کہکشاں کے شوہر کی ذریعہ آمدنی سے ناواقف تھی جو خاموش رہتی۔ سو جم کر جوابی تیر برسایا۔

”چھوٹی کیوں بہن ماشاء اللہ پورے مارکیٹ میں سب سے بڑی دکان ہے میرے عمران کی۔ بس اللہ جلنے والوں کی بری نظر سے بچائے ہمیں۔“ کہکشاں نے جتاتے ہوئے معنی خیز انداز میں نظریں گھماتے ہوئے کہا تو سلمیٰ کے تن بدن میں آگ لگ گئی۔

”ہاں تو ظاہر ہے! تمہارے میاں میٹرک پاس تو ہیں کوئی ایسے تعلیم یافتہ تو ہیں نہیں کہ کہیں

اعلیٰ عہدے پر فائز ہوں یا اونچے گریڈ کے آفیسر لگیں۔ اب لے دے کر جو ایک دکان کھول رکھی ہے اسی کو بڑھاتے رہنے کے علاوہ اور چارہ بھی کیا ہے۔“ سلمیٰ کا انداز خالص تمسخرانہ تھا۔

بھئی کر دی نا تم نے پرانے وقتوں کی بات۔ بھئی آج کے دور میں تو اچھے خاصے تعلیم یافتہ لڑکے رُلتے پھر رہے ہیں۔ کاروبار کو کامیابی سے چلانا بھی ایک طرح کا گر ہے جو ہر کسی کے بس کی بات نہیں۔ بھانت بھانت کے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے ہر ایک کو رام کرنا آسان نہیں ہوتا۔ یہ بھی ایک خداداد صلاحیت ہے جو الحمد للہ میرے عمران میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ علمی فضیلت حاصل کرنا الگ بات ہے اور اپنا کاروبار چکانا الگ بات ہے۔“ بڑے تحافر سے سلمیٰ کے تمسخر کی ایسی کی تیسری کرتے ہوئے کہکشاں ایک بل کو خاموش ہوئی اور پھر راز داری سے سلمیٰ سے کہنے لگی۔

اور راز کی بات بتاؤں عمران نے تو اب خود ہی کاسمیٹکس بنانے کا کاروبار کرنا شروع کر دیا ہے۔ کہکشاں کی اس اطلاع نے تو جیسے سلمیٰ کا دل مسل کر رکھ دیا۔ وہ خاندان کی حسین ترین، تمیز دار، نفاست پسند، کفایت شعار، شوہر اور بچوں کو جان سے عزیز رکھنے والی لڑکی ہونے کے باوجود ایک عام سی زندگی گزار رہی تھی۔ جہاں آسائشیں تو کیا ہی میسر تھیں، ضروریات زندگی ہی بمشکل پوری ہوتی تھیں۔ اور یہ منہ پھٹ، بد تمیز، بد سلیقہ عورت پر قسمت کی دیوی یوں مہربان تھی کہ سر سے پیر تک دولت کی نمائش کرتی ہر ایک کی مرکز نگاہ بنی ہوئی تھی۔

”پر یہ تو سیدھا سادہ دھوکہ دہی ہوئی۔ بین الاقوامی برانڈ کی نقالی کر کے گلی محلے میں جعلی کاسمیٹکس بنانا۔“ سلمیٰ کون سا ہارنے والی تھی۔ کہکشاں کے منہ پر ہی ساری اصلیت

سامنے رکھ چھوڑی اس کے میاں کی۔ کہکشاں کے چہرے کا رنگ ایک لمحے کو بدلا مگر جلد ہی سنبھل کر اپنے مخصوص انداز میں ہنستے ہوئے بولی۔

سلمی دھوکہ دہی کہاں نہیں ہوتی۔ ایک گوالا بھی دودھ میں نہ جانے کون سے زہر ملا کر بیچ رہا ہے۔ سبزی والا بھی ترازو میں کمی بیشی کر کے لوگوں کا دھوکہ دیتا ہے۔ چلو یہ تو تمہاری نظر میں جاہل لوگ پر جو لوگ جعلی ڈگری لے کر ڈاکٹر بنے بیٹھے ہیں وہ دھوکہ نہیں یا پھر جو وکیل انصاف کی آڑ میں مجرموں کو چھڑوا رہے ہیں وہ دھوکہ نہیں۔

آج کل وہ زمانہ ہے کہ دنیا پیسہ آتا دیکھتی ہے یہ نہیں کہ کہاں سے آیا، کیسے آیا..... اور جو لوگ پیسہ بنانے کی صلاحیت نہیں رکھتے وہ یونہی ضمیر اور اخلاق کی دہائیاں دیتے روتے رہتے۔ ورنہ ضمیر اور اخلاق کو آج کل زمانے میں کون پوچھتا ہے.....؟“ کہکشاں کل تک صرف منہ پھٹ تھی پر اب بدل لحاظ ہو چکی تھی۔ صاف صاف سلمی کو آئینہ دکھا گئی۔ اور سلمی کے پاس اس آئینے میں اپنا شکست خوردہ، بے بس عکس دیکھنے کے علاوہ اور کوئی چارہ نہ تھا۔ اسے یہ مانتے ہی پڑی کہ کہکشاں اس سے زیادہ بلند بخت لے کر دنیا میں اتری ہے۔ تمسخر یا تحقیر سے وہ صرف اپنی تنگ دلی کا ہی اظہار کر سکتی ہے لہذا خاموش ہو گئی۔

کہکشاں سلمی کے دھواں دھواں ہوتے خاموش چہرے کو دیکھ کر متحافز سے مسکرانے لگی۔

☆.....☆.....☆

محفل کے اختتام پر گھر واپس جاتے ہوئے کہکشاں نے عمران کو اپنی اور سلمی کی ساری گفتگو بتاتے ہوئے کہا۔

قسم سے عمران سلمی کا چہرہ تو زور دینے والا تھا۔ اس کی زندگی وہ مجھے کم صورتی کا طعنہ دیتی

آئی تھی خود کو بڑی حسن کی پری سمجھتی تھی اب سمجھ آ گیا ہو گا اُسے کہ حسن کچھ نہیں ہوتا، نصیب سب کچھ ہوتا ہے نصیب۔“ وہ سلمی کو ہرانے کے کوشش میں گاڑی ڈرائیو کرتے عمران کے چہرے کے بگڑے ہوئے زاویے بھی دیکھ نہ سکی تھی۔

”بے وقوف عورت دوسروں کو جلانے کے

چکر میں تم نے گھر کی ساری راز کی باتیں اُگل ڈالیں۔ سمجھایا بھی تھا کہ یہ بات باہر نہیں نکلی چاہیے۔ کیا ضرورت تھی کاروبار والی بات کا ڈھنڈورا پیٹنے کی۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن نہیں ہوئے اس کاروبار میں ہاتھ ڈالے۔ بیگم صاحبہ نے پورے خاندان میں چرچہ کر ڈالا۔ پہلے ہی لوگ ہم سے کیا جلتے ہیں جو ایک نئی راہ سجا آئیں تم.....“ عمران کے غصے پر کہکشاں کی ٹرٹڑ کرتی زبان یکدم خاموش ہو گئی۔ اب احساس ہوا کہ بلا ضرورت ہی ایک میں چار لگا کر ڈھنڈورا جو پیٹا ہے وہ اپنا ہی نقصان نہ کر جائے۔ کہیں سلمی کا حسد ان کی خوشیاں نہ کھا جائے۔ چپ چاپ عمران کی ڈانٹ کھاتے ہوئے وہ اب دل ہی دل میں اللہ سے اپنے نئے نئے کاروبار کی خیر و عاقبت کے لیے دعا میں مانگ رہی تھی۔

دوسری جانب سلمی سارے راستے خاموش

رہی۔ وہ بظاہر تو خاموش تھی مگر اس کے ذہن و دماغ میں جھکڑ چل رہے تھے۔ منیب نے کئی بار انہیں مڑ کر دیکھا پر ان کے چہرے پر چھائی سنجیدگی نے کچھ کہنے سے روک دیا۔ وہ اندر ہی اندر بیوی

کی خاموشی پہ پریشان ہوتے اپنی برسوں پرانی کار کو دھیرے دھیرے چلاتے منزل کی جانب گامزن تھے۔ کار تیز چلاتے تو خراب ہونے کا خدشہ تھا۔ مکینک کو دکھایا تھا آج اچھا خاصا بھاری خرچہ بتایا تھا۔ پرانی گاڑی تھی ہر دو دن بعد خرچہ

نکالتی تھی۔ نصیب کی ذہنی روگاڑی کے خرچے کی طرف بھٹک کر رہ گئی۔

وہ دونوں میاں بیوی اس وقت الگ الگ سوچوں کے بھنور میں پھنسے ہوئے تھے۔ ”آج کہکشاں کی تلخ باتوں نے انہیں سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کیا ان کے شوہر کو اوپر کی کمائی کا موقع ملے تو وہ روک پائیگی.....؟ کیا اپنی ہمت ہے انہیں کہ گھر آتے ہوئے پیسہ کا راستہ روکیں۔ وہ کہکشاں کو تو خوب ایمانداری کا راگ سنا کر آئیں پر کیا ایمانداری کا تقاضا یہی ہے کہ جب تک بے ایمانی کا موقع نہ ملے انسان ایماندار رہے جیسے ہی موقع ملے ایمانداری کا طوق گلے سے اتار پھینکے۔ سلمیٰ اس وقت شدید اندرونی خلفشار کا شکار تھیں۔ ان کے ضمیر اور نفس کی شدید جنگ جاری تھی۔

وہ گھر جو کل تک اُس کا گلشن تھا آج گھر پہنچتے ہی برا لگنے لگا۔ جس شوہر کی صداقت و دیانت پہ فخر تھا وہ زہر لگنے لگی۔ بس ذرا سا نصیب کے پوچھنے کی دیر تھی۔ اور سلمیٰ کے دل میں کب سے جو الہ مکھی بنتا لاوا کسی آتش فشاں پہاڑ کی مانند پھٹ پڑا۔

”محفل میں عمران سے نہیں ملے کیا آپ۔ دیکھا نہیں کیسا سوئڈ بوئڈ کسی سیٹھ کی طرح گھوم رہا تھا۔ ارے کچھ شرم نہیں آئی آپ کو میٹرک پاس ہو کر اتنا کامیاب وہ، اور ایک آپ اتنا پڑھ لکھ کر بھی آخر پایا تو کیا پایا آپ نے۔“ وہ ہذیانی کیفیت میں چیخیں تھیں۔

نصیب تو اپنی سیدھی سادھی، خوش گفتار، صابر بیوی کا یہ روپ دیکھ کر اچھل پڑے۔ امتحان کی تیاری کرتا صیب کچن میں برتن دھوتی نائلہ اور نیند میں جھومنا طیب بھی سب کچھ بھلائے اپنی ماں کے اس جلالی روپ کو دیکھ کر دنگ رہ گیا۔

”ارے بیگم..... ایسا کیا ہو گیا وہ اگر کامیاب

ہے تو اپنے نصیب سے ہے اللہ جس کو جیسا چاہے نوازے۔“ نصیب گھبرا کر بس اتنا ہی بول پائے کہ سلمیٰ نے آگے سے ان کی بات کاٹ دی۔

”نصیب یہ سارا کھیل ہی تو نصیب کا ہے۔ مجھ جیسی خوبصورت، خوب سیرت، سلیقہ شعار، سنگھڑ، خوش گفتار کا نصیب دیکھو کہ رہنے کو یہ چھوٹا سا بوسیدہ سا گھر ملا۔ گاڑی کے نام پر جانے یہ کس صدی کا ڈبہ ملا۔ ایک ملازمہ تک نہ رکھی کو لہو کے بیل کی طرح کام میں جتی رہتی ہوں۔ نت نئے زیورات کی حسرت دل میں دبائے ساری زندگی آپ کی اور آپ کے بچوں کی خدمت میں گزار دی۔ ایک کنگن تو کیا ایک چھلاتک سونے کا نہ ملا آپ کی طرف سے مجھے اور زمانے بھر کی بد مزاج، نہ صورت، نہ سیرت، نہ لہجہ نرم نہ زبان پہ مٹھاس بد سلیقہ کہکشاں کوئی ایک خونی ہو تو میں مانوں اس کا نصیب یوں چمک رہا جیسے کوئی شہزادی بن بیٹھی ہو کسی محل کی۔ کوئی سمجھائے مجھے یہ اتنا ہن اس پر کیوں آبرسا۔ مجھ میں کیا کمی تھی مولا جو مجھے اس نعمت سے دور رکھا۔ ہائے یہ سارے تیرے ہی کھیل مولا جس کا مقدر تو جب چاہے چمکا دے۔“

سلمیٰ نصیب کو باتیں سناتے اب اللہ کے حضور نا شکری کرنا شروع ہو گئیں۔ نصیب ان کی باتیں سن کر پریشان ہو گئے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہاں ایسا ہوا کیا جو سلمیٰ نے یوں اچانک رولا ڈال دیا۔

”اچھی بھلی تو گئیں تمہیں یہاں سے، نہ جانے کس کی نظر لگ گئی جو یوں بے حال ہو کر لوٹیں ہیں۔“ پریشانی سے ٹہلتے ہوئے سلمیٰ کے شکوے سنتے وہ گاہے بگاہے اس پر نظر ڈال کر یہی سوچے جا رہے تھے۔

اگلے کچھ دنوں میں انہیں سارے حقائق کا علم ہو گیا۔ سلمیٰ نے اس دن سے نت نئی فرمائشیں

امید کا دیا

سال رواں کے آخری سورج کی کرنیں آنکھوں میں آنسو اور دل میں تڑپ لیے الوداع ہو رہی ہیں۔ وہ دعا کرتی ہیں کہ اے خدا اس ملک کو بربادی سے بچانا، اس دھرتی کو ویرانی سے محفوظ رکھنا۔ اس سال بھی دہشت گردوں کے ہاتھوں سیکڑوں معصوموں اور بے گناہ افراد نے اپنے ناکردہ گناہوں کی سزا پائی۔ کیا گزرتی ہے ان والدین کے دلوں پر جب ان کے سامنے ان کے معصوموں کے جنازے آتے ہیں اور وہ جیتے جی مر جاتے ہیں۔ وہ کیسے جیتے ہوں گے، جن کے گھروں کے چراغ بجھ گئے اور دیکھتے دیکھتے آشیانے جل کر خاک میں مل گئے۔

یہ حقیقت ہے کہ ہر رات کے بعد صبح کا اجالا ہوتا ہے۔ ہر ماہیوی کے بعد امید کا دیا جلتا ہے، ہر زخم بھر جاتا ہے، جب وقت مرہم بنتا ہے، اس لیے اے ہم وطنو! ہمت نہ ہارنا اور قدم سے قدم ملا کر چلنا کیوں کہ نئے سال کا سورج طلوع ہونے والا ہے۔ خدا کرے کہ نیا سال ہم سب کے لیے مسرت و خوشیوں سے بھرا پیغام لے کر آئے۔ ہر دن اور ہر پل دل میں نئی امنگیں اور امیدیں پیدا ہوں۔ قائد اعظمؒ نے فرمایا تھا کہ نوجوان ہمارے ملک کا سرمایہ ہیں، اس لیے نوجوانوں کو چاہیے کہ وہ متحد ہو کر ایمانداری اور محنت سے اس ملک کی تعمیر و ترقی میں اپنا کردار ادا کریں۔

گل نسرین، اوکاڑہ

شروع کر دیں تمہیں اور اگر ان فرمائشوں کو پوری کرنے سے وہ معذوری ظاہر کرتے تو سلمیٰ ایک بار پھر اپنی قسمت کو ڈائریکٹ اور انہیں ان ڈائریکٹ گوستے اور کہکشاں کی عیاشیوں کو یاد کرتے رونے لگ جاتیں۔ انہوں نے بیوی کا یہ روپ پہلی بار دیکھا تھا۔ بڑا ہی غیر متوقع روپ تھا۔ تب ہی ہضم نہیں ہو پارہا تھا۔ پر اس کا کیا حل نکالیں وہ، سمجھنے سے وہ اب تک قاصر رہیں تھے۔ ان کی گھریلو زندگی سلمیٰ کے اس غیر ذمہ دارانہ رویے سے کافی متاثر بھی ہو رہی تھی۔

کچھ کچھ اپنی بیوی کی فطرت سمجھتے وہ ان کے جذبات کو سمجھ رہے تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ انہیں اوپر کی آمدنی کا موقع نہیں ملا۔ پر وہ دیانت دار انسان تھے وہ جس کرسی پر بیٹھے تھے روزانہ کئی ایسے مواقع ملتے تھے کہ جن سے فائدہ اٹھاتے تو سلمیٰ کو بھی سونے چاندی میں بھر چکے ہوتے پر ضمیر نے بے ایمانی کی راہ پر چلنا گوارا نہ کیا۔ اور اعلیٰ عہدے پر فائز ہونے کے باوجود حق حلال کی کمائی میں اتنی گنجائش نہ تھی کہ عیاشی بھری زندگی گزارتے۔ اور پہلے کبھی سلمیٰ بھی تو ان سے ایسے نہ لڑیں تھیں۔ سلمیٰ کا رد عمل بھی فطری تھا۔ ایک زمانے بعد اپنے بچپن کی اس سہیلی سے ملیں جسے ہمیشہ خود سے کم تر جانتی آئیں تھیں۔ سلمیٰ بنیادی طور پر ایک حسن پرست خاتون تھیں اور انہیں اپنے حسن پر غرور بھی بہت تھا۔ ایسے میں جب کہکشاں معمولی شکل و صورت کی حامل لڑکی کو عرش پر اور خود کو اس کے مقابلے میں فرش پر پایا تو برداشت نہ کر پائیں اور نصیب بنانے والے سے بھی، اور نصیب میں شامل ہونے والے سے بھی ڈھیروں شکایتیں کر بیٹھیں۔ اپنی بیگم کی فطرت اور جذبات کو سمجھتے ہوئے نیب گہری سوچ میں ڈوبے ہوئے

تھے کہ کریں تو اب کیا کریں۔

☆.....☆.....☆

کرنے میں مزید دولت کمائی جائے۔ یہ دولت کی ہوس تھی جس نے اُسے آج یہاں پہنچا دیا تھا۔ نظر لگنا برحق ہے تب ہی اللہ نے محتاط رہنے کا حکم دیا ہے مگر اس نے جی بھر کر سلمیٰ کی کم حیثیت ہونے پر مذاق اڑایا انسان خود اپنا گڑھا کھودتا ہے اور پھر خوشی سے اس میں جا گرتا ہے اور پھر اس کا الزام دوسروں پر ڈال دیتا ہے۔ کہکشاں بھی فی الوقت اپنی بربادی کا ذمہ دار سلمیٰ کو ٹھہراتی کو سے جا رہی تھی۔

☆.....☆.....☆

آج پھر سلمیٰ اور منیب کا جھگڑا ہوا تھا۔ منیب

بہت دن سے انتظار کر رہا تھا کہ سلمیٰ خود سنبھل جائے گی وقتی طور پر جذباتی ہو رہی ہے کچھ دنوں بعد پہلے جیسی ہو جائے گی۔ پر سلمیٰ تو جانے کیسی ضد کیے بیٹھی تھی کہ اُسے کہکشاں جیسا نہیں مگر آسائشیں ضرور چاہیے۔ کھٹارا کار کو بیچ کر نئے ماڈل کی گاڑی، گھر کی نئے سرے سے رینوویشن اور اپنے لیے سونے کے کنگن اس کی فوری ڈیمانڈ تھی۔ منیب اس وقت اس کے ایک ہی مطالبے کو پورا کرنے کی پوزیشن میں تھے اور راضی بھی تھے پر سلمیٰ کسی سمجھوتے کے لیے تیار نہ تھی۔ سلمیٰ کو یہ تینوں شرطیں یک بیک پوری چاہیے تھیں۔ ان کے خیال سے منیب نے اچھی خاصی رقم جمع کر رکھی تھی پر اپنی کنجوس فطرت کے باعث ان پر خرچ کرنے سے کتراتے تھے۔ اسی بات پر آج صبح ان دونوں میاں بیوی کے بیچ خوب ٹوٹو میں ہوئی اور منیب غصے کے عالم میں بنانا شتا کیے آفس کو روانہ ہوئے۔ ان کے جانے کے بعد سلمیٰ ٹی وی لگا کر بیٹھ گئیں۔ تینوں بچے اسکول کے لیے جا چکے تھے تو سکون ہی سکون تھا۔ چینل سرفنگ کے دوران ان کی نگاہیں اچانک ایک منظر پہ ٹھہر گئیں ٹی وی پر جو منظر دکھایا جا رہا تھا۔ اس میں پولیس

جس دن کہکشاں اور عمران اس دعوت سے لوٹے تھے اس کے اگلے دن سے ہی عمران کے نئے نویلے کاروبار میں کچھ مسئلہ آکھڑا ہوا تھا۔ عمران آئے دن کے مسئلوں سے سخت جھنجھلا رہ رہا تھا اور اس کا غصہ اکثر کہکشاں پر ہی نکلتا۔ کہکشاں خود محفل میں عمران کے کاروبار کا بھانڈا پھوڑ کر پریشان تھی۔ اُسے شدت سے اپنی غلطیوں کا احساس ہو رہا تھا کہ کیا ضرورت کہ چند لمحوں کی خوشی کی خاطر سلمیٰ کا دل جلانے کی اب اس کی جلن، حسد کہیں اس کی خوشیاں نہ کھا جائے۔ وہ یہ بات بھول بیٹھی تھی کہ بد نظر اپنی جگہ برحق ہے مگر دھوکہ دہی کا کاروبار چاہے کتنا ہی عام کیوں نہ ہو گیا ہو۔ ایک نہ ایک دن اپنے انجام کو ضرور پہنچتا ہے۔

وہ بھی ایک ایسی سی عام سی صبح تھی جب خاندان بھر سے اس کے گھر کال آنے لگی۔ اور ان کی زبانی جو خبر اس نے سنی، سن کر اس کے پیروں تلے زمیں نکل گئی۔ عمران کی فیکٹری کو جعل سازی کے الزام میں سیل کر دیا گیا ہے اور پولیس اُسے اپنے ساتھ تھانے لے گئی تھی۔ میڈیا بار بار یہی خبر دکھائے اور سنائے جا رہا تھا۔ زمانے بھر میں ان دونوں میاں بیوی کی خوب جگ ہنسائی ہوئی تھی۔ کہکشاں کے بھائی عمران کو تھانے سے چھڑوانے گئے تھے اور وہ روتی ہوئی گھر میں بیٹھ کر سلمیٰ کو کوس رہی تھی۔ جس کی جلن اور حسد نے اس کی خوشیاں کھا گئیں تھیں۔

بڑا المیہ ہے اللہ انسان کو اس کی غلطیوں پر جو سبق سکھاتا ہے کم عقل انسان کچھ سمجھ بیٹھتا ہے اور پھر روتا رہتا ہے۔ کہکشاں کا نصیب اچھا بنایا اللہ نے پر اس سے صبر نہ ہوا شکر نہ ہوا اور لگی عمران کو قائل

یقین رکھو۔ پھر تم نے کیوں ناشکری کی۔ تمہیں کس نعمت سے اللہ نے نہیں نوازا۔ محبت کرنے والا شوہر، اولاد، اپنا گھر، گاڑی، عزت و مقام دیا۔ اور تم نے بدلے میں کتنی ناشکری دکھائی۔ دوسرے کے نصیبوں کو کوسا کیا کوئی کسی کو خوش دیکھ کر یوں حسد میں مبتلا ہوتا ہے تمہیں کچھ پانے کی چاہ ہے تو اللہ سے مانگ لو۔ پر کسی دوسرے کے لیے شرنہ مانگو۔ جانتی ہو سلمیٰ تمہارے پچھلے رویے نے مجھے کتنی تکلیف میں مبتلا کر رکھا۔ کہکشاں سے ہوئی ایک ملاقات تمہیں یوں بدل ڈالے گی میں نے کبھی سوچا نہ تھا۔

عمران کا یوں پکڑا جانا اور خاندان بھر میں جگ ہنسانی ہونا سلمیٰ کو شدید شرمندگی کا احساس دلارہا تھا۔
”وہ برائی کی جانب گامزن تھے ان کا انجام تو یہی ہونا تھا۔“ وہ ہارے ہوئے لہجے میں بولیں تو منیب نے مسکرا کر کہا۔ ”سب جانتی ہو پھر بھی تم مجھے اس بربادی کی راہ پر چلانے پہ تکی ہوئی تھی تم۔“ منیب کی بات پر سلمیٰ روہانسی ہو گئی۔ حسد واقعی اس کی سمجھ بوجھ کو کھا گیا تھا۔ جو وہ اپنے ہی آشیاں کو آگ لگانے چلی تھی۔

”سلمیٰ اللہ کی ذات سے کبھی نا اُمید نہ ہونا۔ سیدھی راہ چلنے والوں کا سر کبھی نیچا ہوتا ہے نہ عزت پر کوئی آنچ آتی ہے۔ دولت حق حلال سے بھی کمائی جاسکتی ہے۔ بس اللہ کا شکر ادا کرنے کی ضرورت ہے۔ پریشان کیوں ہوتی ہو ہمارے بچے ہمارا سرمایہ ہیں یہ ہمیں سایہ بھی دیں گے اور پھل بھی۔“ منیب کی بات پر وہ مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگ گئیں۔ وہ اللہ کی حکمت جان گئیں تھیں۔ بعض ٹھوکر یں وہ نصیب میں اس لیے رکھتا ہے تاکہ انسان بھٹکنے سے بچ جائے۔

عمران کو اپنی کسٹڈی میں لیے تھانے لے کر جا رہی تھی وہ گم صم سی بیٹھی رہ گئی۔

کتنا اوویلا کر رکھا تھا اس نے عمران اور کہکشاں کی عیاشیوں پر۔ اور اب انہیں اس حالت میں دیکھ کر وہ نادم ہوئی جا رہی تھی۔ اسے لگنے لگا اس کی ضد، اس کی حسد، اس کے گلے شکوے کہکشاں کی خوشیوں کو کھا گئے۔ وہ ابھی شرمندہ شرمندہ سی سوچ ہی رہی تھی کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بج اٹھی۔ ریسیور کان سے لگایا تو جو خبر اسے سننے کو ملی اس نے سلمیٰ کے حواس ہی متزلزل کر دیے۔ منیب کا آفس جاتے ہوئے ایکسٹرنٹ ہو گیا تھا۔ اور وہ اس وقت اسپتال میں تھا۔ سلمیٰ کو شدت سے اپنی غلطیوں کا احساس ہونے لگا وہ وہیں بیٹھ کر رونے لگی۔ پر بیٹھ کر رونے کا کیا فائدہ، یہ بات اسے جلد سمجھ میں آ گئی۔ اس نے فون کر کے بھائی کو گھر سے بلایا اور اس کے ساتھ اسپتال پہنچ گئی۔

صد شکر ایکسٹرنٹ شدید نوعیت کا نہیں تھا۔ ہلکی پھلکی چوٹیں آئیں تھیں منیب کو۔ جن کی مرہم پٹی کر کے شام تک اسے ڈسچارج کر دیا گیا۔ سلمیٰ نادم سی منیب کا ہاتھ تھامے اپنے پچھلے رویے کی ان سے معافی مانگ رہی تھی۔ شرمندگی اس کے چہرے پر عیاں تھی۔ آج صبح سے ہونے والے دونوں واقعات نے اسے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ منیب نے سلمیٰ کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھامتے ہوئے نرمی سے کہنا شروع کیا۔

”سلمیٰ یہ کہاں کی عقلمندی تھی کہ کسی دوسرے کو عیش و عشرت میں دیکھ کر بندہ اپنا ماتھا بھی پھوڑے اور دوسروں کی خوشیوں پر بھی نظر لگا ڈالے۔ تم نے اللہ کی ذات سے مایوس ہونا کب سے شروع کر دیا۔

اللہ تو بادشاہ سے سخی بادشاہ۔ وہ تو کہتا ہے جو مانگتا ہے مجھ سے مانگو، میں دوں گا تمہیں، مجھ پر

For More Visit
Paksociety.com

دوشنبہ 221

READING
Section

کولہو کا ٹیکل

”رقیہ بیگم حامی بھرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ رقم پس انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے گھر والوں کی ضرورتوں اور فرمائشوں کے بعد جو رقم بچتی ہے وہ مہینے بھر کے راشن پہ صرف ہو جاتی ہے اپنی بائیک کا پیٹ بھرنے کے لیے مجھے اور ٹائم لگانا پڑتا ہے۔ آج عمران.....“

سالہ اولیس تھا جو 5th کلاس میں پڑھ رہا تھا۔ پچاس کے پیٹے میں تھے لیکن نوجوانوں کو مات دے دیتے تھے نہ صرف وہ روزانہ اپنے حصے کا کام کر سکتے بلکہ اور ٹائم بھی لگاتے تھے۔ روزانہ کی بنیاد پر دھیر سا کام کرنا اور پھر گرتی صحت نے ان کی نفس بہتر رقیہ بیگم کو بے چین کر دیا تھا۔ وہ اپنے طور پر انہیں سمجھاتی رہتی تھیں مگر وہ ان کی کسی نصیحت کو کسی ہدایت کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ان کی زندگی سراپا جدوجہد تھی۔

حسب معمول آج مہینے کی 7 تاریخ تھی اور سب نے اپنی ضروریات فرمائشیں اور آرزوئیں ان کے گوش گزارنی شروع کر دیں۔

”ابو آج مل والوں سے ایڈوانس لے کر انشالمنٹ پر میرے لیے بائیک لے آئیے گا۔ میرے سب دوستوں کے پاس ہے۔ بہت شرمندگی کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور پھر ماریہ بھی تو لوکل بسوں کے دھکے کھاتی کالج پہنچتی ہے۔ اگر بائیک آجائے گی تو اُسے بھی سہولت ہو جائے گی

آج مہینے کی سات تاریخ تھی۔ 7 کا ہندسہ ایک نڈل کلاس ٹیکل کے لیے کتنی اہمیت کا حامل ہوتا ہے یہ تو کوئی ان سے پوچھے ہر دن ہر لمحہ ہر ایک تمنا خواہش اور آرزو کو دبا کر ان کی تکمیل کے لیے ایک مخصوص دن کا انتظار کرنا بہت کٹھن اور دشوار ہونے کے ساتھ ساتھ از بسکہ لذت انگیز بھی ہوتا ہے اپنوں کی خوشی و انبساط اپنائیت و خلوص کے چھوڑوں سے ہی تو زندگی کی نیا چلتی رہتی ہے۔ گھر والوں کے دکتے چہرے، فضا میں تحلیل ہوتے قہقہے، لہجوں میں طمانیت..... زیست میں سکون و آرام سے ہی زندگی ایک زندگی کو سہارا دیتی ہے..... کیسے ایک زندگی اپنا جیون دان کرتی ہے کیسے کسی کو ہنتے ہنتے کولہو کا ٹیکل بننے پر اکساتی ہے کیسے کسی کو ان تھک سعی کے لیے آمادہ کرتی ہے یہ تو اظہر بیگ ہی جانتے ہیں۔

اظہر بیگ ایک ٹیکسٹائل مل میں ملازم تھے۔ ان کی تین اولادیں تھیں۔ بڑا بیٹا عمران بی بی کام کر رہا تھا۔ چھوٹی بیٹی ماریہ ایف اے میں اور پھر درس

ڈنر کریں گے اور موج مستی کریں گے۔“ اظہر بیگ چیک کر بولے تھے۔

”ہرا!“ ماریہ نے خوشی سے نعرہ لگایا اور عمران اور اولیس نے اس کا ساتھ دیا تھا۔

”آپ کو بھی کچھ چاہیے بیگم تو آپ بھی مانگ لیں مابدولت تیار ہیں۔“ انہوں نے شرارتی لہجے میں اپنی کھٹارا بائیک اشارت کرتے ہوئے رقیہ بیگم سے پوچھا تھا۔

”مجھے بس ایک سفید رنگ کا لان کا سوٹ چاہیے۔ آپاٹریا کے ہاں اگلے ہفتے میلاد میں جانا ہے۔ وہ ڈائمنگ ٹیبل سے برتن اٹھاتی مختصر ابولی تھیں اظہر بیگ سر اثبات میں ہلا کر کام پر چلے گئے۔

☆.....☆.....☆

شام کو صحن میں نئی موٹر سائیل کھڑی تھی اولیس کے رنگین مارکرز نیا یونیفارم نئے شوز اور سائیکل کے ساتھ ساتھ دو عدد لان کے فینسی اور پلین سوٹ بھی آچکے تھے۔ سب کی خوشیوں کا کوئی

میں اُسے پک اینڈ ڈراپ دے دوں گا۔“ عمران آلیٹ اور بریڈ کا ناشتا کرتے ہوئے بہت روہانسا ہو کر گویا ہوا چونکہ دلیل معقول تھی۔ سو انہوں نے حامی بھری تھی عمران بے طرح خوش ہو گیا۔ اس کے چہرے کی چمک دل کی خوشی دیکھ کر ان کا سیروں خون بڑھ گیا تھا۔

اب بھلا اولیس کہاں پیچھے رہ سکتا تھا فوراً سے پیشتر ٹھکھکتے ہوئے بہ عجلت بولا۔

”ابو مجھے رنگین مارکرز نیا یونیفارم نئے شوز اور سائیکل چاہیے۔“

”ٹھیک ہے بابا مل جائیں گی چیزیں۔“ وہ مسکرائے۔

”اور ابو مجھے ایک خوبصورت سافینسی کوٹ چاہیے میری فرینڈ کی شادی ہے، پنک کلر میں لے آئیے گا۔“ ماریہ بھی چپکی نہ رہ سکی اور حسب معمول اس کی فرمائش بھی نوٹ کر لی گئی تھی۔

”شام تک سب کی چیزیں بھی آجائیں گی اور پھر ہم سب قریبی ہوٹل میں ہمیشہ کی طرح آج



READING
Section

ٹھکانہ نہ تھا۔ رات کا کھانا سب نے ایک قریبی ہوٹل میں کھایا تھا۔

رات گئے تک باہر ہلہ گلہ کرنے کے بعد وہ لوٹے تھے جیسے ہی اظہر بیگ بستر پر دراز ہوئے رقیہ بیگم ان کو دبانے کی غرض سے ان کے پاس آ بیٹھیں۔

”ایک بات کہنی ہے آپ سے۔“

پاؤں دباتے ہوئے وہ آہستگی سے بولی تھیں۔

”کہو۔“ وہ سیدھے ہو بیٹھے۔

میں نے یہ کہنا ہے کہ اگلے مہینے سے تنخواہ سے چھ ہزار الگ سے مجھے دینے ہیں باجی ثریا چھ ہزار سے پورے دو لاکھ کی کمیٹی ڈال رہی ہیں۔ مجھ سے انہوں نے پوچھا تو میں نے حامی بھری یہ سوچ کر کے ابھی سے ماریہ کا جہیز بنانا شروع کروں گی تو کچھ ہوگا ورنہ ہرگزرتے دن کے ساتھ بڑھنے والی مہنگائی جہیز کہاں بن پائے گا۔ اتنا سننا تھا کہ ان کے چہرے پر تفکرات کے سائے پھیلنے لگے پھر کمرے کے سناٹے میں ان کی آواز گونجی۔

”رقیہ بیگم حامی بھرنے سے پہلے مجھ سے تو پوچھ لیا ہوتا۔ رقم پس انداز کرنا ممکن ہی نہیں ہے گھر والوں کی ضرورتوں اور فرمائشوں کے بعد جو رقم بچتی ہے وہ مہینے بھر کے راشن پہ صرف ہو جاتی ہے اپنی بائیک کا پیٹ بھرنے کے لیے مجھے اور اور ٹائم لگانا پڑتا ہے۔ آج عمران کی بائیک بھی انسٹالمنٹ پہ لے آیا ہوں وہ الگ مسئلہ ہے پھر سے یہ چھ ہزار.....؟ یہ چھ ہزار کہاں سے آئیں گے.....؟

حد درجہ پریشانی سے انہوں نے اپنا مدعا بیان کیا تھا۔ مگر رقیہ بیگم اپنے موقف سے ایک انچ بھی

پچھے ہٹنے کو تیار نہ تھیں۔

”میں کچھ نہیں جانتی جیسے بھی ہو کام کرنا

ہے۔“ زندگی میں پہلی بار وہ اپنی ضد پر اڑی تھیں۔ اظہر بیگ کو دکھ سا ہوا رقیہ بیگم کے منہ سے یہ سن کر مگر انہوں نے طبیعت فراخ دلانہ کے ہاتھوں مجبور ہو کر حامی بھری تھی اور آئندہ چند دنوں میں ان کے گھر سے تیسری گلی میں انہیں چار بچوں کی ہوم ٹیوشن مل گئی تھی۔ محلہ داروں نے اس کام میں ان کی بھرپور مدد کی۔

☆.....☆.....☆

اظہر بیگ نے رقیہ بیگم کی بات مانتے ہوئے چار بچوں کی ہوم ٹیوشن تولے لی تھی مگر پہلے کی طرح وہ اور ٹائم لگا کر گھر شام سات بجے نہیں لوٹ پارہے تھے بلکہ اب 9 بجے ہی گھر کے درشن ہوتے تھے۔ سب لوگ اپنی اپنی جگہ شاداں و فرحاں تھے لیکن بہت زیادہ کام ان کی صحت روز بہ روز بگڑتی جا رہی تھی۔ حالانکہ ڈاکٹرز نے انہیں زیادہ کام کاج کرنے سے منع کیا ہوا تھا اس کے باوجود وہ محنت سے جی نہ چراتے تھے۔

ایک دن گھر لوٹتے ہی ان کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی۔ رقیہ بیگم اور عمران ان کو فوراً لے کر قریبی ہوسپتال آ گئے۔ تمام میڈیکل چیک اپ کی رپورٹس کو سامنے رکھ کر ڈاکٹرنے یہ خبر سنائی کہ اظہر بیگ کو ہپاٹائٹس کا مرض لاحق ہو گیا تھا۔ اس خبر نے رقیہ بیگم اور گھر والوں کے پاؤں تلے سے زمین کھینچ لی ان پر جو بیٹی سو بیٹی اظہر بیگ پہ تو ایک قیامت ٹوٹ گئی تھی۔

ابھی تو انہوں نے اپنی فیملی کے ڈھیر سارے سنے پورے کرنے تھے..... ابھی تو انہوں نے اپنے بچوں کو اسٹیبلس کرنا تھا..... ابھی تو انہوں نے زندگی کا ایک لمبا سفر طے کرنا تھا..... تو پھر یہ

کیا؟

زندگی زندگی سے اتنی جلدی کیسے ہاں سکتی تھی؟

آرام.....

پرہیز.....

اور اتنا لمبا اور مہنگا علاج.....

بہت سے سوالات ناگ کی مانند پھن پھلائے ان کے گرد گھیرا ڈال کے بیٹھ گئے تھے۔

کوئی بھی رقم تو پس انداز نہ تھی۔ لگی بندھی تنخواہ جو کے مہینے کے آخر تک ختم ہو جاتی تھی۔ پراپرٹی میں لے دے کے فقط ایک مکان ہی ان کی ذاتی ملکیت تھی جس میں وہ رہائش پزیر تھے۔

سوچوں کی یلغار نے انہیں ادھ موا کر ڈالا تھا۔ اگرچہ گھر والوں نے انہیں بھرپور حوصلہ دیا تھا مگر حوصلے سے پیٹ نہیں بھرا کرتا۔

رقیہ بیگم کے پاس ایک پرانا گولڈ کا سیٹ پڑا ہوا تھا انہوں نے علاج کی غرض سے فوراً بیچ ڈالا۔

وہ اچھے داموں فروخت ہو گیا تھا۔ سو چند دن اچھا علاج ہوتا رہا، اظہر بیگ ہو سہل میں ایڈمٹ رہے۔ کچھ دن بعد جب طبیعت سنبھلی تو وہ دوبارہ سب کے منع کرنے کے باوجود مل جانے لگے۔

ان کے اندر کے کولہو کے بیل نے انہیں آرام نہ کرنے دیا۔ بس اتنا ہوا کہ انہوں نے ہوم ٹیوشن چھوڑ دی تھی۔

حالات کی نزاکت کو مد نظر رکھتے ہوئے رقیہ بیگم نے نہ صرف سلائی کڑھائی شروع کر دی بلکہ گھر میں ایک سلائی سینٹر بھی کھول لیا جس سے گزر اوقات ہونے لگی۔

اب وقت نے ایسی کروٹ لی کہ اظہر بیگ کے دل کی تمنا بار آور نہ ہو پائی تھی وہی ایک تمنا، ایک خواہش..... ایک ارمان کہ وہ اپنی فیملی کو خوشی و انبساط کے لبادے میں لپٹا ہوا دیکھیں

کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ ان کی آدھی سے زیادہ تنخواہ تو میڈیسن پر خرچ ہو جاتی ہے اور جو باقی بچتی ہے اس کا بھی زیادہ حصہ ان کی خوراک، میڈیسن پر خرچ ہو جاتا ہے اور بعض اوقات تو ایک روپیہ تک نہیں بچ پاتا۔

رفتہ رفتہ یوں ہونے لگا کہ وہی فیملی جن کے روشن چہروں کے لیے جن کی ایک مسکراہٹ کے لیے جن کی زندگی سے بھرپور تہمتوں کے لیے وہ کولہو کے بیل بنے ہوئے تھے وہی اب ان سے کھچے کھچے رہنے لگے۔ رقیہ بیگم بھی بہت سنجیدہ اور چڑچڑی سی رہنے لگی تھیں۔ غربت کے سائے کیا گہرے ہوئے کہ گھریار کی نیندیں اچاٹ ہو گئیں۔ تین بچے، بچوں کی ڈھیروں ضروریات اور ایک بیمار شوہر..... رقیہ بیگم کی زندگی بوکھلا کر رہ گئی تھی کوئی بھی گھر میں بات ہوتی تو وہ مخاطب کو کاٹنے دوڑتیں۔

مشینوں کی کھٹا کھٹ نے ان کے دل سے ہر شے کے احساس کو ختم کر دیا تھا حتیٰ کہ وہ عالم پریشانی میں آج کل ایک نئی سچ پہ سوچنے لگی۔ دن رات یہی دسوے ان کے دل میں اجاگر ہوتے کہ اگر گھر سے بیماری ختم ہو جائے تو اس سلائی کی کمائی تو بیچ ہی سکتی ہے۔ اگر وجود بوجھ کی صورت معلق ہوا تو اسے اتار دینا ہی بہتر ہوتا ہے۔

کبھی یہ خیالات ان کے اندر ادھم مچاتے۔ اے میرے رب تو اس بیماری کو دور کر دے یا پھر.....؟

پیٹ کی بھوک کتنی ظالم شے ہوتی ہے جو ہمارے بہت پیارے اور حقیقی رشتوں کے احساس کو بھی کچل کر رکھ دیتی ہے۔ رقیہ بیگم کو اظہر بیگ نے اپنی بساط کے مطابق ہمیشہ خوش رکھا تھا۔ وہ تو فیملی پر اپنی جان چھڑکتے تھے کم تو رقیہ

☆.....☆.....☆

گھر میں رکھی جانے والی ہر چیز سے انیت
سی ہو جاتی ہے خواہ وہ بیری کا درخت ہی کیوں نہ
ہو۔

بیری کے درخت کو بھی اگر کاٹ دیا جائے تو
چند دن اس کا بھی سوگ منایا جاتا ہے اور یہاں تو
معاملہ ایک جیتے جاگتے انسان کا تھا جو سب کی
خوشیوں کا ضامن تھا، جو فیملی کے لیے کولہو کا بیل بنا
ہوا تھا۔ جس نے ہر پل فیملی کی خوشی کو مقدم جانا تھا
اور اب وہ منوں مٹی تلتے تھا۔

رقیہ بیگم اور تینوں بچے پھوٹ پھوٹ کر رو
دیے۔
پتا نہیں اظہر بیگم کی موت پر یا پھر اپنے
رویوں پر۔

بہر حال انہیں سپرد خاک کر دیا گیا۔

قرآن خوانی ہوئی۔

دیکھیں پکیں۔

لوگ تعزیت کے لیے آئے اور چلے گئے۔

رقیہ بیگم کے رُور و کر برا حال تھا۔ کچھ بھی ہوا

وہ ان کے سر کا سائیں اور سائبان تھا۔

تعزیت کے لیے آنے والی ایک خاتون نے

جب انہیں اس طرح بے حال دیکھا تو ان کے

آنسو پونچھتے ہوئے ان کی بے آسرا سوچوں کو

ایک نئی دکھا دی تھی۔ جوان کے بڑے بیٹے عمران

پر جا کر ختم ہوئی تھی۔

رقیہ بیگم کے آنسو ختم گئے۔ چہرے پر سکون

اطمنانیت آٹھہری۔ ایک حوصلہ ایک امید رگ

وپے میں دوڑ گئی۔

انہیں یوں لگا جیسے کسی سائبان نے انہیں

اپنے حصار میں لے لیا ہو۔

جیسے زندگی ریگستان سے نخلستان میں تبدیل

بیگم بھی نہ رہیں تھیں مگر اب ایک طرف بچوں کی
بھوک تھی ان کی ضرورتیں تھیں..... اسٹڈی کا
اڑدھام تھا تو دوسری طرف ایک بوجھ..... ایک
سکتی تڑپتی زندگی کو مزید سکانے والا مزید.....
انہیں اس وقت سے ڈر لگنے لگا جب یہ گھر بھی
ان سے چھن جاتا.....

کیونکہ یہ بیماری ان کی زندگیوں سے امر بیل
کی مانند لپٹی جا رہی تھی۔ ان کی ضرورتوں تک کو
دیکھ لگ رہی تھی۔ اظہر بیگم اب بستر پر ہی
دراز ہو گئے تھے۔

ہر لمحہ ہر پل ماتم سراتھا۔

کیا ہو کہ اگر وہ خوراک کی مقدار کو دو گنا کر
دیں.....؟ یا خوراک دے ہی نہ پائیں۔

کیا ایسے کچھ جائیں بچ جائیں گی؟ کیا یہ سودا
ستا تو نہیں تھا.....؟“

اندر سے متواتر اظہر بیگم کی آوازیں آرہی
تھیں۔ ان کی خوراک کا وقت ہو چکا تھا۔ رقیہ بیگم
نے ایک جھرجھری سی لی۔

وہ لمحوں کا سفر صدیوں میں طے کر کے ان
کے کمرے میں پہنچیں۔ ان کے چہرے پر حسرتوں
کا ہجوم آنکھوں میں ویرانی ہونوں پہ
ڈھیروں شکوے اور چال میں اضطراب
اور صدیوں کی تھکن تھی۔

ان کی نظر میں کچھ ایسی بے رُخی تھی کہ اظہر
بیگم سہہ نہ سکے اور پھر رقیہ بیگم کو کچھ بھی نہ کرنا پڑا
اور ان کی زندگی بیماری کے بوجھ سے ہمیشہ کے
لیے آزاد ہو گئی تھی۔

اب کہیں کوئی دیکھ نہیں تھی.....

کہیں کسی کے کھانسنے کی آواز نہ تھی.....

کہیں کسی میڈیسن کی ضرورت نہ تھی.....

اظہر بیگم اس دنیا سے منہ موڑ گئے تھے.....

ہو جائے۔ لوگوں کے درمیان بیٹھے اپنے بیٹے کو انہوں نے بہت پر شوق اپنائیت اور گہری نظروں سے تاکا تھا۔ اس کا چھ فٹ قد، چورے، مضبوط شانے اب یہ بوجھ اٹھا سکتے تھے۔

اس زیت کو چلا سکتے تھے۔۔۔

سو گزرے کے دنوں میں رقیہ بیگم کا سارا پیار، ساری توجہ، سارے التفات، ساری عنایتیں، نوازشیں عمران کے حصے میں آ گئی تھیں۔ اب اُسے اس گھر کے لیے کولہو کا نیل جو بننا تھا۔

عمران کی عادتوں اور حرکات سے وہ بخوبی واقف تھیں اب وہ اس کی نفسیات بھی باریک بینی سے جانچنے لگی تھیں۔

کسی رشتہ دار کی وساطت سے رقیہ بیگم کی دعاؤں کو قبولیت نصیب ہوئی۔

دعا میں بامراد ہو میں..... مستجاب ہوئیں اور عمران کو ایک بہت اچھے کالج میں بطور لیکچرار جاب مل گئی حالانکہ وہ صرف B.com تھا مگر کالج کو جزوقتی لیکچرار کی ضرورت تھی سو اُسے رکھ لیا گیا۔

نیاز دلوائی گئی، شیرنی تقسیم ہوئی، محفلیں کروائی گئیں، آنکھیں پھر سے روشن خواب دیکھنے لگیں۔

زندگی نے دھنک رنگ اوڑھ لیے۔ شگوفے پھر سے چٹکنے کو بے تاب ہو گئے۔ خوشیوں نے دیر بعد ہی سہی مگر اس گھر کا رستہ پھر دیکھ لیا تھا۔

آج مہینے کی سات تاریخ تھی۔ عمران کو اج ہی سیلری ملنا تھی۔ آج کا دن فرمائشوں کا دن تھا، ضرورتوں کو سہارا ملنا تھا۔ تمناؤں کو ٹھکانہ ملنا تھا۔ ڈنر باہر کرنا تھا۔ ”بھائی مجھے نیو بیگ چاہیے۔“

عمران آئینے میں خود کا جائزہ لے رہا تھا کہ

اولیس نے فرمائش کہہ ڈالی۔

”اور بھائی مجھے دو عدد لان کے سوٹ اور

ایک کڑھائی والی بلیک چادر چاہیے۔“

ٹی وی لائونج کے ایک گوشے سے ماریہ کی

آواز ابھری۔

”اور ہاں مجھ سے گھر بار کی مہینہ بھر کی راشن

کی لسٹ ضرور لے جانا۔“ رقیہ بیگم نے ڈالر سے

کہا تھا۔

”امی! آپ اپنے سلائی سینٹر سے ضروریات

زندگی پہلے بھی پورا کرتی تھیں تو اب کیوں

نہیں.....؟ میں اپنی تنخواہ ان فضولیات میں نہیں

جھونک سکتا لو بتاؤ بھلا بندہ پورا مہینہ اپنی جان

جو کھوں میں ڈالے رکھے اور جب پھل کھانے کا

ٹائم آئے تو دوسروں کی جھولی میں ڈال دے۔

مجھے ابھی اور پڑھنا ہے اور اپنا مستقبل بنانا ہے اگر

میں ضروریات زندگی نبھانے تک محدود رہ گیا تو

میرے خوابوں کو کہیں پناہ نہ ملے گی اور اگر خواب

نہ رہے تو میری ہستی کہاں رہے گی۔“

عمران نے بے حد رکھائی سے کہا تھا رقیہ بیگم

پہ تو ساتوں آسمان آگرے تھے۔

بلبلیں چہکنا بھول گئیں اور ہواؤں نے دم

سادھ لیا تھا۔ ان کے کولہو کے نیل نے توفی الفور

ر سے تڑوا لیے تھے۔

رقیہ بیگم کو بہت جلد شوہر اور بیٹے کا فرق معلوم

ہو گیا تھا۔ ان کی آنکھوں کی پتلیوں میں حیرت گڑ

گئی تھی۔

عمران کی باینک دھواں اڑاتی اپنی منزل کی

جانب گامزن تھی اس بات سے بے خبر کے اس

کے دھویں میں کتنے لوگوں کا چہرہ دھواں دھواں

ہور ہا تھا۔

☆☆.....☆☆

دوشیزہ 227

READING
Section

نصیب کے مذاق

وہ لڑکا مایوس سا اس پارک کے پاس فٹ پاتھ پر چلنے لگا اور عین اس بیچ کے پاس اس کی جیب سے کچھ گرا۔ میں پیچھے پیچھے تھا، اور مجھے معلوم تھا وہ کیا ہے، وہ تھوڑی آگے گیا تو میں نے وہ چیز اٹھالی، وہ تہہ کیا ہوا وہی بانڈ تھا۔ شاید اُس کی جیب میں سوراخ تھا۔ میں نے کھول کر.....

ہے۔ فضل کے ابا نے صاف منع کر دیا۔
 ”تو پھر.....؟ رضہ نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ تمہیں پتا ہے چار پانچ دن رہ گئے ہیں۔ کیم کو تو قرعہ اندازی ہوتی ہے۔“
 تم فکر نہ کرو۔ پیسوں کی جگہ میں یہ تین ہزار کے بانڈ لے آئی ہوں۔ تم تین چار دن ضمانت کے طور پر اپنے پاس رکھ لو۔ اللہ نے چاہا تو میں کسی طرح رقم کا بندوبست کر کے بانڈ چھڑ والوں گی۔ فضل کے ابا سے چھپا کر لائی ہوں۔
 ”لیکن میں بانڈز کا کیا کروں گی..... انہیں کون لے گا؟“

بانڈ بھی تو پیسے ہوتے ہیں۔ کہیں سے بھی آسانی سے کیش کروائے جاسکتے ہیں۔ اب اتنی بے اعتباری تو نہ کرو۔ برا وقت سب سے آتا ہے۔
 ”تم کہتی ہو تو رکھ لیتی ہوں..... لیکن یاد رکھنا اگر مقررہ وقت پر رقم نہ ملی تو پھر میں بانڈ ہی کمیٹی میں دے دوں گی۔“ رضیہ نے باور کروایا۔
 ”کوئی بات نہیں..... فضل کے ابا کا تو بہانہ

دس سالہ اصغر لاؤنج میں فٹ بال کے ساتھ چھیڑ خانی کر رہا تھا۔ کبھی ہاتھوں میں گھماتا اور کبھی زمین پر رکھ کر پاؤں سے مختلف کرتب دکھاتا..... کھیلنے کی اجازت نہ تھی کہ لاؤنج میں بھی چیزیں ٹوٹ سکتی ہیں۔ ویسے اس کے خیال میں اس پھٹ پھر سے لاؤنج میں ایسی کوئی قیمتی چیز نہیں تھی۔ جس کے ٹوٹنے کا اصغر کے خیال میں کوئی ملال ہو سکتا تھا۔ لیکن امی کا حکم تھا آج ہلکے بخار کی وجہ سے اس نے اسکول کی چھٹی کی تھی۔ اس وجہ سے باہر جا کر بال سے کھیلنے پر پابندی تھی..... ورنہ امی تو ایک روپیہ روزانہ دیتی تھیں، آج وہ بھی نہیں ملتا۔ سبھی پڑوسن جمیلہ آئی جلدی میں اندر آئیں۔
 ”امی کہاں ہیں اصغر.....؟ اور تم اسکول نہیں گئے.....؟“

”بخار ہے..... وہ بے دلی سے بولا..... تبھی اندر امی اندر سے نمودار ہوئیں۔“ اوہ یہ تم ہو جمیلہ کمیٹی کی رقم لے آئیں.....؟“
 ”کہاں رضیہ..... آج کل ہاتھ بہت تنگ

تھا۔ میں نے خود ہی پائی پائی رقم جوڑ کر خریدے ہیں..... کہ شاید کبھی ہماری بھی لائری لگ جائے۔“

”چلو ٹھیک ہے۔“

”اچھا میں چلتی ہوں..... سارا کام پڑا ہے۔“

جمیلہ آئی نکل گئیں تو امی اندر کمرے میں

ہے۔ جس کے بس خواب ہی دیکھا کرتا تھا۔ یہ سوچتا ہوا وہ ایک شاندار بیکری میں داخل ہو گیا۔ لیکن اُس کی امیدوں کے برعکس وہ کہیں سے کچھ نہ خرید سکا کیونکہ بانڈ لینے کے لیے کوئی تیار نہ ہوا۔ سب کو نقد رقم چاہیے تھی۔ وہ مایوس ہو کر فٹ پاتھ پر چلنے لگا۔ کتنی دیر بے کار گھومنے کے بعد گھر جانے کا قصد کیا۔ بانڈ واپس رکھنا بھی ایک مرحلہ



تھا۔ اُسے بار بار یہی خدشہ ستا رہا تھا کہ اگر امی نے پہلے بانڈ چیک کر لیے تو کیا ہوگا۔ اس کے اتنی دیر گھر سے غائب رہنے پہ یقیناً اسی پر شک جائے گا۔ کیونکہ پہلے بھی چھوٹی موٹی رقم چرانے پہ پکڑا گیا تھا۔ وہ چار چوٹ کی مار کھا کر اس کا کیا حال ہوتا تھا..... سوچ کر ہی سہم گیا۔ اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ امی ابھی تک کچن میں مصروف تھیں۔ وہ اندر آیا اور جلدی سے جیب میں ہاتھ ڈالا..... اور پھر دھک سے رہ گیا۔ دل ایک دم بیٹھ گیا۔ اُسے پتا

کنیں اور بانڈ جلدی سے الماری میں کپڑوں کے نیچے گھسا کر کچن کی طرف بھاگیں..... اصغر وہیں کھڑا الماری کی طرف دیکھتا رہا۔ شاید کشمکش میں تھا۔ آخر ادھر ادھر دیکھ کر الماری کی طرف بڑھا۔ کپڑے اوپر کیے اور ایک بانڈ کھینچ کر ہاتھ میں دبایا..... اور چوری کر کے گھر سے نکل گیا۔ گلی کے کونے میں نظریں بچا کر چھپ کر دیکھا تو پچاس روپے والا بانڈ تھا۔ اور یہ سوچ کر وہ خوشی سے دیوانہ ہو رہا تھا کہ اتنی رقم سے وہ کیا کچھ کھا پی سکتا

تھا پتلون کی جیب میں سوراخ ہے جو خاصا بڑا ہو چکا تھا..... اس نے دل میں سوچا بھی تھا کہ پتلون کی جیب میں کچھ نہیں ڈالے گا۔ یاد رکھے گا کہ وہ پھٹی ہوئی ہے۔ لیکن گھبراہٹ اور مایوسی اور ڈر میں بھول گیا۔ تبہ کیا ہوا بانڈ نہ جانے کہاں گر گیا تھا۔ جو واپس جا کر ڈھونڈنے کے باوجود بھی نہ مل سکا۔ وہ سارا دن نڈھال سا سڑکوں پر پھرتا رہا اُسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ گھر واپس کیسے جائے.....؟ جائے یا نہ جائے.....؟ اور اگر نہ جائے تو کہاں جائے.....؟“

☆.....☆.....☆

شہر کے سب سے پوش علاقے میں ہزار گز پہ بنا وہ خوبصورت گھر پوری آن بان سے کھڑا تھا۔ خوبصورت لان رنگارنگ دلفریب پھول اور گہری سبز گھاس اس کی خوبصورتی کو چار چاند لگا رہی تھی۔ اندرونی عریض قیمتی اشیاء اور ڈیکوریشن پیمز سے سجے ڈرائنگ روم میں دو نفوس محو گفتگو تھے۔ سامنے کرسٹل کے ٹیبل پہ قیمتی اور نفیس چائنا کی پیالیوں میں بہترین کافی اور ڈرائی فروٹ رکھے تھے۔ جو دونوں کبھی کبھی اٹھا کر منہ میں ڈالتے اور پھر کافی کے سپ سے لطف اندوز ہوتے۔“

”پچیس سال..... پورے پچیس سال بعد ہم دونوں دوست ملے ہیں۔ مہمان کاشف کی پرسوج نگاہیں میزبان افروز کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔“

ان پچیس سالوں میں تم زمین سے آسمان پر آ گئے..... کہاں رہ گیا وہ افروز جو اپنی دادی سے نظریں بچا کر ان کی رقم یوں اڑاتا تھا کہ دادی کو پتہ ہی نہ چلتا تھا۔“

”پتا کیسے چلتا.....؟ ہاتھ کی صفائی بھی آخر

کوئی چیز ہے..... اور میں تو بچپن سے ماہر رہا ہوں ان کاموں میں.....“ افروز کے چہرے پہ فکر کے ساتھ ساتھ غرور بھی تھا۔ ”ان کاموں میں..... کاشف نے زیر لب دہرایا۔ ٹھیک کہتے ہو تم یا تم نے تو اپنے ماں باپ تک کو ہوا لگنے نہیں دی۔ وہ تمہیں ہمیشہ معصوم ہی سمجھتے رہے۔“

افروز نے زندگی سے بھرپور قہقہہ لگایا اور کاشف کے کندھے پہ ہاتھ مارا۔

”تم جانتے ہو میں ہاتھ کی صفائی میں پرفیکٹ ہونے کے علاوہ بہترین ایکٹر بھی تھا۔“

اسکول کالج میں ڈراموں میں لیڈنگ رول کرتا تھا۔ پھر دادی اور اماں ابا کو کیسے پتا چلتا۔ دادی تو اپنی دولت پہ سانپ کی طرح بیٹھی رہتی تھیں۔ آخری عمر میں انہیں یہی ڈرتھا کہ کوئی ان سے سب کچھ چھین لے گا۔ دن میں کوئی بیس بار تکیے کے نیچے سے اپنا بٹا نکالتیں اور پیسے گنتی تھیں۔ اور ہر بار واویلا مچاتی تھیں کہ میرے پیسے چوری ہو رہے ہیں۔

”تو یہ غلط تو نہیں تھا.....“ کاشف نے معنی خیز نظروں سے اُسے دیکھا۔

”ہاں..... لیکن میری معصوم صورت اور حیران آنکھیں اماں اور ابا کو ہمیشہ دھوکہ دے جاتی تھیں..... وہ دل میں یہی سمجھتے ہوں گے کہ بڑھیا سٹھیا گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ ماں تھی..... الفاظ زبان پہ نہیں لاتے تھے۔“

اس نے جیب سے طلائی سگار کیس نکالا ایک سلاک کر ہونٹوں میں لگایا اور پھر کیس کاشف کے سامنے کر دیا۔ اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”میں نہیں پیتا.....“

”شوق نہیں..... یا گنجائش نہیں.....“ کاشف کو محسوس ہوا کہ اُس کی آنکھوں میں معمولی

سے طنز کی جھلک تھی۔ اُسے جانے کیوں افسوس ہوا۔ اپنی معمولی حیثیت نے دل میں کسک سی پیدا کر دی۔

تم سے تو اپنے ماں باپ کو بھی نہیں چھوڑا۔ شاید بدلہ لینے کی خواہش یہ جملہ کاشف کی زبان پہ لے آئی۔ افروز برا ماننے کے بجائے ہنس پڑا۔

”وہ دونوں کون سا کم تھے۔ پیسہ جیب سے نکالتے جان جاتی تھی ان کی۔ پھر مجھے روپے حاصل کرنے کے لیے کچھ تو کرنا تھا۔ کام چور میں ہمیشہ سے ہوں۔ کچھ کرنے کو بھی دل نہیں چاہا۔ محنت سے مجھے نفرت تھی۔ آرام طلب بھی جی بھر کے تھا۔ پاس بھی مشکل سے ہوتا تھا..... تم تو سب جانتے ہو.....“

”ہاں میں سب جانتا ہوں..... سونے پہ سہاگہ یہ کہ تم عشق میں گرفتار ہو گئے۔“

”ہاں دل پہ زور نہیں چلا ورنہ نیلم سے کبھی عشق نہ کرتا۔ بڑا نارگٹ تو عنبرین تھی، وہ دولت مند مغرور حسینہ..... اُسے پہانسا چاہتا تھا لیکن نیلم کی محبت میں پھنستا چلا گیا۔ اُسے دیکھتے ہی دل زور سے دھڑکنا شروع کرتا..... اور پھر اس کی طلب بڑھتی گئی وہ تو اماں کو بھی پسند آگئی۔ ورنہ مصیبت ہو جاتی۔ بس اسی میدان میں ناکام ہوا۔“

”ناکام.....؟ لیکن نیلم بھابی سے شادی تو ہو گئی تھی تمہاری.....؟“

ارے سمجھا کرو یار میرا مطلب ہے میں تو عنبرین کو پہانسا چاہتا تھا۔ لیکن قدرت کو شاید منظور ہی نہ تھا۔ اس کی بے پناہ دولت میرے نصیب میں نہیں تھی۔

”جلو دولت تو آخر تمہیں مل ہی گئی نا.....“

تمہاری ساری حسرتیں پوری ہو گئیں۔ جو چاہتے تھے مل گیا اور ساتھ ساتھ نیلم بھابی کی محبت سے بھی ہاتھ نہیں دھونے پڑے۔ بڑے خوش ہو یار۔

وہ تو ہوں..... اب تم میرے ساتھ موازنہ کرو۔ ہم دونوں ہم عمر ہیں لیکن تم مجھ سے دس سال بڑے لگتے ہو۔ میں پچاس سال کا ہوں لیکن اپنی عمر سے کہیں کم دکھائی دیتا ہوں۔ یہ سب دولت کی آسودگی کی وجہ سے ہے۔ آج میرے پاس کیا نہیں ہے۔ خوبصورت بیوی، دو پیارے بچے، بائیس سال کی بیٹی ہے..... جو میڈیکل کی طالبہ ہے۔ سولہ سال کا بیٹا ہے اُسے ایک دو سالوں میں اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر بھیجوں گا..... اور کیا چاہیے مجھے.....؟“

ایک بات پوچھوں.....؟

”کبھی تم نے اس دولت سے غریبوں کے لیے صدقہ نکالا ہے۔ کبھی کسی ضرورت مند کی ضرورت پوری کی ہے۔ کوئی رقم فلاحی کام کے لیے دی ہے.....؟“

”ہونہہ ریش..... اس کے چہرے پہ نخوت اور غرور کے باعث تیوریاں پڑ گئیں۔ جس نے اس کے نقوش کو انتہائی بد صورت بنا دیا۔ کاشف ٹھٹھک گیا۔“

”مجھے یہ دولت اس لیے نہیں ملی کہ میں خیرات کرتا پھروں..... یہ خدا نے میری تقدیر میں لکھ دی تھی۔ ورنہ مجھے کیوں ملتی۔ مجھے نفرت ہے ان غریبوں سے، ان فقیروں سے جو ہر ٹریفک لائٹ پر گاڑی رکتے ہی ہاتھ پھیلا کر سامنے آ جاتے ہیں غلیظ اور گندے لوگ۔ بدبو کے بھکے اڑتے ہیں ان کے لباس سے۔ میرا بس چلے تو شوٹ کر دوں ان کو۔ غصے سے اس کا سانس تیز تیز چلنے لگا۔ اس نے خود پہ قابو پایا اور پھر رحم بھری

نظروں سے کاشف کی طرف دیکھا۔

”ہاں..... تم دوست ہو میرے..... اگر تمہیں مدد کی کوئی ضرورت ہو تو.....؟“

”نہیں، نہیں“ کاشف نے ایک دم ہاتھ اٹھا کر روک دیا۔ میں خوش ہوں اپنے حال میں سکون اور اطمینان کی دولت ہے میرے پاس۔ محبت کرنے والی بیوی، فرمانبردار اور کمینڈر دار بچے ہیں۔ تعلیم کے میدان میں سب سے آگے ہیں۔ تم میری فکر نہ کرو.....“ دونوں کچھ دیر خاموش رہے۔ پھر کاشف بولا۔

”بس ایک سوال ہے جو مسلسل دماغ کو تنگ کر رہا ہے.....“

”وہ کیا.....؟“

تم اتنے کام چور تھے۔ محنت سے تو تمہارا جی نہیں اٹھا تھا۔ پھر اتنی دولت.....؟ کیا کسی مال دار رشتے دار نے وراثت چھوڑ دی تمہارے لیے.....؟“

”وراثت.....؟ وہ جی بھر کر بد مزہ ہوا اور پھر کڑوے لہجے میں بولا۔ یہ الو کے پٹھے رشتے دار کسی کا بھلا کیوں چاہیں گے.....؟“

ابھی وہ بات کے درمیان میں تھا کہ بائیس سال کی ایک خوبصورت ماڈرن لڑکی اندر داخل ہوئی۔ اس نے سکن ٹائٹ شرٹ اور ویسی ہی جینز پہن رکھی تھی۔

ادہ ہائے انکل..... ڈیڈ..... میں جا رہی ہوں۔ رات کو دیر ہو جائے گی۔ میں فراز کے ساتھ مووی پہ جا رہی ہوں۔ اس کے بعد پرل کا ٹینٹل میں ڈنر کے لیے جاؤں گی۔ یونو آج اس کی برتھ ڈے ہے اس کے بعد ہم اس کے گھر جائیں گے اس لیے۔

”شہلا..... میں نے تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے

کہ فراز تمہارے لیے سوٹ ایبل لڑکا نہیں ہے وہ ہمارے سٹیٹس کے لیے.....“

شہلا نے درمیان میں بے پرواہی سے اس کی بات کاٹ دی تھی۔

”اوہ ڈونٹ بی اے ٹل کلاس میں ڈیڈ..... آپ کچھ بھی کہیں..... آئی ریٹی لو ہم.....“ وہ چھلاوے کی طرح غائب ہو گئی۔ افروز نے ٹھنڈی سانس بھری۔

”اس الو کے پٹھے فراز کا کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“ اس نے کافی کا آخری گھونٹ بھر کر کپ زور سے میز پر رکھا تو نیلم کھٹ کھٹ کرتی آگئی۔ ہائی ہیل اور سنہری بارڈروالی بھاری ساڑھی میں میک اپ سے لیس وہ اس نیلم سے کتنی مختلف تھی، جو کبھی بہت سادہ بہت معصوم ہوتی تھی۔

”ڈارلنگ..... کاشف کو اچھی طرح انٹرنٹین کرنا..... اور سنو شہروز اپنے دوستوں کے ساتھ کلب میں پارٹی پہ جا رہا ہے۔ اور میں آف کورس برج پارٹی میں مصروف ہوں گی صبح ملاقات ہوگی۔“

وہ مسکرائیں بکھیرتی..... نزاکت سے ہاتھ ہلاتی کسی ٹین ایجر کی طرح ایکٹ کرتی چلی گئی..... افروز ہلتے پردے کو دیکھ رہا تھا۔

کاشف نے اپنا سوال دہرایا۔ وہ چونک کر اُسے دیکھنے لگا۔

تم جاننا چاہتے ہو یہ دولت کہاں سے آئی ہے..... چلو آج میں تمہیں ایک خاص جگہ لے جاتا ہوں۔ وہاں تمہیں پوری کہانی سناؤں گا۔“

”لیکن یہیں سنا دیتے تو زیادہ بہتر تھا..... میں باہر جانے کے موڈ میں نہیں ہوں.....“

”لیکن مجھے تو ہر حال میں جانا ہے آج سے پچیس سال پہلے جہاں میری قسمت بدلی تھی۔ میں ہر سال وہاں جاتا ہوں..... ایک قسم کا یہ میرا نیا جنم

تھا..... اور اُسے منانے کے لیے اس جگہ سے بہتر کون سی جگہ ہوگی جہاں وہ جنم ہوا.....“
”وہ کچھ دیر ٹھہرا پھر کاشف کو دیکھا۔“

”تم دس منٹ رکو..... میں تیار ہو کر آتا ہوں.....“ وہ ڈرائنگ روم سے نکلا تو کاشف حیران ہوا۔ بہترین سوٹ پہنے ہوئے اس شخص کو مزید تیاری کی کیا ضرورت تھی۔ شاید وہ کپڑے بدل بدل کر مجھ پہ اپنا رعب جمانا چاہتا تھا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہا تھا کہ افروز آ گیا۔ اس نے شلوار قمیض کے اوپر ایک واسکٹ پہن رکھی تھی۔

”چلو.....“ کاشف اٹھا اور جونہی افروز دروازے کی طرف گھوما کاشف کی نظر اس کی واسکٹ کے پچھلے حصے پہ گئی جہاں کڑھائی کیے ہوئے کچھ نمبرز لکھے تھے۔

”تم سوچ رہے ہو گے..... یہ نمبر کیسے ہیں..... افروز مسکرایا..... یہ بہت خاص نمبر ہیں..... اور میری زندگی بدلنے میں اس کا اسٹیشنل رول ہے۔“

گاڑی ایک غریب علاقے کے پاس رُکی..... جہاں ٹلرک طبتے کے معمولی کوارٹر بنے ہوئے تھے۔ کچھ فاصلے پہ ایک پارک تھا۔ جہاں کے جھولے ٹوٹے اور گھاس سوکھی ہوئی تھی۔ دونوں گاڑی سے اترے۔

”یہ اس شہر کا سب سے غریب علاقہ ہے۔ یہاں سے تھورے فاصلے پہ ایک اچھی بیکری ہے۔ اُس روز دادی سے چرائے پیسے لیے میں ادھر ہی آیا تھا۔ ہمارا گھر بھی کچھ زیادہ دور نہیں ہے یہاں سے۔ ابھی میں باہر ہی کھڑا لپچائی نظروں سے چیزوں کو گھور رہا تھا کہ ایک دس سالہ لڑکا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوا۔ میں بے خیالی میں اُس کی طرف متوجہ تھا۔ لڑکا کچھ پیسٹری کرید کر ادا کر رہا تھا لیکن کیشٹر صاف انکار کر رہا تھا

کہ اُسے بانڈ نہیں چاہیے..... اُسے نقد رقم چاہیے۔ لڑکا منت کر رہا تھا لیکن اُسے مسلسل انکار سننے کو مل رہا تھا۔ تب وہ مایوس ہو کر باہر نکل آیا..... مجھے اس سے دلچسپی پیدا ہو گئی..... جانے کیوں میں اُس کے پیچھے ہو لیا۔ دو تین جگہوں پر اُسے انکار ہوا تو وہ مایوسی سے فٹ پاتھ پر چلتا ہوا اس پارک کی طرف آیا۔ افروز کہانی سناتے سناتے فٹ پاتھ پر چل رہا تھا کہ پاؤں رستے میں پڑی کسی چیز سے ٹکرائے۔

”ارے دیکھ کر چلو۔“ کوئی نشئی بڑ بڑایا.....
”اُلو کے پٹھے یہ سونے کی جگہ ہے..... اندر پارک میں جا کر سو یہاں بیچ کے پاس کیوں پڑا ہے۔“ تجھے کیا..... اور میں سو تو نہیں رہا..... تیری کہانی سن رہا ہوں.....“

”کہانی کے بچے..... اٹھ یہاں سے..... ہم اس بیچ پر بیٹھیں گے..... جا پارک میں جا کر سو جا..... ناکام کے نہ کالج کے..... بس کیتروں کی طرح پڑے رہتے ہیں یا مانگ مانگ کر گزارہ کرتے ہیں.....“

وہ مدقوق سا آدمی بکتا جھکتا پارک کے اندر چلا گیا۔
”ہاں تو میں کہہ رہا تھا..... وہ لڑکا مایوس سا اس پارک کے پاس فٹ پاتھ پر چلنے لگا اور عین اس بیچ کے پاس اس کی جیب سے کچھ گرا۔ میں پیچھے پیچھے تھا..... اور مجھے معلوم تھا وہ کیا ہے..... وہ کھوڑی آگے گیا تو میں نے وہ چیز اٹھالی..... وہ تہہ کیا ہوا وہی بانڈ تھا۔ شاید اُس کی جیب میں سوراخ تھا۔ میں نے کھول کر دیکھا، پچاس روپے والا بانڈ تھا۔ ایک لمحے کو خیال آیا کہ اس کو بلا کر واپس کر دوں لیکن پھر سوچ کر رُک گیا۔ وہ لڑکا جانے کہاں غائب ہو گیا۔ میں نے غور سے دیکھا یہ میری واسکٹ پر نمبر دیکھ رہے ہو۔ بالکل یہی نمبر تھے اس بانڈ پر..... میں

نے جیب میں رکھ لیا..... اور ساری رات خواب میں دیکھتا رہا کہ وہ بانڈ انعام کا حق دار ٹھہرا ہے..... اور مجھے لاکھوں روپے مل گئے ہیں اور جانتے ہوا گلی صبح میرا خواب سچ ہو گیا۔ میں اچانک ہی لاکھوں روپے کا مالک بن گیا۔ بانڈ کے مالک تو جانتے بھی نہ ہوں گے کہ بانڈ کے ساتھ کیا ہوا۔ تمہیں پتا ہے اکثر لوگ بانڈ لے کر رکھ لیتے ہیں۔ کئی کئی مہینوں تک کا نتیجہ ہی نہیں دیکھتے۔ مجھے پتا نہیں ان لوگوں کا کیا ہوا..... لیکن اس رات میری قسمت ضرور بدل گئی۔ میں نے بزنس شروع کر دیا۔ دو سے چار، چار سے چھ اور چھ سے دس ہو گئے۔ خوش قسمتی نے میرے قدم چومے اور آج میں شہر کا امیر ترین آدمی ہوں۔ میں ہر سال اسی دن ان نمبروں والی واکسٹ پہن کر ادھر آتا ہوں..... کچھ دیر یہاں گزارتا ہوں اور پھر اپنی دولت مند دنیا میں لوٹ جاتا ہوں۔ ابھی اس نے اپنی کہانی ختم کی تھی کہ کوئی خونخوار جانور کی طرح چھپٹ کر اس کی گردن سے چٹ گیا۔

”تو تم ہو وہ خطرناک بلا جس نے میری زندگی تباہ کر دی۔ مجھے کوڑی کوڑی کا محتاج بنا دیا..... مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ مجھے ماں باپ سے جدا کر کے بھیک مانگنے پہ مجبور کر دیا..... اور خود عیش و آرام کی زندگی بسر کر رہے ہو۔“

دونوں ششدر اور مدقوق شخص کو دیکھ رہے تھے۔ جس میں اس وقت اتنی طاقت جانے کہاں سے آگئی تھی۔ دونوں اس وقت گنگ تھے۔

”تمہیں پتا ہے وہ دس سال کا لڑکا میں ہوں جس کی پتلون کی پھٹی جیب سے وہ بانڈ گرا تھا۔ جو اُس نے اپنی ماں کی الماری سے چرایا تھا.....؟“

”تم.....؟ افروز غصے میں کھڑا ہو گیا۔ کیا بک رہے ہو تم.....؟“

”میں نے تمہاری کہانی سن لی ہے۔ میں ہی

وہ بد قسمت ہوں..... وہ دن جہاں تمہارے لیے خوش بختی کی علامت بن کر آیا..... وہاں میری بد بختی کی داستان شروع ہو گئی۔ جو آج تک بھی ختم نہیں ہوئی.....“ عہ آنسوؤں سے رو رہا تھا۔ اُس کی آنکھیں اندر کوکھسی ہوئی تھیں اور اُسے دیکھ کر صاف لگ رہا تھا کہ بڑھاپے نے بہت جلدی اس کے در پر دستک دے دی تھی..... کہ وہ نشے کا عادی بیمار شخص لگ رہا تھا۔

”دفع ہو جاؤ یہاں سے..... میں تم لوگوں کے منہ لگنا گوارا نہیں کرتا۔“

غلیظ، منحوس آدمی..... افروز نے اُسے ٹھوکر ماری تو وہ دور جا گرا۔ کاشف نے حیرت سے افروز کی طرف دیکھا..... ٹھوکر کھا کر دور گرنے کے بعد بھی وہ شخص لڑکھراتا ہوا ادھر آ رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں اس کی زندگی کے گزرے ماہو سال زلزلے کی صورت لرز رہے تھے۔

”افروز..... پلیز..... مجھے اس کی کہانی سننے دو.....“ کاشف التجائیہ انداز میں بولا۔ وہ شخص گرنے کے انداز میں ان کے قدموں میں بیٹھ گیا۔

”میرا..... میرا نام اصغر ہے..... اس روز جو بانڈ میں اماں کی الماری سے چرا کر نکلا تھا۔ اس پہ میرا بھی حق ہے۔“

”کیوں تمہارا حق ہے..... تم بھی چور..... میں بھی چور..... تم نے وہ بانڈ اپنی ماں سے چرایا۔ میں نے تم سے چرایا۔ پھر تمہارا حق کیسے ہوا۔“

تم پاگل آدمی..... تم کیسے حق جتا رہے ہو اور تم کبھی کیا سکتے ہو.....؟“

افروز نے اتنا غصے میں کہا تھا کہ اُسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیسے پلک جھپکتے میں اس شخص کو کرۂ ارض سے غائب کر دے۔ کاشف بڑی مشکل سے اُس کے اعصاب قابو میں کر رہا تھا۔

”اُس روز میں ماں باپ کی مار کے ڈر سے گھر نہیں گیا۔ یہاں بیچ پر بیٹھا روتا رہا۔ روتے روتے جانے کیسے آنکھ لگ گئی۔ شاید اس لیے کہ نیند تو سولی پر بھی آ جاتی ہے لیکن جب اُس نیند سے جاگا تو ایک تنگ و تاریک کمرے میں تھا۔ جہاں اور بھی درجنوں بچے تھے۔ جنہیں دیکھ کر میری چیخ نکل گئی..... لیکن سرخ سرخ آنکھوں والے ایک جلا دی شکل والے آدمی کو دیکھ کر میں اتنا خوفزدہ ہو گیا کہ چیخوں کو اندر ہی دبا لیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ وہ بھیک منگوں کا سرغنہ ہے۔ اسی طرح مختلف شہروں سے بچوں کو اغوا کرتا ہے اور بھیک منگوواتا ہے۔ جو نہ مانے اُسے ٹانگ یا بازو سے محروم ہونا پڑتا ہے تاکہ اُس کے پاس کوئی چوائس نہ رہے۔ وہ پتا نہیں کون سا شہر تھا لیکن میرا شہر نہیں تھا۔ باقی بچے بھی دوسرے شہروں سے تعلق رکھتے تھے۔ ہماری باقاعدہ نگرانی کی جاتی تھی۔ سارے دن کی کمائی چھین لیتے۔ کھانے پینے کو نا کافی غذا دیتے۔ پہننے کو پھٹے پرانے کپڑے کہ یہ ہمارے کام کے لیے موزوں ترین تھے۔ میں ہاتھ اور پاؤں تڑوانے کے خوف سے خاموشی سے ان کی بات مان گیا۔ دن رات کی محنت..... نا کافی خوراک اور بے رحم موسموں کی شدت نے ہمیں وقت سے پہلے ہی جوان اور جوان سے بوڑھا کر دیا۔ ہمیں نشے کی عادت بھی ڈال دی گئی۔ تاکہ ہم مکمل طور پر ان کے محتاج رہیں۔ میں دس برس کی عمر سے گھر سے نکلا یہ پچیس سال کیسے گزرے۔ یہ آنسو اور آہوں کی الگ داستان ہے۔ مجھے پڑھنے کا بے شوق تھا۔ اخبار بیچنے پہ لگا دیا۔ تاکہ اخبار کے پردے میں بھیک مانگ سکوں۔ میں نظر بچا کر پورا اخبار چٹ کر لیا۔ ماں اور ابا کو یاد کر کے روتا۔ اماں اور

ابا کی حالت کا سوچ کر روتا کہ میرے گم ہو جانے سے ان کا کیا حال ہوا ہوگا۔ روزانہ پچھتاوا گھیرے رکھتا۔ کیا تھا اگر میں گھر چلا جاتا۔ مار کھا لیتا لیکن اس نے سائے تلے تو رہتا۔ گھریلو زندگی تو گزارتا لیکن اب کیا کر سکتا تھا۔ آج میں پینتیس برس کا ہوں۔ لیکن یوں لگتا ہے موت کی دہلیز پہ کھڑا ہوں۔ نشے نے کھوکھلا کر دیا۔ کسی کام کا نہ رہا تو ایک دن سرغنہ یہاں پھینک گیا۔ دھندلی دھندلی یادیں تھیں اس پارک کے بارے میں..... اور اس بیکری کو میں کیسے بھول سکتا ہوں..... شہر اتنا بدل گیا کہ اپنا گھر ڈھونڈنے سے بھی نہ ملا۔ پتا نہیں ماں باپ کہاں ہیں۔ گھر کہاں ہے۔ وہ زندہ بھی ہیں یا مر چکے گئے۔ آج دو روز سے بھوکا ہوں۔ سردی سے جسم برف بنا ہوا ہے۔ اتنا تو حق ہے نا میرا کہ مجھے دو وقت کا کھانا کھلا دو..... ایک سویٹر ہی خرید دو..... میرے باند کی وجہ سے اتنا تو فرض بنتا ہے نا آپ پہ.....؟

اُس کی آنکھوں میں التجا کے ساتھ ساتھ آنسو بھی تھے۔ بے شمار سوالوں کی ان تھک تکلیفوں اور مسافتوں کے گہرے نشان تھے۔

”بکواس مت کرو اور دفع ہو جاؤ یہاں سے..... جانے کہاں کہاں سے آ جاتے ہیں، مفت خورے..... پیسے بٹورنے کے لیے کوئی ڈرامے کرنا ان سے سیکھے۔ چلو کاشف..... ورنہ یہ منحوس اپنی نحوست کا سایہ.....“

کاشف کا دل کانپ گیا۔ اُس نے دیکھا جیسے وہ پتھر کے بت کی مانند ہیں جم گیا تھا۔ اس کی آنکھوں میں جانے کیا تھا..... کاشف چاہتا بھی تو اُسے کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک ہزار کانوٹ نکالا اور افروز کی نظر سے بچا کر اس کی جھولی میں ڈال دیا۔ اس کا دل بری طرح لزر

رہا تھا۔ جب زمین پر رہنے والا انسان خدا بنتا ہے تو خدا جانے کیسے اس کی رسی دراز کر دیتا ہے۔ وہ جھوٹ بھی کہہ رہا تھا تو افروز اُسے یوں دھتکارنے کا کیا حق رکھتا تھا۔ افروز اتنا سنگدل، جابر اور مغرور کیوں ہو گیا تھا۔

کاشف سارا راستہ چپ بیٹھا رہا..... دل پہ ان کہا بوجھ تھا۔ اور زبان پہ استغفار وہ خوفزدہ تھا..... عذاب الہی سے، خدا کے قہر سے خوفزدہ۔

اچانک کار کو زور سے بریک لگی۔
”پتا نہیں ٹریفک رُکی ہے۔ شاید کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے۔ کم بخت سڑکوں کو اپنی جاگیر سمجھتے ہیں۔“

”بھائی کیا ہوا ہے آگے..... کوئی ایکسیڈنٹ ہوا ہے.....؟“ کاشف نے کسی راہ گیر سے پوچھا۔

”ہاں تھا کوئی امیر زادہ..... اپنے ساتھیوں کے ساتھ گاڑی کی ریس ہو رہی تھی۔“

بڑی بڑی گاڑیوں کی نمائش..... یہ تو ہونا ہی تھا۔ سڑکوں کو اپنی جاگیر سمجھ رکھا ہے..... ”راہ گیر نے افروز کا جملہ ہی دہرایا تو کاشف نے بے اختیار افروز کی طرف دیکھا لیکن اُس کے چہرے پر عجیب سے تاثرات تھے۔ نظریں کہیں جمی تھیں۔

”یہ..... یہ تو شہروز کی گاڑی ہے کاشف.....“

میں نے اُس کی پچھلی سالگرہ پر دی تھی۔ اور باقی گاڑیاں اس کے دوستوں..... وہ جملہ روک کر تیر کی طرح باہر نکلا..... کاشف بھی پیچھے تھا..... ایسبولنس آگئی تھی..... عملہ شہروز کی لاش کو اندر ڈال رہا تھا۔ دوستوں میں زیادہ تر زخمی تھے۔ ان کے لیے بھی انتظام ہو رہا تھا لیکن افروز ساکت کھڑا بس دیکھتے جا رہا تھا۔ اس کے قدم زمین سے جم گئے تھے اور زبان جیسے تالو سے چپک گئی تھی۔ وہ سخت شاک میں تھا۔ اس شاک کو اس کے موبائل کی بیل نے توڑا۔ اُس نے ٹرانس کی حالت میں موبائل جیب سے نکالا اور

آن کر کے کان سے لگا لیا۔ اُدھر ہونے والی گفتگو سن کر اس کے ہاتھ سے موبائل گر گیا اس نے خالی نظروں سے کاشف کی طرف دیکھا۔

کس کا فون تھا.....؟ افروز کچھ بولنا چاہا لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔

افروز کس کا فون تھا۔ کاشف نے اُسے جھنجھوڑ ڈالا۔

”ن..... نیلم کا فون تھا۔ ش..... شہلا..... شہلا..... اس کی زبان جیسے لکنت زدہ ہو گئی تھی۔“

”کیا..... کیا ہوا شہلا کو.....؟ وہ چیخا۔“

”شہلا نے فراز سے کورٹ میرج کر لی ہے..... اور گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا ہے۔ سارا زیور بھی ساتھ لے گئی ہے.....“

کاشف نے لرزتے جسم کے ساتھ بے اختیار آنکھیں آسمان کی طرف اٹھائیں اور پھر اس کی آنکھیں اس خالق کون و مکان کے سامنے سجدہ ریز ہو گئیں۔ نظروں میں اچانک اصغر کا عبرت ناک سراپا لہرایا۔ اور آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

آج خدا کی لاکھی بے آواز نہیں ہوئی۔ اس کی رسی اتنی دراز بھی نہیں تھی۔ آج اُس کا جلال یوں جوش میں آیا تھا کہ قہر بن کر افروز پہ ٹوٹا تھا۔ سچ کہتے ہیں کسی غریب اور مسکین کا صبر اتنا نہ آ زماؤ کہ اُس کی دعاؤں کی پہنچ آسمانوں تک ہوتی ہے..... اپنے اچھے وقتوں میں اپنا قد آسمانوں سے اونچا کرنے کی کوشش بری طرح زمین پہ پہنچ دیتی ہے۔ پر نچے اڑا دیتی ہے۔ تقدیر کی زنجیر ایسی ہی ہے۔ کبھی تو آسانی سے کھل جاتی ہے اور کبھی بے رحمی سے جکڑ لیتی ہے۔ نصیب کے کھیل کبھی کتنے عجیب ہیں، کبھی صدیوں پہ عیط اور کبھی لمحوں میں ختم..... پتا نہیں یہ کھیل ہیں یا مذاق.....؟“

☆☆.....☆☆

بڑے وہ ہیں

آپ کی مرضی پیسہ آپ کا ہے پھینک دیں یا آگ لگا دیں۔ یہ کیسی باتیں کر رہی ہوں اپنی بہنوں اور ان کے بچوں پر خرچ کرنا انہیں تحائف دینا پیسوں کو آگ لگانا ہے۔ افضل نے سوالیہ نگاہوں سے زین کو گھورتے ہو کہا۔ جی نہیں یہ تو عین ثواب اور فریضہ اول ہے۔“ لہجے میں زہر.....

لائٹ کا آنا جان اور یہ شدید گرمی اس پر اپنے دوستوں کے والد بھی دیکھیں ہیں کس مندوں کی آمد اور ان کی دعوت کا اہتمام بھی طرح اپنی بیویوں کا خیال کرتے ہیں اور یہاں



ہمارے میاں صاحب کو آج ہی کرانا تھا۔“ زینی کچن میں بریانی تیار کرتے ہوئے اپنے غصے کا برملا اظہار کر رہی تھی۔ اس کا مزاج ہی ایسا تھا۔ اُسے تو شوہر کے خاندان کی طرف سے گزرتی ہوا سے بھی دشمنی تھی۔ موبائل پر سہیلیوں سے بات ہو یا کسی محفل میں ملاقات سسرال کے رشتے داروں کی برائیاں تنقید و تبصرہ ہی موضوع بحث ہوتا۔

”مما کچھ کھانے کے لیے ہے؟ ارسلان نے زینی کے قریب آ کر پوچھا۔

”ہاں ہے نا میری جان..... تم بھی کھاؤ اور اپنے پاپا کو بھی کھلاؤ۔“

اوہو ممما! آپ تو ہمیشہ غصے میں رہتی ہیں۔ کبھی پیار سے بات ہی نہیں کرتیں۔ میرے فرینڈز کی مدرز کو دیکھیے کتنی سویٹ اور نائیس ہیں۔ ایسا لڑنے والا رویہ نہیں ہوتا ان کا۔“ ارسلان نے بھی بغیر لحاظ کیے سب کچھ کہہ دیا۔

ارسلان نے شرارت سے مسکراتے ہوئے کہا اور جواب سننے بغیر دوڑتا ہوا کچن سے باہر نکل گیا۔

”ارسلان کے بچے ادھر آؤ میں تمہیں ٹھیک کروں۔ زینی غصے میں ارسلان کے پیچھے بھاگی لیکن وہ گیٹ سے باہر جا چکا تھا۔

”زینی میں سوچ رہا ہوں اس مرتبہ ونیزہ اور عینی کو بھی تم شاپنگ کرادو اور بچوں کی شاپنگ بھی ضرور کروادینا۔ کیوں ٹھیک ہے نا میرا خیال۔“ افضل نے زینی کی تائید چاہی۔

آپ کی مرضی پیسہ آپ کا ہے پھینک دیں یا آگ لگا دیں۔ یہ کیسی باتیں کر ہی ہوں اپنی بہنوں اور ان کے بچوں پر خرچ کرنا انہیں تحائف دینا پیسوں کو آگ لگانا ہے۔ افضل نے سوالیہ نگاہوں سے زینی کو گھورتے ہو کہا۔

میاں صاحب کی فرما برداری اور ان کے خاندان کی خاطر داری کرنے کے بعد بھی زندگی کا سکھ اور خوشی نہیں ملی۔“ زینی نے جوابی حملہ کیا۔ آپ بھی تو ہر ویک اینڈ پر ماموں جان کے گھر پہنچ جاتی ہیں۔ اور بڑی اور چھوٹی خالہ جان بھی آ جاتی ہیں۔ دو دو فیملی لیکن ممائی جان تو آپ کی طرح غصہ نہیں کرتیں بلکہ سب کی پسند کے کھانے بناتی ہیں اور ہم سب سے پیار سے ملتی ہیں۔“

”اچھا! اب اپنی ممائی کی تعریفوں کے پل نہ باندھو۔ ان کی ہمت ہے غصہ کرنے کی ہم اپنے بھائی کے گھر جاتے ہیں۔ ہم بہنوں کا حق ہے تمہاری ممائی کون ہوتی ہیں۔ ہم بہن بھائیوں کے بیچ آنے والی۔“

تو پھر یہ ہی اصول آپ کو دوسری طرف بھی رکھنا چاہیے ممما کہ پھوپھو اور پاپا بھی تو بہن بھائی ہیں ان کے درمیان آپ کیوں آ جاتی ہیں۔“ جی نہیں یہ تو عین ثواب اور فریضہ اول ہے۔“ لہجے میں زہر اور آنکھوں میں قہر تھا۔

زینی بیگم اللہ تعالیٰ نے عزیز اقارب کا بھی حق رکھا ہے۔

بالکل پورے کرتے رہے عزیزوں اور رشتے داروں کے حقوق، اس نے افضل کی طرف نا گواری سے دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ میں نے تمہارے حقوق پورے کرنے میں کون سی کمی چھوڑی ہے کیوں اس قدر رنج ہو رہی ہو۔ اللہ نے صاحب حیثیت بنایا ہے۔ ربتہ بڑا دیا ہے تو دل بھی بڑا رکھو۔ اپنا طرف اور دل وسیع رکھو۔

”اچھا! صاحب دل اور وسیع القلب صاحب مجھے شوق نہیں ہے اس قسم کے اعزازات جمع کرنا کا میں جیسی ہوں ویسی ہی ٹھیک ہوں۔“ زینی اپنی

خوش رکھتے ہیں۔ انہیں تحفے دیتے ہیں۔ وہ خوشحالی اور ترقی پاتے ہیں۔“

چلیے آپ کے بھائی کا یقین تو سمجھ میں آ گیا۔ پھر بھی ایک بات ہے کہ تمہاری بھابی کا دل بہت بڑا ہے کہ تمہارے بھائی جان کا یہ تحفے دینا دیکھ کر بھی ان کے ماتھے پر ایک شکن بھی نہیں آتی۔

”ماتھے پر شکن کیوں آئے گی ہمارا بھائی ہے خون کا رشتہ ہے اور بڑا دل تو بھائی جان کا ہے۔ جنہوں نے اس غریب گھرانے کی لڑکی کو اپنی زندگی میں شامل کر کے بلائے جان بنا لیا ہے۔“ زینی کے اندر کی حاکمیت اس کے لہجے میں بول پڑی۔

اور افضل گہری سوچ میں کھو گیا اور زینی کو یہ خاموشی بھی برداشت نہ ہوئی۔

”آپ خاموش کیوں ہیں جواب تو دیجیے کیا سوچ رہے ہیں.....؟؟“

میں سوچ رہا ہوں کاش میری بہنیں بھی میرے بارے میں ایسی ہی تعریفیں کر سکتیں وہ بھی میرے دیے گئے قیمتی تحفے اور زیورات اپنے شوہروں کو دکھا کر میری محبت کے قصیدے پڑھتیں اور اپنی بھابی کے بارے میں زہر فاشی کر سکتیں۔

”افضل آپ بھی نابڑے وہ ہیں۔“ زینی نے بڑے ناز سے اور ادا سے اپنی بائیں افضل کے گلے میں ڈال دیں۔

”جی! ہاں میڈم میں صرف اور صرف آپ کا ہی وہ ہوں اور کسی کا اب کچھ بھی نہیں ہوں کچھ بھی نہیں۔“

زینی کا قبہ بلند ہوا افضل کے ہونٹوں پر پھینکی سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ جس میں پوشیدہ طنز زینی کی سمجھ اور عقل سے بلند تر تھا۔

☆☆.....☆☆

روایتی ڈھٹائی پر اتر آئی۔ ہم بھی کس بحث میں پڑ گئے ہیں۔ میں آپ کو ایسی زبردست قسم کی چیز دکھاؤں گی کہ آپ کا موڈ اے دن ہو جائے گا۔ کیسی چیز.....؟ پھر کسی شاپنگ گالا یا رعایتی سیل سے شاپنگ کر لی؟؟

نہیں پاپا یہ سب چیزیں بڑے ماموں جان نے تحفے میں ہیں۔“ ارسلان اپنا فٹ بال لیے زینی اور افضل کی گفتگو میں شریک ہو گیا۔

میں بحث میں الجھ کر آپ کو یہ سب تحفے دکھانا بھول گئی۔ یہ دیکھیں کتنے زبردست سوٹ ہیں۔ ہم سب کے اور یہ میرا نیکلس سیٹ ہے خالص سونے کا بھائی جان نے ہم بہنو کے لیے آرڈر پر بنوایا ہے اور یہ کیش رقم ہے تاکہ ہم بہنیں اپنی پسند کے فریج اور اے سی خرید سکیں۔“

زینی کے چہرے پر خوشی اور فخر کے رنگ چمک رہے تھے۔

”کیوں دیا ہے یہ سب کچھ بھائی جان ہے؟“

کیوں کا کیا مطلب ہے ہم بہنیں ہے ان کی کمائی پر حق ہے ہمارا، بھائی جان کی پر موشن ہوئی ہے اسی خوشی میں یہ سب کچھ ہم بہنوں کو دیا ہے۔

”واہ بہت خوب۔“

”جی ہاں! میرے بھائی جان واقعی بہت خوب ہیں۔“

زینی نے بڑے ناز سے افضل کی تعریف کا جواب دیا۔ جی نہیں بہت خوب آپ کی بھابی ہیں سلام ہے ان کی عظمت کو۔

یہ بھابی صاحبہ کی عظمت آپ کو کہاں سے نظر آ گئی۔ زینی افضل پر برس پڑی۔“

آپ کو تو خوش ہونا چاہیے کہ بھائی جان نے اتنا کچھ دیا ہے۔

بھائی جان کا تو یہ یقین ہے کہ جو بھائی بہنوں کو

READING
Section

دوشیزہ 239

مجھے کیا برا تھا مرنا

ادھر کامران نے ہمارا Galaxy سیٹ اٹھالیا۔ یہ آج سے میرا ہوا۔ ہم (کسمسا کر رہ گئے) اچھا تھا کہ ہم مرنے سے پہلے سارا ڈیٹا Delete کر دیتے۔ اب یہ سب کو Tweet کرے گا۔ IMO اور واٹس ایپ پر ہماری PIC بنا کر اپ لوڈ کرے گا۔ اور کہے گا.....

چین سے سورہا تھا میں اوڑھے کفن مزار میں
یہاں بھی ستانے آگئے کس نے پتا بتا دیا
(لو جناب اس دور میں وہ ہوتے تو ہم انہیں
بتاتے کہ انہوں نے Google سے پتالے لیا
ہوگا)

قارئین ہمیں مرنے مارنے کے شعرا خود
اچھے لگنے لگے۔ کیونکہ زندگی سے زیادہ 'موت'
میں درائی ہے۔ محبوب کا قبر پر آنا، پھول چڑھانا،
اپنے ہاتھ فاتحہ کے لیے اٹھانا، دو آنسو بہانا.....
اور تو اور زندگی میں اگر آپ کو خط کا جواب نہ ملے
تو آپ کے مرنے کے بعد 'جواب' آ ہی جائے گا
بقول شاعر

چلا رہا ہے گورِ غریباں پہ نامہ بر
کس کس کو انتظار تھا خط کے جواب کا
(بھئی یہ ڈاکیہ بہت اچھا ہے کہ خط لے کر
قبرستان جا پہنچا..... ویل ڈن ڈاکیہ صاحب)
ہاں تو ہم بات کر رہے تھے موت کی..... کہ
ہمارا جی چاہنے لگا کہ ہم مرجائیں۔ مگر ایک شاعر

دوستو! آپ کو یہ تو پتا ہے کہ ہم 'انسان' ہونے
کے ساتھ ساتھ ایک اور وصف بھی رکھتے ہیں۔
اگر آپ کو ہمارے انسان ہونے پر شبہ ہے تو ہوا
کرے) یعنی انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ہم
شاعر، ادیب، افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نگار
وغیرہ وغیرہ بھی ہیں۔ (یہ خصوصی وصف ہمیں
ورثے میں ملا ہے چونکہ ایک قدامت پرست
گھرانے سے تعلق ہے سو ہمیں بھی صوفیانہ،
ناصرانہ، عاشقانہ، باغیانہ اور مردانہ قسم کے اشعار
بہت پسند تھے۔)

(ہمارے مجموعہ کلام میں آدھا کلام مردانہ
ہے، باقی کا پتا نہیں کہ وہ کلام ہے بھی یا نہیں۔)
خیر جناب غالب، مومن، درد جگر مرادی،
آتش سے لے کر امجد اسلام امجد اور وصی شاہ اور
استاد قمر جلاوی کے 'موت' کے عنوان پر لکھے
ہوئے اشعار از حد پسند تھے۔ اس معاملے میں
استاد قمر جلاوی ہمارے روحانی استاد بن گئے، اُن
کا یہ شعر تو ہمیں بے حد پسند تھا۔

نے ہمیں ہولا کے رکھ دیا۔

اب گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مرجائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے
ٹٹ، صد افسوس، یعنی اس کے بعد تو کوئی
اوپشن ہی نہیں ہے لیکن چونکہ ہم مغلیہ خاندان سے
تعلق رکھتے ہیں، جنہوں نے معمولی کنیزوں کی
خاطر اپنے ابا جان سے پھینٹی لگوائی۔ جنگ پر
جانے سے انکار کر دیا۔ تخت و تاج چھوڑ کر بوریا
نشین ہو گئے۔

چونکہ ہم مغلیہ خاندان کے آخری چشم و چراغ
ہیں سو ہم نے اُن کی آن بان رکھنے کے لیے آخر
'موت' کی آغوش میں جانے کا فیصلہ کر ہی لیا۔
اور کچھ قدرت نے ہماری مدد کی۔

قصہ کوتاہ یہ کہ ہم علیل ہو گئے۔ علیل بھی ایسے
کہ ایام زیست قلیل لگنے لگے۔ ہم بستر علالت
بلکہ بستر فراغت پر نیم دراز تھے (نیم دراز اس
لیے کہ ہمارے ارد گرد رکھے ہوئے تکیے ہمارے
دراز ہونے میں مانع تھے۔ ایک جانب کتابوں کا
ڈھیر، تو دوسری جانب ہمارے نامکمل افسانے اور
ادھوری غزلیں دھری تھیں۔ بھی بہت فنفا شک
بیماری تھی، ہم لب مرگ تھے)
غالب یاد آ گئے

الٹی ہو گئیں سب تدبیریں کچھ نہ دوانے کام کیا
دیکھا اس بیماری دل نے آخر کام تمام کیا
(یہ الگ بات ہے کہ زمانہ طالب علمی میں
ہم اسے وہ والی الٹی سمجھتے رہے)

گھر والے ہماری تیمارداری کر کر کے عاجز
آچکے تھے۔ مگر آفرین ہے کہ ہمارے سامنے کبھی
حرف شکایت زباں پر آیا ہو۔ ہاں دوسرے
کمرے میں جا کر ضرور بھڑاس نکالتے تھے۔

''یا اللہ، تو صفیہ کو صحت دے یا.....'' اس

'یا' کے بعد کیا تھا ہم رو دیتے تھے۔ چلیے آئیے
میں ان کرفزاروں سے آپ کو ملواؤں۔

یہ ہمارے بھائی ہیں جاوید احمد (اکلوتے
ہیں) یہ موصوف کراچی میں اپنی PIA کی اچھی
بھلی ملازمت کو داغِ مفارقت دے کر ہماری
تیمارداری کو آن پہنچے تھے۔ حالانکہ یہی بھیا ہمیں
دوستوں کی آمد پر ناکوں خنے چبواتے
تھے۔ (ہماری مغلیہ ناک اس کی کبھی متحمل نہیں
ہوتی) اب یہی بھیا دوڑ دوڑ کر اور بدل بدل کر
ڈاکٹروں کو لاتے اور واپس لے جاتے تھے۔ اور
ہمیں 'گڑیا رانی' کہتے ہوئے نہیں ٹھکتے تھے۔

یہ کامران ہے ہمارا چچا زاد بھائی، کرکٹ کا
دلدادہ، اب بے چارہ اپنے میچز چھوڑ ہماری
دواؤں کے نسخے بغل میں دبائے میڈیکل
اسٹورز کے چکر لگاتا تھا (اور Bill میں حسب
توفیق اپنا منافع بھی کما رہا تھا)

پاپا جی ان کا تو نہ ہی پوچھیں اتنے ظالم،
سنگدل، جابر اور سخت گیر، پڑھا کو باپ آج تک
نہیں دیکھا، ہر وقت لیکچر..... کتابیں، رٹا، ٹیسٹ،
ریاضی، الجبرا..... اُف ہم ان سے بے حد عاجز
تھے۔ اب یہی پاپا محبت اور شفقت کا عظیم منبع
تھے۔ کیونکہ جونہی ہم کامران کے ساتھ کیرم بورڈ یا
لڈو کی بازی لگاتے، پاپا عزرائیل کی طرح سر پر
نازل، چلو کامران امی کو مسالا لا کر دو۔ احد ہمیں
لگتا کہ وہ یہ مسالہ ہماری بڑی بڑی آنکھوں میں
بھرنے کے لیے منگوار ہے ہیں۔

اب پاپا نے ہمیں رضیہ بٹ کے پرانے ناول
اور زمر نعیم، نسیم نیازی کے تازہ ترین ناول لا کر
دیے۔ پروین شاکر، ادا جعفری سے لے کر ثمنینہ
گل تک کے مجموعہ کلام عطا کیے۔ تاکہ ہمارا دل لگا
رہے اور بیماری سے دھیان ہٹا رہے۔

کامران بھی اپنے کرکٹ کی سرگرمیوں سے قطع تعلق کر کے ہمارے ارد گرد منڈلاتا رہتا تھا۔ ہمارے سرہانے رکھی ہوئی فروٹ باسکٹ خالی ہوتی رہتی۔ اس اثناء میں وہ ہمیں نظر نہیں آتا تھا۔ وہ ان پھلوں پر ہاتھ صاف اور منہ گندا کر رہا ہوتا تھا۔

جناب یہ ہماری باجی 'صدیقہ' ہیں۔ یہ اپنے آپ کو شاعرہ، افسانہ نگار، کہانی کار سمجھتی ہیں۔ سچی کہانیاں اور دو شیزہ میں دو چار کہانیاں کیا لگ گئیں کہ خود کو شمع حفیظ سمجھنے لگیں۔ خیر جناب طالب علمی کے زمانے میں ہمیں بھی شاعری کا شوق ہوا۔ جب یہ شوق عشق کی شکل اختیار کر گیا تو ہم ایک دن کاغذ قلم لے کر باجی کے کمرے میں چلے گئے۔ جہاں مشق سخن جاری تھی۔ ہم نے لاڈ سے اپنے بازوان کے گلے میں جمائل کیے۔ وہ کسی غزل کا چربہ کر رہی تھیں۔ بے چاری اس افتاد کے لیے تیار نہ تھیں۔

ہٹاؤ اپنے ہاتھ اور بتاؤ کیوں آئی ہو۔ تمہیں پتا نہیں یہ 'آمد' کا وقت ہے۔ باجی..... باجی..... ہمیں بھی شاعری کا شوق ہوا ہے آپ ہمیں بھی شعر لکھنا سکھا دیں ہم نے شعر کو 'شیر' کہہ دیا تھا وہ عظیم شاعرہ تڑپ اٹھیں۔ شیر نہیں 'شعر' کہو انہوں نے ع پر زور دیا۔ اور تم شعر سیکھو گی۔ دماغ تو ٹھیک ہے تمہارا کہیں بخار تو نہیں دماغ پر چڑھ گیا۔ کیا اول فول بک رہی ہو۔ ہنہ یہ منہ اور مسور کی دال..... گیٹ آؤٹ (اتنی انگریزی تو آتی تھی) خیر ہم نے جو دوڑ لگائی تو باورچی خانے میں جا کر بریک لگائے جہاں سوئے اتفاق امی مسور کی دال پکا رہی تھیں۔ (یہ دال کا آٹھواں دن تھا) کیا ہوا..... کیوں ہانپ رہی ہو۔ پہلے تو ہم نے سانسوں کا ردھم برابر کیا۔ پھر پوچھا امی جان، آج باجی نے ہمارے منہ کو مسور کی دال کہا ہے۔

ہم نے سمجھا کہ امی ہماری چٹا چٹ بلائیں لیں گی۔ وہ دال میں لہسن کا تڑکا لگا رہی تھیں۔ انہوں نے کہنے کی بجائے ہمیں ایسی نظروں سے دیکھا کہ ہم سمجھ گئے۔ بچپن میں چچک کے داغوں کی وجہ سے ہمارا چہرہ 'مسور کی دال' ہو گیا تھا۔

اب یہی صدیقہ باجی اپنے عینک کے عدسوں پر دوپٹے سے دائر لگاتی رہتی تھیں۔ شاید مگر مجھ کے آنسو تھے۔ دوپٹا بھیگ جاتا تھا مگر آنسو نہ تھمتے۔ اب رہ گئیں امی جان..... انتہائی سخت گیر امی جان۔ وہ اپنی ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتی تھیں۔ حالانکہ ان کی ناک پر کافی جگہ تھی۔ ان کی گود میں ہمیشہ ہمارا سر رہتا تھا اور وہ سورہ لیسین کے علاوہ ہر صورت پڑھ کر دم کرتی تھیں (یسین شریف جاں کنی کے لیے چھوڑ رکھی تھی)

قارئین ہماری بیماری کسی صورت 'ضدی بچے' کی طرح جان چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔ امی نے کچن کا سارا کام چچی جان کے سپرد کر دیا تھا۔ لیکن بار بار باورچی خانے کے چکر لگتے تھے کہ کہیں چچی گھی نہ انڈیل دیں ہانڈی میں، یا چانپ کی بوٹیاں اپنے بیٹوں کے لیے نہ نکال لیں۔

قصہ مختصر یہ کہ طبیبوں نے جواب دے دیا۔ میڈیکل اسٹورز پر تالے لگ گئے۔ ATM نے پیسے اگلنے سے انکار کر دیا۔ گھر والے کنگال ہو گئے۔ ابھی یہ لوگ سوچ ہی رہے تھے کہ IMF یا ورلڈ بینک سے قرضے کے لیے کاسہ پھیلائیں مگر فرشتہ اجل نے انہیں اس ذلت سے بچا لیا۔ ہم اس دنیا کو خیر آباد کہہ کر عالم بالا کے سفر پر روانہ ہو گئے۔ اب ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بھیا جاوید کے دوستوں اور محلے کے لڑکوں نے مل کر ایسا اتحاد اور ریسکیو کا مظاہرہ کیا۔

صوفی محلے والوں کے گھر پہنچا دیے۔ بیڈ

صدیقہ آپنی میں نے مرحومہ کے لیے دو
سپارے پڑھ لیے ہیں ثواب پہنچا دینا (کم بخت
نے 4-4 صفحے چھوڑ کر پڑھے ہوں گے۔ ہر جگہ
ڈنڈی مارتا ہے)

یہ جاوید بھائی تھے..... باجی..... باقی.....
میرے دوست صفیہ کی تعزیت کے لیے آئے ہیں
پلیز 4-5 کپ دودھ پی بھی بنا کر بھجوادیں۔ اور
ہاں اگر کچھ لوازمات (زہرنہ بھجوادیں)

کامران نے کہا۔ باجی صدیقہ..... آپنی کی
دوائیں لالا کرنا لگیں ٹوٹ گئی ہیں (کاش تمہاری ٹانگیں
سچ سچ ٹوٹ جاتیں)۔ (کفن کے اندر اسے کوسا)
چچی جان منہ پر دوپٹا رکھ کر رونے کی کوشش
کر رہی تھیں۔ یکا یک خیال آیا تو اپنے سپوتوں کو
گلے سے بھیج کر کہنے لگیں کہ دیکھو بریانی آئے تو
شرمانا بالکل نہیں۔ اچھی اچھی ران کی بوٹیاں نکال
کر کھا لینا۔

(ہمارا جی چاہا کہ ان کی بوٹی بوٹی کر دیں)
کیونکہ وہ ہمارے ادھورے افسانوں اور نامکمل
غزلوں کے پلندے سے کاغذ کی کشتیاں اور جہاز
بنارہے تھے۔

باجی صدیقہ، بہت غمگین فلاسفر کا Look
دے رہی تھیں انہوں نے اپنے موٹے عدسوں کی
عینک اتار کر ترمزی لینس لگا دیے تھے۔ (آخر
مہمانوں نے بھی آنا تھا)

اب ہم گھر والوں سے قطعی مایوس ہو چکے
تھے۔ پڑوسیوں کا بہت حق ہوتا ہے۔ خواتین
مارے جوش کے اتنی شدید گرمی میں بھی، جوق در
جوق آنا شروع ہو گئیں۔ کشور آئی برابر والے گھر
میں رہتی تھیں۔ اپنے چار سالہ گڈو کو گود سے پٹختے
ہوئے بولیں۔ اتنی گرمی میں یہاں بیٹھا ہے کم بخت
باہر جا کر مر..... کھانا آئے گا تو بلوالوں کی۔ گڈو کے

فولڈ کر کے اسٹور میں رکھوا دیے۔ فروٹ غائب
کر دیے گئے، گھر کا قیمتی سامان نقصان اور چوری
کے اندیشے کے پیش نظر الماریوں میں لاک
کر دیے گئے۔ میک اپ کا سامان ڈریسنگ ٹیبل
سے ہٹا کر چھپا دیا گیا۔ غرض یہ کہ اچھا خاصا گھر
چٹیل میدان بن گیا۔ محلے والوں نے بڑی
یگانگت کا ثبوت دیا۔ گرمی کی وجہ سے برف کے
کٹورے آگئے۔ پیڈل فین بھجوا دیے گئے۔
دریاں بچھ گئیں سپارے لاکھ رکھ دیے گئے (ہم
تیار یوں پر مسکرانے لگے)

ہمارا خیال تھا کہ ہماری موت کی تصدیق
ہوتے ہی گھر میں کھرام بپا ہو جائے گا۔ محلے کے
لوگ غم سے نڈھال ہوں گے۔ رشتہ داروں کو
ٹرین میں سیٹیں ملنا محال ہوں گی۔ (شاید ایک
خصوصی ٹرین چلائی جائے) گھر والے غش کھا کھا
کر ادھر ادھر گریں گے۔ بھائی دیوار سے ٹکریں
لگائے گا، کامران بیڈ سے ٹیک لگا کر روئے گا، پاپا
بے حال ہوں گے، باجی صدے سے پورا پورا
ہوں گی۔ اور امی..... ہائے امی کا کیا حال
ہوگا..... مگر لیجیے سب سے پہلی آواز امی کی تھی۔

”اف تو یہ، میرا تو گھٹنا ہی دہرا ہو گیا۔ بھئی
میں ذرا اپنی ٹانگیں سیدھی کر لوں (ہم نے سوچا
واقعی آپ کی عمر تھی ٹانگیں سیدھی کرنے کی)

پاپا! بھئی جاوید تم یہ سارے رسالے کتابیں
وغیرہ لائبریری میں واپس دے آؤ موت کا گھر
ہے، ادھر ادھر نہ ہو جائیں۔ ادھر کامران نے
ہمارا Galaxy سیٹ اٹھالیا۔ یہ آج سے میرا
ہوا۔ ہم (کسمسا کر رہ گئے) اچھا تھا کہ ہم مرنے
سے پہلے سارا ڈیٹا Delete کر دیتے۔ اب یہ
سب کو Tweet کرے گا۔ IMO اور واٹس اپ پر
ہماری PIC بنا کر اپ لوڈ کرے گا۔ اور کہے گا۔

جانے کے بعد انہوں نے رنجیدہ شکل بنالی..... بھی
صدیقہ بتول آپا (امی) نظر نہیں آرہی ہیں۔

بس آنٹی امی کا غم ہی ایسا ہے۔ جب سے
ہوش نہیں آرہا۔ ڈاکٹر نے آرام کا انجکشن لگایا
ہے۔ (جھوٹ) وہ ٹانگیں سیدھی کر رہی تھیں)

ہاں بھی (ایک اور خاتون نے لقمہ دیا۔

جوان جہان موت سے اللہ بچائے۔ بڑی نیک
سیرت بچی تھی۔ کبھی کسی غیر مرد کا منہ دیکھا)

(ہمارا جی چاہا کہ اُن کی خوش گمانی پر انہیں چوم
لیں اب انہیں کیا پتا کہ ہم فیس بک پر کتنے مردوں

کو دیکھتے ہیں اور ان کی پروفائل پیکچر کو
Like کرتے ہیں۔ ہماری فیس بک فرینڈز میں

مفتی منیب الرحمان سے لے کر ہمایوں سعید اور
بھارت میں دلپ کمار سے لے کر سونوگم اور

عمران ہاشمی تک ایڈ ہیں۔ خیر مفتی منیب الرحمان
سے تو ہم اب تک کنوارے رہ جانے پر اجر و ثواب

کے فتوے لیتے رہتے تھے۔ یا رمضان کے چاند کا
کنفرم کرتے تھے۔ یہاں ہمیں اعتراض تھا کہ

جب سے TV پر چاند کا بتایا جانے لگا، محلے کے
چاندوں نے چھت پر آنا چھوڑ دیا۔ اب وہ

اسکا پ پر ایک دوسرے کو چاند بھیجتے تھے۔
ہمایوں سعید نے ہماری فرینڈ ریکویسٹ کبھی

او کے نہیں کی۔ دلپ کمار تائب ہو چکے ہیں جبکہ
عمران ہاشمی نے تو ایک بار ہمیں فلائنگ Kiss کا

سائن بھی بھیج دیا۔
پہلے تو ہم شرمائے، پھر ہم نے انہیں لکھا کہ

”آپ ہمارے چھوٹے بھائی جیسے ہیں۔“ تو بدتمیز
فٹ سے Reply کرتا ہے کہ ہم نے بھی آپ کو

’آپا‘ سمجھ کر بھیجا ہے۔
صابرہ پھوپھو ہمارے بائیں جانب رہتی

تھیں۔ انہوں نے ہمسائیگی کا حق ادا کرتے

ہوئے اپنی بڑی بڑی آنکھوں میں بہ مشکل دو
آنسو کشید کر ہی لیے۔ کہنے لگیں۔ صفیہ بڑی معصوم
تھی ذرا چالاکی نہیں تھی اس میں دوسری خاتون جو
خائف تھیں کہنے لگیں میں تو سمجھ رہی تھی بڑی شاطر
ہے (شاید وہ شاطر کی بجائے شاعر کہنے لگی تھیں)

صابرہ پھوپھی نے اُن کی بات بڑے جوش
سے کاٹی..... اب یہی دیکھ لو، بے چاری ایک دن

میرے پاس آئی تو کہنے لگی۔ پھوپھی جان آج
کڑھی پکار رہی ہوں مگر بس کم ہو گیا ہے آپ تھوڑا

سائین دیدیں۔ میں نے بسن میں چاولوں کا
آٹا ملا کر دے دیا۔ اور سوچا کیا عمدہ کڑھی بنے

گی۔ مگر کیا ہوا کہ ایک گھنٹے بعد وہ بڑا سا باؤل بھر
کر کڑھی لے آئی۔ تو میں تو دل میں بے حد

شرمندہ، بس تب ہی سے میں سمجھ گئی۔
(اب ہم کفن کے اندر کسما کر رہ گئے۔ ہم

نے سوچا پھوپھی صابرہ کتنی اچھی ہیں ہماری تعریف
تو کی۔ جبکہ ہم تو انہیں عید بقر عید پر دو بوشیاں اور آٹھ

ہڈیاں دیتے تھے۔ اگر ہم اس سال بقر عید تک زندہ
رہتے تو انہیں ایک سالم ران ضرور بھیجتے کیونکہ ہم

نے انہیں کڑھی کا وہ باؤل دیا تھا جس میں مکھی گر گئی
تھی۔ (یا اللہ اس گناہِ صغیرہ پر ہمیں معاف کرنا)

ابھی ہماری تعریفوں کا سلسلہ شرر روع ہوا تھا
کہ وا پڈا والوں کو پتا چل گیا۔ انہوں نے احتجاجاً

لائٹ بند کر دی۔ باجی بے چاری ڈھونڈ ڈھانڈ کر
دو تین ہاتھ کے سٹکھے لے آئیں۔ ایک خاتون

چراغ پا ہو گئیں۔ ارے صدیقہ جنرل چلو اؤنا۔
باجی بے چاری ایسی شرمندہ ہوئیں جیسے اُن پر کسی

نے گھڑوں پانی ڈال دیا ہو۔ جنرل تو نہیں ہے۔
اے لو اتنی بڑی لیکچرار اور گھر میں جنرل تک نہیں۔

آنٹی یو پی ایس جو ہے۔ مگر کل سے چارج
نہیں ہو سکا۔

ایک اور خاتون کو زیادہ ہی گرمی لگ رہی تھی۔ گھبرا کر بولیں۔ آئے ہائے گرمی میں تو کسی کو مرنا ہی نہیں چاہیے اور وہ بھی رمضان میں.....
اب افطاری تک بیٹھنا پڑے گا۔ (کھانے کے لیے) (ہم نے دل میں کہا لوگ تو رمضان میں مرنے کی دعا مانگتے ہیں) امی کی سہیلی حق دوستی ادا کرتے ہوئے بولیں۔

میں تو خدا لگتی کہتی ہوں اعمال جیسے بھی تھے۔ جائے گی سیدھا جنت میں (ان کا یہ فتویٰ سن کر ہمارا جی چاہا کہ اٹھ کر بے بی تیری چٹیاں کلائیوں سے ناچنا شروع کر دیں مگر کچھ امر مانع تھے کہ ایک تو کفن ادھ سلا ہے۔ ہمارا امیج خراب ہو جائے گا۔

آنگن ٹیڑھا ہے تیسرے یہ کہ نہ تو ہماری کلائیوں چٹیاں ہیں نہ ہم بے بی ہیں بلکہ بے بی کھلانے کی عمر سے بھی تجاوز کر گئے ہیں۔ دل چاہا بتول آئی کو گلے لگالیں۔ بھئی جنت میں جانے کا شارٹ کٹ دے دیا۔ سوچا ہم یہ فضول حرکت کیس تو ایسا نہ ہو کہ فرشتے جنت میں لے جانے کے بجائے جہنم رسید کر دیں اور یوں یہ حسرت رہ جائے قدرت نے ہمیں گولڈن چانس دیا تھا۔ واہ جی کیا فنا شک ماحول ہوگا۔ خوبصورت سے غلمان حسین حوریں، انواع واقسام کے میوے، اور تو اور سنا ہے وہاں شراب بھی حلال ہوگی۔ بھئی موجاں کی موجاں)

پھر بتول آپا کو اچانک یاد آ پامی کا گٹھنا ہلا کر بولیں۔ اے بتول، ذکیہ (چھوٹی بہن) کراچی سے آرہی ہے۔ امی نے گرا کر کہا۔ اے کہاں بے چاری آسکے گی۔ شدید گرمی لباسفر، روزے پھر عید سر پر، جاوید کو کہہ دیا ہے اسکا پپر ساری کارروائی دکھا دے (یا ہو..... ہم کفن کے اندر چلائے۔ مطلب یہ کہ ہمارے جنازے کے ساتھ ساتھ لیپ ٹاپ بھی جائے گا۔

چل ساتھ کہ مسرت دل محروم سے نکلے
عاشق کا جنازہ ہے ذرا دھوم سے نکلے
جاوید بھائی کاش عہد نامے کے بجائے لیپ
ٹاپ رکھ دیں۔ بھئی دوستوں سے رابطہ تو رہے
گا۔ محلے کی عورتیں ہماری گنی چنی تعریفیں کر کے
تھک گئیں۔ تو آپس میں لگیں غیبتیں کرنے۔

اب ہم ان سب سے مایوس ہو گئے۔ ہمیں
آخری انتظار تھا۔ اپنے اسٹاف اور کولیکٹرز کا جو ہماری
چچی قدر دان ہیں۔ ہماری ہونہار طالبات.....

اُف کالج میں تو تین دن کے لیے کلاسز بند ہو گئی
ہوں گی۔ ہونا بھی چاہئیں ہمارے جیسی عالم فاضل
پروفیسر اس صدی میں دوبارہ پیدا نہیں ہو سکتی۔

خیر جناب سینڈلوں کی کھٹ پٹ ہوئی۔
خوشبوؤں کے جھونکے، دبی دبی سسکیاں یہ میڈم
شاہدہ کا ہدایت نامہ تھا۔ ان سب کو گیٹ پر
کھرے ہو کر دیا۔

بھئی شہلا تم نے ابھی سے رونا شروع کر دیا،
یار تو پہلی بات فوت ہوئی اور تم..... (مجھے کیا برا تھا
مرنا اگر ایک بار ہوتا) اور دیکھو اب ان کا روئے
سخن اس سال نئی لیکچرز کی طرف تھا۔

عفصہ، شبانہ، صدف، فرحانہ بھئی دیکھو تم
لوگ نیوکمرز ہو۔ تو تم لوگوں کو زیادہ ایسوشنل
ہونے کی ضرورت نہیں ہے بس جب اُسے
اٹھانے لگیں تو تھوڑا سا رو لینا۔ اور ہاں یا سمین تم
نے درود شریف کی تسبیح اور 15 سپارے پڑھے
تھے وہ بخش دینا۔ اور ہاں اب آپ سب لوگ
گلیسرین میں بھیکے ہوئے رو بال نکال لو۔ اس محفل
میں سب سے زیادہ ہم سب کو غمگین نظر آنا ہے۔

سب سے زیادہ مس ناہید راجپوت جذباتی
نظر آرہی تھیں۔ وہ آ کر باجی صدیقہ سے جذباتی
انداز سے لپٹ گئیں۔ باجی اس اچانک حملے کے

آگئی۔ میڈم شاہدہ بھٹی تم لوگ سب سوئم میں کیا پہنوں گے۔ یا سمین مستوئی، سندھی کی لیکچرار ہماری پیاری دوست گویا ہوں۔

بھٹی میں تو یہاں آتے ہوئے اپنا سوٹ درزی کو دیتی ہوئی آئی ہوں دعا کرو کہ سوئم تک سل جائے کیونکہ آج کل درزیوں کے بہت نخرے ہیں سوئم تک کپڑے چہلم تک سی کر دیتے ہیں۔ ان سب نے ہاتھ اٹھائے دعا کے لیے۔

(میری مغفرت کے لیے نہیں بلکہ یا سمین (خوش لباس) کے سوٹ کے لیے کہ وہ سوئم تک سل جائے)

ادھر ایک اور لیکچرار گویا ہوں۔ ایسا کریں گے کہ کل لڑکیوں سے قرآن خوانی کروالیں گے اور بعد میں ایک تعزیتی اجلاس رکھ لیتے ہیں۔ صفیہ نے مجموعہ کلام میں اپنے مرنے پر جتنی نظمیں لکھی ہیں تم سب کو ایک ایک صفحہ پھاڑ کر دے دوں گی۔ لو آج صفیہ مرگئی۔ میں پڑھ لوں گی (چالاک) سمجھ لو ایک مشاعرہ ہو جائے گا۔ مرحومہ کو ثواب بھی ملے گا۔

☆.....☆.....☆

یہاں ہماری مغفرت کی فکر کس کو تھی۔ لیجئے کھانا آچکا تھا۔ دیکھیں کھڑک رہی تھیں۔ پلیٹیں پٹی جارہی تھیں۔ کف گپ اور چمک کھنگ رہے تھے۔ اور ہم اندر ہی اندر چیخ رہے تھے۔

بعد مرنے کے میرے کیا ہوگا
پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا
ہم ان ہی تفکرات میں غلطاں و پیمان تھے اور
غالب کے اس خیال کے ایک سو دس فیصد متفق۔
ہوئے ہم جو مر کے رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

☆☆.....☆☆

لیے تیار نہیں تھیں۔ وہ مس ناہید سمیت ہم پر گرنے لگیں۔ (مرے پہ سوڈرے اور سہی) صد شکر کہ اللہ نے بچالیا۔ مس شہیلا انگریزی کی لیکچرار تھیں مگر اردو ہم سے اچھی بولتی تھیں۔ صدیقہ باجی، اچھا ہے اس بہانے آپ سے ملاقات تو ہوئی، بھٹی شادی مئی کے موقع پر ہی تو اعزاء و اقربا و جدم عالی قدم ملتے ہیں (ہم زندہ ہوتے تو شہیلا کی اس اردوئے معلیٰ پر غش کھا جاتے)

بھٹی پس ندیات نظر نہیں آرہیں، مس شاہین کو تنکر و تائیت کا بے حد خیال رہتا تھا۔ مس امبرین نے ابتدا کیء ہمارے سرہائے آئیں ہمارے چہرے پہ سے کفن سرکایا اور مصرع داغا۔ (پرانا شعر)

یہ نیا لباس کیسا یہ کہاں کے ہیں ارادے (لوجی اب کفن پہن کر ہم کسی فنکشن میں تو جانے سے رہے۔ ظاہر ہے شہر خموشاں جا رہے ہیں۔ اُن کی لاعلمی پر ہمیں بے حد افسوس ہوا) مس حمیرا ساہ اردو سندھی لہجے میں بولتی ہیں وہ گویا ہوں۔

گلی ہم نے کہی تھی، تم تو دنیا چھوڑے جاتے ہو (لوجی جب اس گلی میں نہیں جانا تو دنیا میں رہ کر کیا کرنا) دونوں ایک ساتھ چھوڑ دیں۔ واؤ..... نتاشہ (ہماری شاگرد بھی اور اب لیکچرار بھی) صدیقہ باجی میم کتنی پیاری لگ رہی ہیں۔ اسکن تو دیکھیں کتنی شائن کر رہی ہے۔ کیا آپ نے فیشنل بھی کروایا ہے) (ہمیں ہنسی بھی آئی اور غصہ بھی..... فٹے منہ۔ یہ لوگ کیا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ یہ تو ہمارے چہرے پر نور آیا ہوا ہے دنیا والے اسے سمجھنے سے قاصر تھے۔

ہماری کولیگز نے بھی جانے کے لیے پڑ تو لے۔ مگر ان سب کو ایک ضروری بات یاد

دوشیزہ گلستان

اسماء اعوان

☆ تقدیر پر راضی رہنے پر عم دور ہو جاتے ہیں۔

☆ زیادہ مذاق کرنا گویا ایک ایسی جدائی ہے کہ جس کے بعد کینہ اور دشمنی پیدا ہو جاتی ہے۔
مرسلہ: معصومہ رضا۔ گلستان جوہر۔ کراچی

انارکارس

انارکارس دل کے لیے ٹانگ ہے۔ کینسر سے بچاتا ہے۔ سائنسدانوں نے دعویٰ کیا ہے کہ انارکارس کے دانوں میں پیٹ کی اضافی چربی کم کرنے کی صلاحیت ہے اور اس کا استعمال بلڈ پریشر کو بھی کم کرتا ہے۔

مرسلہ: گل رعنا۔ کراچی

پیر صاحب

ایک پیر صاحب کے بارے میں حسب ذیل واقعہ علامہ اقبال نے ڈاکٹر امیر الدین کو سنایا تھا انہوں نے کہا۔ یہ پیر صاحب میرے مہمان تھے ان سے ملنے کے لیے ان کا کوئی مرید بھی یہاں آ گیا۔ یہ ایک خستہ حال غریب گوجر تھا۔ مٹی سے اٹے ہوئے پاؤں میلی چھلی دھوتی اندر آ کر اس نے پیر صاحب کے ہاتھ چومے، فرش پر بیٹھ کر 'ڈب' سے چاندی کے دو روپے نکالے اور پیر صاحب کی نذر کر دیے۔ پیر صاحب نے پوچھا تو مرید بولا۔ چھاؤنی سے چل کر آیا ہوں، حال بہت

نعت رسول مقبول

میں حضور کی ادنیٰ کنیز ہوں میری دن و دنیا سنور گئی میں دعا کروں صراط مستقیم ہو میری رہ گزر میرے صبح و شام ہوں یوں ہی بسر کہ میرے لبوں پر ہو نام محمد میرے سینے میں ہو نام خدا میرے سجدوں میں ہے یہ التجا کہ مجھے ملیں میرے مصطفیٰ میں حضور کی ادنیٰ کنیز ہوں مجھے دنیا سے کوئی نسبت نہیں میں حضور کی ادنیٰ کنیز ہوں شاعرہ: مسز نگہت غفار۔ کراچی

اقوال حضرت علی

☆ جو شخص کوئی چیز دے کر جتلانا ہے اس کے احسان میں کچھ لطف نہیں ہوتا۔
☆ میں جنت کے شوق میں عبادت نہیں کرتا کہ یہ عبادت نہیں تجارت ہے میں دوزخ کے خوف سے عبادت نہیں کرتا کہ یہ عبادت نہیں غلامی ہے۔ میں صرف اس لیے عبادت کرتا ہوں کہ میرا رب عبادت کے لائق ہے۔
☆ برباد شخص فحش نہیں بکتا اور شریف آدمی کو وحشت میں نہیں ڈالتا۔

دوشیزہ 247

READING
Section

پتلا ہے گائے مرگنی ہے۔ دو سو روپے کا قرض سر پر ہے، دعا کریں پروردگار میری مشکل آسان کر دے۔“

پیر صاحب کے ساتھ مرید نے اور علی بخش نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے میں حقہ پیتا رہا۔ پیر صاحب نے مجھ سے پوچھا آپ دعا کے قائل نہیں ہیں۔ میں نے کہا میں دعا کا بڑا قائل ہوں لیکن میری دعا آپ کی دعا سے نکل جاتی تھی۔ آپ کا مرید پہلے دو سو روپے کا مقروض تھا اب دو سو دو روپے کا ہو گیا ہے۔ یعنی قرض مزید بڑھ گیا۔ واپسی پر ٹانگے کا کرایہ دے گا اس کی تو دھاڑی بھی ضائع ہوگی آپ کو تو چاہیے تھا کہ اس کی مدد کرتے کچھ اپنے پاس سے دیتے اور محنت کی تلقین کرتے۔ پیر صاحب کے پاس اس کا کوئی جواب نہ تھا۔

مرسلہ: یاسمین اقبال۔ سنگھ پورہ۔ لاہور

کیا دیا محبت نے

اپنے دل سے اگر نکال مجھے
تو کسی اور دکھ میں ڈال مجھے
سچ کہو کیا دیا محبت نے
تم کو بے چینیاں ملال مجھے
بے ثباتی نے خوب شور کیا
جب بھی آیا تیرا خیال مجھے
اس میں تیرا قصور کچھ بھی نہیں
راس آیا نہیں وصال مجھے

شاعر: کامی شاہ۔ پسند: صبوحی کاظمی۔ کلفٹن کراچی

ہائے رے سادگی

پٹھان ایک پارٹی میں گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ہچکچاتے ہوئے ایک لڑکی سے پوچھا۔ ”کیا آپ ڈانس کریں گی۔“ لڑکی فوراً اپنی کرسی سے کھڑی ہوتے ہوئے بولی۔ ”ہاں کروں گی۔“

پٹھان خوش ہو کر بولا۔ ”تو باجی پھر میں آپ

کی کرسی لے لوں۔“

مرسلہ: احسن رضا۔ اسلام آباد

دولت سے

عینک تو خرید سکتے ہیں، بینائی نہیں
دوائی تو خرید سکتے ہیں، محبت نہیں
اچھا لباس تو خرید سکتے ہیں، شخصیت نہیں
نرم و نازک بستر تو خرید سکتے ہیں، میٹھی نیند نہیں
خوشامد تو خرید سکتے ہیں، حقیقی پیار نہیں
جواہرات تو خرید سکتے ہیں، حسن نہیں
کرسی تو خرید سکتے ہیں، مگر دل سے گئی عزت نہیں

مرسلہ: ماہین خاور۔ سیالکوٹ

بے عزتی

ایک شخص نے اپنے دوست سے کہا۔ آج
میرے پڑوسی نے میری بڑی بے عزتی کی۔
وہ کیسے.....؟
وہ مجھ سے پوچھنے لگا تمہیں گانا آتا ہے؟
اس میں بے عزتی کی کیا بات ہے؟
”لیکن اس نے کافی دیر تک میرا گانا سننے
کے بعد یہ سوال کیا تھا۔“

مرسلہ: شبانہ نسیم۔ خانیوال

دردِ دل

پھولوں کی طرح زخم سب ہم نے سجالے
ہر درد میں تمہاری قسم..... مسکرا لیے!
روح کی زمیں اس قدر زرخیز تھی کہ خود
خالی جہاں جگہ ملی کانٹے اگا لیے!
جو نیم جان ہوئی تو پھر احباب نے میرے
قبل از وقت نام کے کنبے بنا لیے!
کوئی مسیحا ہاتھ میرے واسطے نہیں
میں نے دیے شعور کے پھر کیوں جلا لیے!

شاعرہ: خولہ عرفان۔ لاہور

کنجوس

ایک کنجوس آدمی کے گھر بجلی کا میٹر لگا۔ ایک ماہ بعد جب میٹر ریڈنگ کے لیے ریڈر آیا تو اسے بہت حیرت ہوئی کیونکہ صرف ایک ہی یونٹ چلا تھا۔ اس نے کنجوس سے پوچھا۔

”کیا آپ بجلی استعمال نہیں کرتے.....؟“

جی کرتے ہیں لیکن اس وقت جب لائٹیں تلاش کرنی ہوتی ہے کنجوس نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

مرسلہ: زریں زبیر کوٹھاری۔ کراچی

خوبصورت باتیں

میں آج تک اپنی خاموشی پر نہیں پچھتا تا جب بھی پچھتا یا ہوں اپنے بولنے پر پچھتا یا ہوں۔ (شیخ سعدی)

اتنا میٹھا نہ بنو کہ لوگ نچوڑ لیں اور اتنا کڑوا بھی نہ بنو کہ لوگ تھوک دیں۔ (عربی ادب)

کینہ رکھنے سے اپنے ہی دل کے زخم ہرے ہوتے ہیں۔ (بیکن)

دنیا میں سب سے مشکل کام اپنی اصلاح اور سب سے آسان دوسروں پر نکتہ چینی ہے (ٹالسٹائی)

کوئی کیسا ہی اچھا ہو، بروں کی صحبت اسے برا بنا دیتی ہے۔ (حضرت خواجہ معین الدین)

مرسلہ: ندیا مسعود۔ کراچی

شکوہ

ہم نے تو خیر تجھ سے شکایت کبھی نہ کی ایسا نہیں کہ دل نے بغاوت کبھی نہ کی چاہا ہے میں نے جس کو بڑی شدتوں کے ساتھ اس طرح اس نے مجھ سے محبت کبھی نہ کی اک آگ تھی کہ جلتے رہے جس میں عمر بھر

اک درو تھا کہ جس میں خیانت کبھی نہ کی شاعر: (اعتبار ساجد) پسند: رقیہ یوسف۔ ڈسکہ

فراڈ

گدا گیروں کے متعلق یہ فرض کر لینا درست نہ ہوگا کہ سب ہی فراڈ ہوتے ہیں بعض کی مجبوریاں پیدائشی ہوتی ہیں۔ ابھی کل ہی ایک لڑکا معصوم صورت گلے میں تختی لٹکائے آیا جس پر لکھا تھا میں گونگا بہرہ ہوں، راہ مولا میری مدد کیجیے۔ ہم نے ایک روپیہ دیا اور چکار کر پوچھا۔ ”برخوردار کب سے گونگے بہرے ہو؟ بولا۔ ”جی میں پیدائشی ہوں۔“

ابن انشاء کی خمار گندم سے اقتباس انتخاب: افشاں رضا۔ اسلام آباد

سوال

طنز یہ لہجہ
مناقق دل
جھوٹے وعدے
لفظوں کے حال
اور دلوں سے کھیلنے کا فن
اے ابن آدم
کیا تو واقعی
اشرف المخلوقات ہے

پسند: نیلم اسلم۔ کراچی

دیہاتی کی دعا

ایک دیہاتی کو مولوی صاحب نے بتایا۔ ”افطار کے وقت جو بھی دعا کرو قبول ہوتی ہے۔“ پہلے روزے کی افطاری کے وقت دیہاتی نے دعا مانگی۔

”یا اللہ صبح عید ہو جائے۔“

مرسلہ: سید شبیر رضوی۔ لندن

دے سکتے ہیں۔ لیکن اللہ سے محبت کرنے والے
کبھی دکھ نہیں دیتے۔

مرسلہ: شاز یہ مسعود۔ ملتان

دل کی بات

اوروں کے سنگ خوش خوش رہتا ہے
مجھ سے اکھڑا کھڑا سا
دل کی بات کروں کس سے؟
ہر بات میری اک دکھڑا سا
شعر میرے کچھ ایسے ہی ہیں
کوئی نوحہ کوئی مکھڑا سا
درد ہے میرے دل کے اندر
چہرہ نکھرا نکھرا..... سا
دل اب خوش ہوتا ہی نہیں
رہتا ہے اجڑا اجڑا سا

شاعرہ رضوانہ کوثر۔ لاہور

راج نیٹی

دنیا میں صرف وہ قوم راج کرتی ہے۔
جو دلیل سے قائل ہو جاتی ہے۔
جو عذر کو قبول کر لیتی ہو۔
جو اختلاف رائے کو محفل کا حسن گردانتی ہو۔
جو تحقیق کی مداح ہو۔
جو تجربے کو ہمد و ہم نشین رکھتی ہو۔
جو سر پر عزت نفس کا کلمہ باندھتی ہو۔
جو کوشش کے جوتے پاؤں سے لپٹائے رکھتی ہو۔
جو قانون کو زور کی طرح عزیز رکھتی ہو۔
جو مذہب کی مشعل ہاتھ میں لے کر چلتی ہو۔
جو ہر دفاع کو سوچنے اور ہر ہاتھ کو مثبت کام
کرنے کی آزادی دیتی ہو۔
جو جید لوگوں کو حکمران رکھتی ہو۔

افشین شاہ۔ حیدرآباد

☆☆.....☆☆

تلخ و شیریں

☆ اپنے سال پر غور کرنے کے لیے تنہائی
ضروری ہے اگر آپ کو تنہائی میسر نہ ہو تو دوستوں
سے اپنے مسائل کا تفصیلی ذکر شروع کر
دیجیے۔ جلد ہی آپ کو تنہائی مل جائے گی۔

☆ جب عورت کسی مرد کی تعریف کرتی ہے تو
وہ اُسے باتونی ہونے کا طعنہ نہیں دیتا۔

☆ کتاب انسان کی بہترین دوست ہے۔
مگر احمقوں کو بہترین دوست کی تلاش نہیں ہوتی۔

مرسلہ: ریحانہ مجاہد۔ کراچی

۵۹

کبھی وہ اپنی کبھی اجنبی سی لگتی ہے
پرانی دوست سے لیکن نئی نئی سی لگتی ہے
جمال ایسا کہ لگتی نہیں کمی کوئی
کمال ایسا کہ خود میں کمی سی لگتی ہے
وہ چاند تو نہیں لیکن مشاہدہ ہے یہ ہی
اسی کے چار طرف چاندنی سی لگتی ہے
میں اب تلک اُسے حیران ہو کے تکتا ہوں
وہ اب تک مجھے جادو گری سی لگتی ہے
یہ کیا ہے جس کے سراپے میں کھو گئے جاوید
وہ جس کی بات سدا ان گہی سی لگتی ہے

شاعر: عبداللہ جاوید

پسند: شہزاد انصاری۔ کوئٹہ

یہ سچ ہے کہ.....

☆ کبھی کبھی مرنے کے لیے زہر کی ضرورت
نہیں ہوتی۔ حساس انسانوں کو تو روپے ہی مار دیتے
ہیں۔ اور یہ موت بڑی اذیت ناک ہوتی ہے۔
☆ بعض رشتوں کو برقرار رکھنا انہیں توڑ
دینے سے زیادہ تکلیف دہ ہوتا ہے۔

☆ اللہ کی عبادت کرنے والے لوگوں کو دکھ

نولکی وڈ ابولکی وڈ

وڈ کی خان

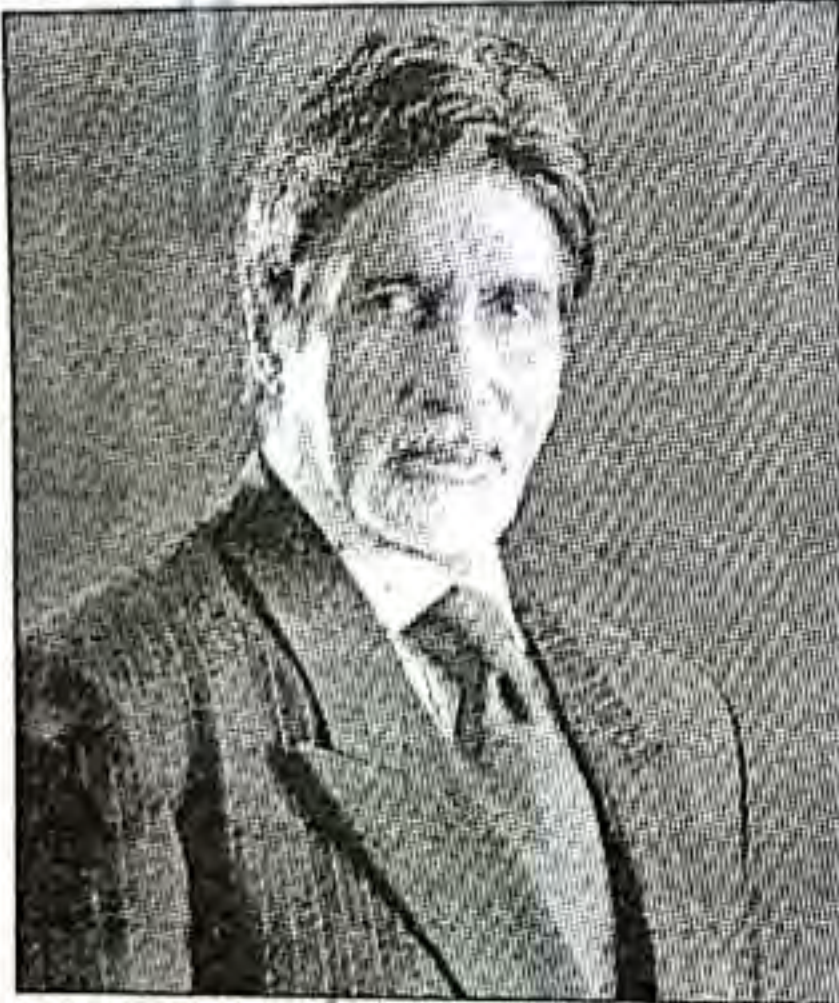
خفیہ رکھا گیا تھا لیکن اب ان دونوں کے گھر آنے والے نئے مہمان کی خبر کو پوشیدہ رکھنا شاید ان کے بس میں نہیں رہا تب ہی تو ساری میڈیا میں یہ نیوز بڑی شدت کے ساتھ گردش کر رہی ہے۔

ایٹا بھ بچن 102 پرناٹ آوٹ

قارئین یہ کوئی کرکٹ کی خبر نہیں بلکہ ایٹا بھ بچن کی ایک ایسی فلم کا ذکر ہے جس میں انہیں ایک ایسے

رانی مکھرجی، امید سے.....

رانی مکھرجی کے فینز یہ خبر سن کر خوش ہوں گے کہ رانی مکھرجی ماں بننے والی ہیں۔ گزشتہ سال اس



بوڑھے شخص کا کردار ادا کرنا ہے جو سو سال سے

نے نہایت خاموشی سے لیش چوپڑہ کے بڑے بیٹے آدھ چوپڑہ سے شادی کر لی تھی اور اس خبر کو انتہائی

دو شیشہ 251

READING
Section

سنیل سیٹھی کی خوشی
ادا کار سنیل سیٹھی اپنی بیٹی عطیہ کی پہلی فلم ”
ہیرو“ کی ریلیز پر بہت اکسائینڈ ہیں وہ کہتے ہیں



کہ میں یقیناً خوش ہونے کے ساتھ ساتھ نروس
بھی ہوں کیونکہ میں اس انڈسٹری میں 26 سال
سے ہوں اور جانتا ہوں کہ جب آپ کی فلمیں
نہیں چلتی تو کیسے کیسے الزامات اور خطابات دیے
جاتے ہیں۔ میں اور عطیہ باپ بیٹی سے زیادہ
فرینڈز ہیں۔ سلمان خان نے میری بیٹی کو لائچ کیا
ہے اور میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ عطیہ کو اس
سے بہتر لائچنگ نہیں مل سکتی تھی جب میں نے
سلمان خان کا شکریہ ادا کیا تو اس نے زور سے
میرا ہاتھ پکڑ کر کہا پلیز ڈونٹ say تھینک یو۔

گلوکار آصف مہدی کی علالت

شہنشاہ غزل مہدی حسن کے صاحبزادے گلوکار
آصف مہدی کو ان کے علاج کے لیے وزارت
ثقافت کی جانب سے شرمیلا فاروقی صاحبہ نے دو

اوپر ہونے کے باوجود انرجیٹک اور زندگی سے
بھرپور ہے فلم کا نام 102 ناٹ آوٹ ہے دیکھتے
ہیں 73 سالہ ایتا بھ اس پروجیکٹ پر کام کرنے
کی حامی بھرتے بھی ہیں یا نہیں۔

کا جل کی ممتا

کا جل ایک بے پناہ محبت کرنے والی ذمہ دار ماں
ہیں جو اپنے بچوں کی خاطر کچھ بھی کر سکتی ہے ورنہ



انتہائی عروج کے زمانے میں اپنے کیریئر کو خیر آباد
کہنا کوئی آسان بات نہیں لیکن کا جل نے اپنے
دونوں بچوں کو فلمی دنیا کی چکا چونڈ پر فوقیت دے کر
یہ ثابت کر دیا کہ بچوں سے زیادہ اس کے لیے کچھ
اہم نہیں۔ پچھلے دنوں جب ’دل والے‘ کی شوٹنگ
کے لیے کا جل بلغاریہ گئی تھی تو دونوں بچے اور
ساسو ماں بھی اس کے ساتھ تھے لیکن پھر جب
شوہر اے نے شوٹنگ شروع ہونے پر بچوں کو
واپس بلوا لیا تو کا جل کی بے چینی کو ہر کسی نے
محسوس کیا۔

دوشیزہ 2022

READING
Section

لاکھ روپے کا چیک دیا۔ آصف مہدی کے گردے



چل ہو چکے ہیں۔ اور ان کا علاج کڈنی سینٹر میں چل رہا ہے۔

حزہ علی عباسی کا فیصلہ

حزہ علی عباسی اپنی فلم 'جوانی پھر نہیں آئے گی' کے بارے میں اپنے بیان کی وضاحت کی ہے وہ کہتے



ہیں کہ جب میں نے یہ فلم سائن کی تھی تو یہ سو فیصد صاف ستھری مزاحیہ فلم تھی جب ان دو گانوں کو فلم میں شامل کیا جا رہا ہے تو جن پر مجھے اعتراض ہے تو سچویشن کچھ یوں تھی کہ سر پر تلوار لڑکا دی گئی تھی اس وقت واک آؤٹ کرتا تو میرے دوستوں کو

وقت اور پیسے کا بھاری نقصان اٹھانا پڑتا لیکن جب فلم کا ٹریلر شروع ہوا اور تنازع گانوں کے نمونے دیکھے تو محسوس ہوا کہ یہ اچھا کام نہیں ہوا۔ بہر حال اب اپنے ضمیر کے مطابق میں فیصلہ کر چکا ہوں کہ اگر یہ دونوں گانے شامل رہتے ہیں تو فلم کو پروموٹ نہیں کروں گا۔ اور اس کے لیے مجھ پر کوئی زور زبردستی نہیں کی جاسکتی۔

ماں اور بیٹی پھر سے فلموں میں

اپنے دور کی مشہور اور حسین ہیروئن نشوونما پاکستانی فلموں کے ری وایول پر کافی خوش ہیں اور سہیل



خان کی 'شور شرابہ' کو سائن کرتے ہوئے انہوں نے اپنی خوشی کا بھی اظہار کیا مزے کی بات یہ ہے کہ ان کی بیٹی اور جان ریمبو کی بیگم یعنی سابقہ مشہور ہیروئن صاحبہ نے بھی فلموں کے ری وایول سے متاثر ہوتے ہوئے ان میں انٹرسٹ ظاہر کیا ہے۔ دو جوان ہوتے ہوئے بیٹوں کی ماں ہونے کے ناطے وہ کم سن چیچل ہیروئن کے روپ میں تو نہیں آسکتیں ہاں البتہ انہوں نے اچھے اور پاور فل رول کرنے کی خواہش کا اظہار ضرور کیا ہے۔

☆☆.....☆☆

دوشیزہ 253

READING
Section



کچن کارنر

نادیہ طارق

مٹن اسٹو

بادام پتے تازہ کریم گرم مسالہ پاؤڈر ہلدی پاؤڈر جاتفل، جاوتری پاؤڈر لال مرچ پاؤڈر لہسن ادراک پیسٹ نمک تیل ہر ادھنیا (چوپ کر لیں) باریک کٹی ہوئی ادراک اور ہر ادھنیا سجاوٹ کے لیے

بیس گرام دس گرام سو گرام ایک کھانے کا چمچ ایک کھانے کا چمچ آدھا چائے کا چمچ دو کھانے کے چمچے دو کھانے کے چمچے حسب ذائقہ ایک چوتھائی پیالی ایک چوتھائی گھی

ترکیب:

اجزاء بکرے کا گوشت چھوٹی پیاز دہی گھی ثابت لال مرچ ادراک (باریک کٹا ہوا) ثابت گرم مسالا ٹماٹو (کٹے ہوئے) گرم مسالا پاؤڈر ہر ادھنیا

آدھا کلو ایک پاؤ آدھا کپ آدھا کپ دس عدد ایک چائے کا چمچ بقدر ضرورت آدھا کپ ایک چوتھائی چائے کا چمچ حسب ضرورت

ترکیب:

پتیلی میں تیل گرم کر کے لہسن ادراک سنہری کر لیں اور اس میں گوشت ڈال کر رنگ تبدیل ہونے تک پکائیں۔ پھر اس میں ہر ادھنیا، گرم مسالہ، ہلدی، جاتفل، جاوتری، لال مرچ، نمک دہی اور ایک پیالی پانی شامل کر کے ڈھکن ڈھانپ دیں اور پکنے کے لیے رکھ دیں۔ بادام اور پتے ابالیں اور چھلکا اتار کر باریک کاٹ لیں جب گوشت گل جائے تو اسے بھون لیں۔ اب اس میں بادام پتے اور کریم شامل کر کے بھونیں۔ پانی خشک ہو جائے اور تیل علیحدہ نظر آنے لگے تو ڈش میں نکالیں، ادراک کی کاشوں اور ہرے دھنیے سے سجا کر پیش کریں۔

پیاز پھیل کر تھوڑے سے گھی میں تیک کر علیحدہ کر رکھ لیں۔ باقی گھی میں گوشت، چابت گرم مسالہ، ثابت لال مرچیں، لہسن، ادراک، نمک اور تھوڑا پانی شامل کر کے ڈانپ دیں اور پکائیں۔ ج گوشت گل جائے تو ٹماٹو، دہی اور پیاز ڈال کر بھون لیں۔ جب گھی اوپر نظر آنے لگے تو ایک چنگلی گرم مسالہ اور کٹا ہوا ہر ادھنیا ڈال کر سرو کریں۔

شاہی مٹن گوشت

اجزاء بکرے کا گوشت دہی ایک کلو آدھا پاؤ

ہوئی پیاز سے گارنش کر کے پیش کریں۔

بخنی پلاؤ

نہاری

اجزاء	اجزاء	اجزاء	اجزاء:
آدھا کلو	بونگ کا گوشت	ایک کلو	بکرے کا گوشت
دو عدد	نلیاں	ایک پوتھی	لہسن
ایک کپ	تیل	ایک انچ کانگڑا	ادرک
دو کھانے کے چمچے	لہسن ادرک پیسٹ	ایک چائے کا چمچ	سونف
ایک ٹکڑا	ادرک	ایک چائے کا چمچ	ثابت دھنیا
ایک کپ	آنا	ایک چائے کا چمچ	سفید زیرہ
ایک ٹکڑا	سونٹھ	ایک کلو	چاول باستی
دو کھانے کے چمچے	سونف	دو عدد (باریک کاٹ لیں)	پیاز
دو کھانے کے چمچے	لال مرچ پاؤڈر	ایک کھانے کا چمچ	دہی
حسب ذائقہ	نمک	دو چائے کے چمچے	لہسن ادرک پیسٹ
دو عدد	پیاز	چار عدد	چھوٹی الائچی
		چار عدد	ہری مرچ ثابت
		ایک پیالی	کننگ آئل

ترکیب:

ایک پتیلی میں تیل گرم کریں اور اس میں پیاز گلابی ہونے تک فرائی کریں۔ پھر اس میں لمل کی پوٹلی اور گوشت ڈال کر فرائی کریں۔ یہاں تک کے گوشت کا پانی خشک ہو جائے۔ پھر نمک شامل کریں اور تقریباً ڈیڑھ جگ پانی شامل کر کے گلنے کے لیے رکھ دیں پہلے آٹھ درمیانی رکھیں جب ابال آجائے تو آٹھ دھیمی کر دیں اور گوشت گلنے تک پکائیں پھر پوٹلی کو نچوڑ کر نکال لیں اور آٹے کو پانی میں مکس کر کے آہستہ آہستہ سالن میں شامل کریں اور چلاتی رہیں پھر گرم مسالہ تھوڑے پانی میں مکس کر کے ڈالیں اور پانچ منٹ کے لیے دم پر رکھ دیں۔ پکنے کے پندرہ منٹ بعد دھنیا، کٹی ہوئی ادرک اور کٹی ہوئی مرچوں سے گارنش کر کے پیش کریں۔

☆☆.....☆☆

ترکیب: ایک پتیلی میں دس پیالی پانی ڈال کر اس میں گوشت کے ساتھ بغیر چھلی لہسن کی پوتھی، ایک انچ ادرک کانگڑا، ایک چائے کا چمچ سونف، ایک چائے کا چمچ ثابت دھنیا آدھا چائے کا چمچ زیرہ شامل کر لیں۔ اس کے بعد ایک پتیلی میں آٹھ گرم کر کے اس میں پیاز براؤن کر لیں۔ آدھی پیاز نکال کر ٹشو پیپر کے اوپر پھیلا دیں اور باقی آدھی میں دہی، ہری مرچیں اور چھوٹی الائچی ڈال کر ہلکا سا بھون لیں۔ پھر اس میں گوشت شامل کر کے لہسن ادرک پیسٹ ڈالیں اور ندید دو تین منٹ تک بھونیں اس کے بعد بخنی کا پانی ڈال کر ڈھکن ڈھانپ دیں۔ جب بخنی میں ابال آجائے تو چاول اور نمک شامل کر کے چلائیں اور قدرے تیز آٹھ پر پکائیں۔ پھر جب پانی تقریباً خشک ہو جائے اور اس میں تھوڑی کمی رہ جائے تو تیز آٹھ پر توڑے کے اوپر دم لگائیں۔ تقریباً پانچ منٹ بعد ہلکی آٹھ کر دیں۔ بلاؤ دم پر آجائے تو ڈش میں نکالیں اور تلی

بیوٹی گائیڈ

حسین نظر آنا ہر عورت کا حق ہے اور اس کے لیے وہ بہت جتن بھی کرتی ہے
دوشیزہ کے قارئین کے لیے بیوٹی گائیڈ کی شکل میں خوبصورت تحفہ.....

پھل اور ہری سبزیاں کھاتے رہنے سے پروٹین
خون میں شامل ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ
مکھن، شہد، گوشت اور مچھلی وغیرہ بھی بالوں کی
نشوونما کے لیے بے حد ضروری ہیں۔ آپ بالوں
اور سر پر چاہیں ہزاروں چیزیں لگائیں، ان سے
صرف وقتی طور پر فائدہ پہنچ سکتا ہے بالوں کی

بالوں کی صحت اور حفاظت

لبے اور گھنے بالوں کی آرزو ہر عورت کو ہوتی
ہے۔ اسی طرح مرد حضرات بھی اپنے بالوں کو
سنوارنے اور انہیں جاذب نظر آنے کے لیے اتنی
ہی توجہ صرف کرتے ہیں جتنی کہ عورتیں۔ اگر
مناسب توجہ نہ دی جائے تو بالوں کی کئی بیماریاں



خاص خاص بیماریاں یہ ہیں۔

بالوں کا گرنا

مردوں اور عورتوں دونوں کو بال گرنے کی
شکایت رہتی ہے سب سے پہلے تو آپ جان لیں
کہ عام طور پر روزانہ 20 سے لے کر 100 بال
گر جاتے ہیں اس لیے کہ ان بالوں کی عمر پوری
ہو چ کی ہوتی ہے۔ اور ان کی جگہ نئے بال نکل

پیدا ہو سکتی ہیں جن کے نتیجے میں ہمارے بال نہ
صرف گرنے لگتے ہیں بلکہ وقت سے پہلے سفید ہو
جاتے ہیں۔ بال ہمیشہ وہی صحت مند ہوں گے
جنہیں خوراک ملتی رہی ہو۔ یہ خوراک خون کی
متوازن گردش سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

بالوں کی صحت کے لیے پروٹین بے انتہا
ضروری ہیں۔ انڈے، کلیجی، گردے، گاجریں،

بال سفید ہونا

دھوپ میں بال سفید ہونا تو ایک محاورہ ہے لیکن آج کل وقت سے پہلے بال سفید ہونے کی شکایت عام ہو گئی ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ ذہنی پریشانی، تفکرات یا اچانک صدمہ ہے۔

سکری یا بقا (Dandruf)

اسے بالوں کی خوبصورتی کا دشمن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ اس کا نشان بھی نظر آئے تو علاج



کی طرف توجہ دیجیے ورنہ بالوں کو تباہ کر کے رکھ دے گی۔ بقا یا سکری ویسے تو چکنائی جمع ہوا جینے سے بڑھتی ہے لیکن یہ ایک چھوٹے کا مرض ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ کسی کی کنگھی، برش، تولیہ یا اسکا رف نہ استعمال کیا جائے اور نہ ہی کسی کے تکیے پر سر رکھا جائے۔ جلدی امراض کے ماہر اس کا بہتر علاج کر سکتے ہیں۔ آپ کیمسٹ سے سلفر سیلی، سائلک ٹائپ لوشن خرید لیں اور اس کے ساتھ ہی سکری کے لیے مخصوص شیمپو بھی لے لیں۔ یہ مرہم یا لوشن رات کو بالوں کی جڑوں میں لگا کر کسی صاف دھلے ہوئے کپڑے سے پیٹ کر سو جائیں۔ صبح اٹھ کر اس مخصوص شیمپو سے بال دھو لیں لیکن اس کے ساتھ ہی برش، کنگھی اور سر پر استعمال ہونے والی ہر چیز تکیے کے غلاف سمیت دھو کر ڈیٹول یا کسی دوسرے جراثیم کش لوشن سے

آتے ہیں۔ اسی طرح یہ عمل جاری و ساری رہتا ہے۔ اگر نئے بالوں کے اُگنے کا عمل جاری نہ ہے تو لوگ بہت جلد گمنجے ہو جائیں۔ انسان کے سر کے بالوں کی تعداد تقریباً ایک ملین ہے۔ اور بالوں کے بڑھنے کی رفتار ایک ہفتی میں ایک ملی میٹر ہوتی ہے۔

بالوں کی بہتر نشوونما کے لیے ہمیں ان کی جڑوں کو پکڑنا ہوگا کیونکہ ان کی صحت کا تعلق تازہ خون سے ہوتا ہے۔ اسی سے بالوں کو خوراک ملتی ہے۔ اگر بالوں کا سلسلہ خون سے کٹ جائے یا ان کی جڑوں میں خون کی قلت ہو جائے تو بال گرنا شروع ہو جاتے ہیں اور جو بال بچ جاتے ہیں وہ بھی تو انانی کھو بیٹھتے ہیں وجہ ظاہر ہے کہ آپ کی خوراک میں پروٹین کی کمی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ آپ ایسی غذائیں استعمال کریں جس میں پروٹین کی مقدار زیادہ ہو۔ طویل مدت کی علالت اور بخار کے بعد بالوں کے گرنے کی رفتار کافی تیز ہو جاتی ہے مگر اس میں گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ بالوں کے گرنے کا یہ عمل عارضی ہوتا ہے اور کچھ عرصے بعد ہی بال دوبارہ اُگ آتے ہیں۔

زچگی کے بعد بھی بال گرنا شروع ہوا جاتا ہے اور یہ ایک طرح کا وقتی یا عارضی گنجا پن نمودار ہوتا ہے مگر یہ بھی عارضی عمل ہے اور کچھ عرصے بعد بالوں کے گرنے کا عمل دوبارہ شروع ہو جاتا ہے۔ ذیابیطس کے مریضوں کے بال بھی تیزی سے گرتے ہیں۔ ذہنی تفکرات اور جسمانی تھکن بھی بالوں کی نشوونما پر اثر انداز ہو سکتی ہے مردوں کے گمنجے پن کی ایک بڑی وجہ بھی ہے کہ انہیں خواتین کے مقابلے میں زیادہ تفکرات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں :-

- ✦ ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ✦ ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ✦ ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
- ✦ ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور ریڈیو ایبل لنک
- ✦ ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پر یو ہر پوسٹ کے ساتھ
- ✦ پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- ✦ مشہور مصنفین کی کتب کی مکمل ریج
- ✦ ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ✦ ویب سائٹ کی آسان براؤزنگ
- ✦ سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں
- ✦ سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- ✦ عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل ریج
- ✦ ایڈفری لنکس، لنکس کو میسجے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

↳ ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب

ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library for Pakistan



Like us on
Facebook

fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety

صاف کر لیں۔

احتیاط اور علاج

بالوں کی حفاظت اور صحت کے لیے ضروری ہے کہ آپ اس سلسلے میں کوئی غفلت نہ برتیں۔ ضروری نہیں کہ جب آپ کے بال کسی بھی انداز سے متاثر ہونا شروع ہوں تب ہی آپ



ان پر توجہ دیں۔ ہمارا خیال ہے کہ ایک نارمل اور صحت مند شخص کو بھی آنے والی بیماریوں سے بچنے کے لیے تھوڑی بہت احتیاط کر لینی چاہیے۔ ہم اس سلسلے میں کچھ احتیاطی تدابیریں درج کر رہے ہیں ان پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ آپ کے بال گھنے، لمبے، خوبصورت اور چمکدار ہو جائیں گے بلکہ بہت سی بیماریوں کا خطرہ بھی ٹل جائے گا۔ بالوں کی صحت کے لیے پروٹین بے حد ضروری ہے اگر بالوں کو جلد مطلوبہ خوراک اور وٹامنز ملتے رہیں تو ان کی صحت برقرار رہتی ہے۔ اسی طرح بالوں کی صفائی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ صحت مند بال اگر اچھی طرح دھوئیں جائیں تو ان میں خود بخود چمک پیدا ہو جاتی ہے۔

بالوں کو دھونے کا طریقہ

اکثر اوقات اچھے بھلے صحت مند بال بھی دھونے پر نہیں چمکتے اس کے لیے اکثر خواتین

بالوں کو ٹھیک طریقے سے صاف کرنا نہیں جانتیں۔ بالوں کو دھونے کے لیے اچھی قسم کا صابن یا شیمپو اور بہت سارا پانی درکار ہے کیونکہ تھوڑے پانی سے شیمپو یا صابن کے ذرات بالوں میں رہ جاتے ہیں اور یہ چیز بالوں کے لیے نقصان دہ ہے۔

بالوں کو دھونے کے لیے کبھی خراب صابن استعمال نہ کریں۔ اکثر اوقات بھاری پانی کی وجہ سے یہ خراب صابن بالوں میں جم جاتا ہے اور انہیں تباہ کر دیتا ہے۔ خشک بالوں کے لیے

کریم والے شیمپو، بے جان اور بے روح بالوں کے لیے انڈے والے شیمپو اور چکنے بالوں کے لیے مخصوص شیمپو ٹھیک رہتے ہیں۔ شیمپو کا انتخاب آپ اپنے بالوں کی مناسبت سے کر سکتی

ہیں۔ شیمپو کرنے سے پہلے بالوں کو اچھی طرح دبا کر برش کریں یا پھر بالوں کو گھسیلا کر کے بالوں کی جڑوں یعنی جلد پر شیمپو لگائیں۔ پانی ہلکا گرم ہونا چاہیے۔ انگلیوں کی مدد سے شیمپو کو بالوں میں اچھی طرح ملیں، پھر تھوڑا تھوڑا پانی ڈال کر ملتے ملتے بال دھولیں۔ جب شیمپو صاف ہو جائے تو دوسری بار شیمپو بالوں میں لگائیں اچھی طرح جھاگ پیدا کرنے کے بعد پوری طرح بال دھو کر نتھار لیں۔ یہ دوسرا شیمپو دراصل آپ کے بالوں میں چمک لائے گا۔ پہلا شیمپو تو اکثر اوقات چکنائی کی نذر ہو جاتا ہے۔

بالوں کو کتنی بار دھونا چاہیے؟ اس کا انحصار موسم، بالوں کی مخصوص قسم اور ان کی ساخت پر منحصر ہے لیکن چکنے یا میلے ہونے کا احساس کرنے سے قبل اپنے بالوں کو دھو ڈالیں۔ بالوں کو متواتر برش کرنے کی عادت اپنائیں یہ اک آسان اردیر پاعلاج ہے۔

☆☆.....☆☆